نظامِ مصطفیٰ
ماہنامہ الحسنات اسلامی اُردو ڈائجسٹ کا نظامِ مصطفیٰ نمبر

ان الحسنات یذھبن السیئات
بلاشبہ نیکیاں برائیوں کو دور کرتی ہیں
الحسنات
اسلامی اردو ڈائجسٹ
نظام مصطفیٰ نمبر

کیا اور کہاں

اداریہ :

مقالات :

منظومات :

اشاعت کا تیسواں سال

شمارہ نمبر: ــــــ ۶۳۴

جولائی ــــــ ۱۹۷۹ء

شعبان المعظم ــــــ ۱۳۹۹ھ

مدیر اعلیٰ و نگراں

ابو سلیم محمد عبد الحی

طابع و ناشر

عبد الملک سلیم

ترتیب کار

مرتضیٰ ساحل تسلیمی

حسن کار

شکیل انوار صدیقی

خوشنویس

راحت علی خاں

مالکان:

ادارہ الحسنات

پرانی کھنڈسار رامپور

مقام اشاعت:

ادارہ الحسنات پرانی کھنڈسار رامپور

فون نمبر:- ۶۵۷

مطبوعہ:

جے کے آفسیٹ پرنٹرس دہلی

اس شمارہ کی قیمت:- =/۸ روپے

عام شمارہ کی قیمت:- -/۳ روپے

سال بھر کے لیے:- -/۳۰ روپے

جنوری

فروری

مارچ

۱۹۷۹ء
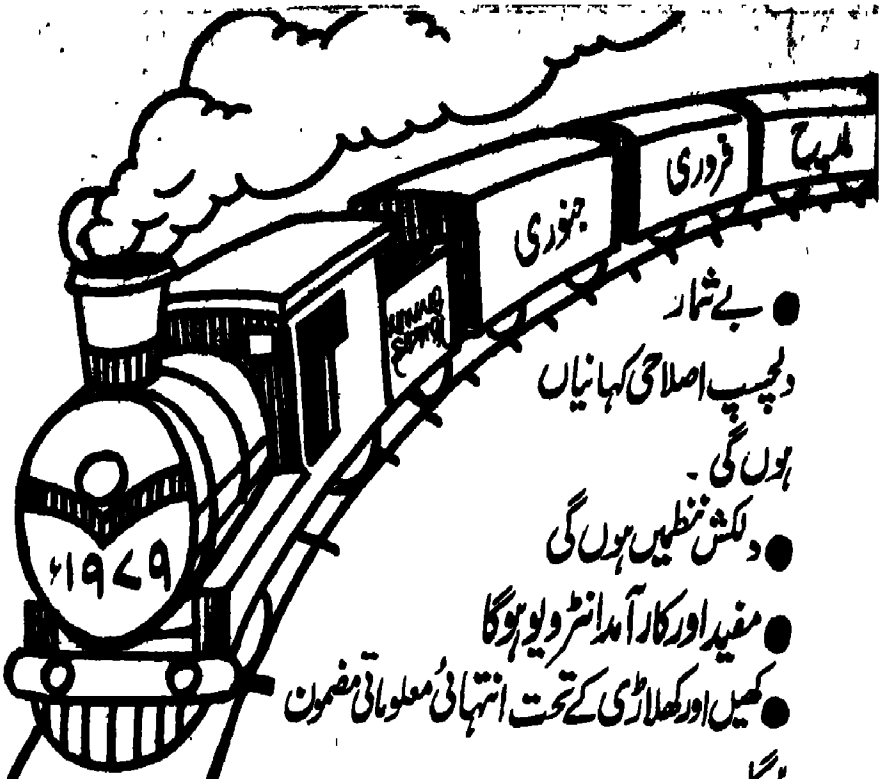
- بے شمار دلچسپ اصلاحی کہانیاں ہوں گی۔
- دلکش نظمیں ہوں گی
- مفید اور کارآمد انٹرویو ہوگا
- کھیل اور کھلاڑی کے تحت انتہائی معلوماتی مضمون ہوگا۔

فوٹو آفسیٹ کی روشن طباعت

تقریباً ڈھائی سو صفحات

سالنامہ کی قیمت ۶/-

سالنامے کی قیمت صرف ۶/- روپے

سالانہ خریداروں کو ان کے سالانہ زرتعاون میں ہی دیا جائے گا۔ آج ہی مبلغ ۲۸/- روپے منی آرڈر سے ارسال فرماکر سالانہ خریداری قبول فرمائیں۔

صرف سالنامہ منگانے والے حضرات ۲/- روپے منی آرڈر سے بھیج کر اپنا آرڈر بک کرادیں ہم سالنامہ ۴/- کی وی، پی سے ارسال کردیں گے اور سالنامہ انہیں ۶/- میں گھر بیٹھے مل جائے گا۔ ایجنٹ حضرات اپنے بڑھے ہوئے آرڈر سے جلد مطلع فرمائیں۔

پتہ:-

منیجر: ادارہ الحسنات۔ رام پور ۲۴۴۹۰۱

جون
جولائی
۱۹۷۹
سال ایک ۱۲ ڈبوں کی ریل ہے۔ جو چابی کی ریل کی طرح ایک دائرہ میں چکر لگا رہا ہے۔ کبھی پہلا ڈبہ آپ کے سامنے ہوتا ہے تو کبھی آخری۔ ذرا دیکھئے نویں ڈبہ میں کیا ہے ــــ اس میں نور ستمبر ۱۹۷۹ء آرہا ہوگا ــ یعنی
سالنامہ نور
اور جانتے ہو سالنامہ نور ۱۹۷۹ء میں کیا ہوگا؟ ــــــ
اس میں ★ سیرت ★ اسلامیات ★ بزرگوں کے حالات ★ تاریخ اسلام ★ ڈرامے ★ شکاریات ★ حیوانیات ★ معلومات ★ صحت و تندرستی ★ کھلتی کلیاں ★ طنز و مزاح ★ ریڈیو نورستان ★ بزم نور ★ کارٹونی کہانیاں ہوں گی۔
اور اس کے علاوہ ــــــ
دیدہ زیب سہ رنگا سرورق
ایک نئی جاسوسی کہانی کی طویل قسط
بہت سے انعامی مقابلے اور بے اختیار ہنسا دینے والے انتہائی دلچسپ کارٹون

ہمارے ملک میں آزادیٔ وطن کی تحریک کے ساتھ ساتھ تقسیم ملک کی تحریک بھی بڑے زوروں پر رہی ہے۔ کچھ لوگ سمجھتے تھے کہ اگر مسلمانوں کو ایک ایسا خطۂ زمین مل جاتے۔ جہاں ان کی اکثریت ہو اور جہاں اُنہیں حکمرانی کے اختیارات حاصل ہو جائیں تو اُن کے سارے مسائل حل ہو سکتے ہیں۔ لیکن اسی وقت اللہ کے ایک بندے نے انسانوں کو آزادی کا صحیح مفہوم بتایا۔ اس نے بڑی تفصیل کے ساتھ واضح کیا کہ حقیقت میں آزادی اسے نہیں کہتے کہ غیر ملکی اقتدار کا خاتمہ ہو جائے اور اقتدار اہل ملک کے ہاتھوں میں منتقل ہو جائے۔ اس نے بتایا کہ حقیقت میں ساری خرابیوں کی جڑ انسان پر انسان کی حکمرانی ہے۔ اس نے یاد دلایا کہ اصل حاکم وہ ہے جس نے انسان کو پیدا کیا ہے۔ انسان کو کسی صورت میں یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ خود حاکمیت کا دعویدار بن جائے اور اپنے سے بالاتر کسی ہستی کا اقتدار تسلیم نہ کرے۔

اس وقت یہ آواز تقریباً ہر کان کو اجنبی محسوس ہوتی لوگ سنتے تھے اور تعجب کرتے تھے کہ یہ شخص کیسی بے وقت کی راگنی الاپ رہا ہے کچھ کہتے تھے کہ ملک کو غیر ملکیوں کے اقتدار سے آزاد تو ہو لینے دو پھر اس وقت تمہاری بات پر غور کیا جائے گا۔ لیکن چونکہ کہنے والے کی بات حق تھی اور بڑے بیچے تلے انداز میں کہی جا رہی تھی۔ اس لیے کم از کم مسلمانوں کی حد تک موثر ثابت ہوئی۔ کچھ لوگوں نے اس بات میں وزن محسوس کیا اور اسے مفید مطلب سمجھ کر اس طرح اپنا لیا کہ

گویا وہ بھی مسلمانوں کی قومی حکومت نہیں بلکہ اسلامی حکومت کے علمبردار ہیں۔ یہ بات ہر مسلمان کے دل کی آواز تھی چاہے اس نے اسے پوری طرح سمجھا ہو یا نہ سمجھا ہو۔

دونوں تحریکیں زور پکڑتی گئیں بالآخر وقت آگیا کہ ملک تقسیم ہوگیا تقسیم ملک کی تحریک کے علمبرداروں میں چند کو چھوڑ کر کوئی بھی اسلامی حکومت کے لیے مخلص نہیں تھا۔ ان کے ذہنوں میں مسلمانوں کی قومی حکومت کا ہی نقشہ بنا ہوا تھا۔ تقسیم ملک کے بعد فطرتاً اقتدار تحریک کے لیڈروں کے قبضے میں آیا۔ اور اب وہاں ایک نظریاتی کشمکش شروع ہوگئی، عوام کی اکثریت چاہتی تھی کہ اقتدار اسلام کا رہے اور لیڈروں کی اکثریت قومی حکومت کے روپ میں اپنے اقتدار کے لیے جوڑ توڑ کر رہی تھی کشمکش بڑھنے لگی اور بالآخر عوام کا یہ مطالبہ زور پکڑ گیا کہ سب سے پہلے نئی قائم شدہ حکومت جسے پاکستان کا نام دیا گیا تھا یہ اعلان کرے کہ اصل اقتدار کا مالک اللہ تعالیٰ ہے اور اس کے بھیجے ہوئے قانون اور اس کی دی ہوئی ہدایات کو سب پر بالاتری حاصل ہے اس مطالبہ کا نام قرارداد مقاصد تھا اور اس کے حق میں عوام کا اتنا دباؤ پڑا کہ حکومت کو اسے تسلیم کرنا پڑا۔

قرارداد مقاصد پاس تو ہوگئی لیکن چونکہ اقتدار جن ہاتھوں میں تھا اُن کی اکثریت اسلام کے حق میں مخلص نہیں تھی اس لیے نتیجہ کوئی خاص نہیں نکلا اور پاکستانی حکومت بالفعل مسلمانوں کی ایک قومی حکومت بنتی چلی گئی۔

اس قومی حکومت میں اتھل پتھل ہوتی رہی اور اقتدار کی گیند جس طرح سیاسی کھلاڑیوں کے درمیان ایک سے دوسرے تک جاتی رہی اس کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں۔ بہرحال ایک ایسا وقت آیا کہ اس ملک کے اقتدار پر فوج نے قبضہ کر لیا۔ فوج کو جنرل محمد ضیاء الحق نے شروع ہی سے کچھ ایسا تصور دیا کہ گویا وہ اس نئے انقلاب کو اسلام کے حق میں استعمال کرنا چاہتے ہیں۔

عام لوگوں کا حافظہ بہت کمزور ہوتا ہے وہ بہت جلد حالات کو بھی بھول جاتے ہیں اور سیاسی لیڈروں کے وعدوں کو بھی پاکستان میں بھی یہی کچھ ہوتا رہا لیکن یہاں تقسیم ملک کے

ساتھ ہی اصل تحریک بھی تقسیم ہو گئی اور اس کا ایک حصہ پاکستان میں رہا جو اس دوران مسلسل سرگرم عمل رہا اس تحریک نے تقسیم سے پہلے بھی اور بعد بھی اپنا نصب العین نظام اسلام کے قیام کو ہی رکھا اور مسلسل کوشش ہوتی رہی کہ جس طرح بھی ہو نظام اسلام کا تصور واضح سے واضح تر ہوتا چلا جائے اور مسلمان اسے اپنا دینی فریضہ سمجھ کر اسے قائم کرنے کی جد وجہد کرتے رہیں اس مسلسل عمل کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس ملک کے باشندوں کے ذہنوں میں نظام اسلام کا تصور دھندلا نہ ہونے پایا اور ملک کے باشعور حلقوں میں اس نصب العین پر زیادہ سے زیادہ اطمینان بڑھتا چلا گیا۔ باشعور حلقہ اچھی طرح سمجھتا رہا کہ ملک کی اصل منزل کیا ہے اور اسے کہاں جانا ہے۔

یہ سب اسی تعمیری ذہن اور تطہیر افکار کا نتیجہ ہے کہ جب پاکستان کی فوجی حکومت نے اپنے قدم اسلامی نظام کی طرف بڑھانا شروع کیے تو ملک کی آبادی کے ایک بڑے حصے نے بھی سمجھا کہ یہ اقدام اس کی اپنی منزل کی طرف ہو رہا ہے اور ہر اس آواز کو جو اسلامی نظام کے لیے اٹھی ایک بڑی اکثریت نے اپنے دل کی آواز سمجھا اور پھر اللہ تعالیٰ کا یہ فضل اس ملک کے باشندوں پر ہوا کہ اس اعلان کا وقت آگیا جو جنرل محمد ضیاء الحق نے پہلے جزوی طور پر یکم محرم الحرام کو اور پھر کلی طور پر ۱۲ ربیع الاول کو کیا۔ ۱۲ ربیع الاول کو پورے اعلان کا متن آپ اسی رسالے میں پڑھیں گے۔

اعلان ہو گیا لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ پاکستان میں نظام اسلام قائم ہو گیا۔ یہ اعلان تو محض ایک تکبیر تحریمہ ہے جو ایک نماز پڑھنے والا نماز سے پہلے کہتا ہے۔ تکبیر تحریمہ کہنے کے بعد یہ نہیں کہا جا سکتا کہ نماز پڑھ لی بلکہ یہ تو محض اس شخص کے ارادے کا نام ہے کہ اب وہ نماز پڑھے گا۔ اس کے لیے اسے قیام رکوع سجود اور دوسرے تمام ارکان نماز ادا کرنے ہوں گے جن کے مجموعے کا نام نماز ہے۔

بس یہی حال ہم اپنے پڑوسی ملک کا بھی سمجھتے ہیں۔ ابھی صرف اس ارادے کا اعلان ہوا ہے کہ اس ملک کا نظام اسلامی ہوگا لیکن اس کے لیے جو جو کچھ اسے کرنا ہے اس کی تفصیلات ہم سب جانتے ہیں۔

ہمارے نقطہ نظر سے اس اعلان کی اہمیت

اس لیے بہت زیادہ ہے کہ اس کا براہ راست تعلق اسلام سے ہے اور اسلام ہمارا ہی دین ہے اور وہ ہمیں بھی عزیز ہے۔ نظامِ اسلام کی تفصیلات کتابوں میں موجود ہیں صراحت کرنے والوں نے اب سے پہلے بڑی خوبی کے ساتھ یہ بتایا ہے کہ اس نظام کی حیثیت ترکیبی کیا ہوتی ہے اس کے تقاضے کیا ہیں، اس کے فائدے کیا ہیں اور اس کو قائم رکھنے اور قائم کرنے کے لیے کیا کرنا ہوتا ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ کسی ہیئت اجتماعیہ کا صحیح تصور محض کتابوں اور تقریروں سے مکمل نہیں ہوتا اس کے لیے ایک عملی نمونہ درکار ہوتا ہے جہاں اس کے تمام اصولوں کا انطباق زندگی کے تمام معاملات پر کیا گیا ہو۔

ہماری نظر میں اس اعلان کی بڑی اہمیت یہی ہے کہ اب ایک ملک نے یہ اعلان کر دیا ہے کہ وہ اس نظام کو عملاً قائم کرنے کا فیصلہ کر چکا ہے اور اس اعلان نے ساری دنیا کو متوجہ کر دیا ہے کہ اب کیا ہوگا۔ ہر اپنے اور غیر کی آنکھیں لگی ہوتی ہیں بس یہی ایک پہلو ایسا ہے جو اپنی اہمیت کے لحاظ سے پاکستان کے لوگوں پر ایک بہت بڑی ذمہ داری عائد کرتا ہے۔

اس اعلان نے ساری دنیا کو متوجہ کر دیا ہے کہ اب کیا ہوگا۔ ہم اپنے اور غیر کی آنکھیں لگی ہوئی ہیں

خود مسلمانوں میں کتنے ہی لوگ ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ اس دور میں اسلامی نظام چل ہی نہیں سکتا اور غیر مسلموں کا تو کہنا ہی کیا وہ تو اس نظام کے سلسلے میں ابتدائی معلومات بھی نہیں رکھتے۔ ان کے ذہنوں میں اسلامی نظام کا تصور بس ایک انتہائی سخت تعزیری نظام کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے بہت سے لوگ تو محض تعزیرات کو اسلامی نظام سمجھتے ہیں اس طرح کے لوگوں کے خیالات کی اصلاح صحیح طریقے پر نہ کتابوں سے ہو سکتی ہے اور نہ تقریروں اور مذاکرات سے۔ اس کے لیے تو اسلامی نظام کی عملی تشریح ضروری ہے۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ یہ سعادت ہمارے پڑوسی ملک کو ملے گی یا نہیں اور اگر ملے گی تو کب اور کس طرح ملے گی۔

بہت مبارک قدم ہے۔ اگر اس کی بدولت اس
ملک میں معاشی مسائل حل ہو جاتے ہیں تو یقیناً ساری
دنیا متوجہ ہوگی اور اگر واقعی یہ نظام مسئلے کا کوئی حل
ثابت ہوا تو وہ اس کا اثر ضرور قبول کرے گی نظامِ
زکوٰۃ کی کچھ تفصیلات آپ ۲ ربیع الاول والے
اعلان کے متن میں پڑھ سکتے ہیں۔

اس طرح ہمارے دوسرے مسائل ہیں مثلاً
رشوت خیانت اور طرح طرح کی بدعنوانیوں نے
زندگی کو جیسا اجیرن بنا دیا ہے اسے کون نہیں جانتا
اب اگر یہ پڑوسی ملک سماج کے اس ناسور کا علاج
کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو کیا وجہ ہے کہ
ہم اپنے علاج کے لیے ان تدابیر کو اختیار نہ کریں
جو تجربے کی روشنی میں موثر ثابت ہوتی ہوں۔

اعلان میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ انصاف کے
حصول کو آسان و سستا بنایا جائے گا تاکہ یہ ہر شخص
کو بلا تاخیر پیچیدگیوں میں الجھے بغیر مل جائے کون
نہیں جانتا کہ ہمارے معاشرے کی یہ ایک بہت
بڑی مصیبت ہے کہ انصاف انتہائی مہنگا ہے
بہت مشکل سے حاصل ہو سکتا ہے اور اس کے
ملنے میں اکثر اتنی دیر ہوتی ہے کہ پھر اس کا ملنا نہ ملنا
برابر ہو جاتا ہے۔ اب اگر اپنے اعلان کے مطابق
یہ پڑوسی ملک اس مسئلے کا کوئی موثر حل ڈھونڈ نکالتا
ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم اس سے روشنی حاصل نہ
کریں۔ یہی حال پولیس اور انتظامیہ کی خرابیوں کا
ہے۔ اگر وہاں یہ کسی طرح دور ہو جائیں تو ہم بھی فائدہ
اٹھا سکتے ہیں۔ اس لیے ہماری نظر میں اس نظام
کی اور اس نظام کے اعلان کی یہی حیثیت ہے۔

ایک اور پہلو بہت اہم ہے۔ بہت سے
تاریخی عوامل کی وجہ سے ہمارے ملک کی اکثریت
کو یہ خیال ہے کہ اسلامی حکومت چاہے جیسی بھی
ہو وہاں غیر مسلم اقلیتوں کے ساتھ بڑی ناانصافی
کی جاتی ہے۔ اس بات یہ ہے کہ اب تک ہم لوگوں
کو صرف مسلمانوں کی قومی حکومتوں کا تجربہ ہے اور
تاریخ میں یقیناً بے شمار ایسے واقعات موجود
ہیں جنہیں ہم غیر مسلم اقلیتوں کے ساتھ ناانصافی
ہی کہہ سکتے ہیں۔ یہ تصور مسلمانوں کی بادشاہتوں
نے دیا ہے یا مسلمانوں کی قومی حکومتوں نے دیا
ہے حالانکہ اسلامی حکومت اس کے مقابلے میں اپنا
ایک امتیاز رکھتی ہے اور بدقسمتی یہ ہے کہ اسلامی
حکومت کا کوئی نمونہ و تجربہ صدیوں سے ہمارے
سامنے آیا ہی نہیں۔

اب وقت کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ دنیا صرف اس نظام کو قبول کر سکتی ہے جو اس کے معاشرتی و معاشی اور سیاسی مسائل کو بہتر طریقے پر حل کر دے۔ یہ مسائل کسی ایک ملک کے ساتھ مخصوص نہیں ہیں تقریباً ساری دنیا اس کے سلجھانے میں لگی ہوئی ہے۔ بالخصوص پڑوسی ممالک میں تو ان مسائل کی یکساں اہمیت کچھ اس درجہ ہے کہ ہم فطری طور پر ہر اس آواز کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں جو انہیں حل کرنے کے لیے اٹھے اس لیے کوئی وجہ نہیں کہ ہمارا پڑوسی ملک موجودہ معاشی، معاشرتی و سیاسی مسائل کا کوئی قابل عمل حل پیش کرنے میں کامیاب ہو جاتے چاہے اس حل کا نام کچھ ہی ہو ہم یقیناً اس کی طرف متوجہ ہوں گے۔ بشرطیکہ عملی حل تجربے میں آجاتے۔ اگر کچھ مریض یکساں قسم کے مرضوں کا شکار ہوں اور ان میں سے کوئی ایک مریض کسی معالج کے علاج سے فائدہ حاصل کرنے لگے۔ تو ممکن نہیں کہ دوسرے مریض بھی اس معالج اور علاج کی طرف متوجہ نہ ہوں۔ مریض کی دلچسپی اپنی صحت سے ہوتی ہے وہ معالج اور دواؤں کے ناموں میں نہیں الجھتا۔

> **ان کے ذہنوں میں اسلامی نظام کا تصور بس ایک انتہائی سخت تعزیری نظام کے علاوہ اور کچھ نہیں آتا بہت سے لوگ تو محض تعزیرات ہی کو اسلامی نظام سمجھتے ہیں**

ہمارے موجودہ مسائل میں افلاس، بے روزگاری اور دولت کی غیر ہموار تقسیم ایک بہت شدید مسئلہ ہے۔ جس معاشرے میں کچھ لوگ محروم رہیں اور کچھ حدود سے آگے بڑھ کر داد عیش دیتے رہیں وہاں معاشرہ کبھی سکون و اطمینان کے ساتھ نہیں رہ سکتا۔ ہمیں یہ دیکھ کر بہت اطمینان ہوا ہے کہ پاکستان نے نظام اسلامی کے اعلان کے بعد جن چند قوانین کو تدریج کے طور پر اختیار کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ ان میں اسلام کے نظام زکوٰۃ پر عمل کرنا مقدم رکھا گیا ہے۔ یہ اس اعتبار سے

اس اعتبار سے دیکھا جائے تو نظامِ مصطفیٰ یا نظامِ اسلام کا اعلان کرنے والوں نے اپنے کو ایک بہت بڑے امتحان میں مبتلا کر لیا ہے۔ اب ان کی ذمہ داری ہے کہ دنیا کو بتائیں کہ مسلمانوں کی حکومت کوئی اور چیز ہے اور اسلامی حکومت بالکل ایک دوسری چیز ہے۔ وہاں انہیں دنیا کو یہ دکھانا ہوگا کہ اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کے حقوق کا تحفظ کس طرح کیا جاتا ہے۔ ان کے معاشرتی و معاشی مسائل کس طرح حل ہوتے ہیں۔ ان کے مذہب ان کے پرسنل لا اور ان کے جان و مال کا احترام کس طرح کیا جاتا ہے۔

یہ ساری باتیں محض خیالی اور علمی ہی نہیں ہیں بلکہ ابتدائی ادوار میں جب مسلمان حکومتیں اسلام کی بتائی ہوئی ان پابندیوں پر عمل کرتی تھیں تو اس کی بدولت کیسا سکون اور اطمینان نصیب ہوتا تھا وہ ہمیں تاریخ کے صفحات بتا سکتے ہیں لیکن جیسے جیسے اسلامی نظام کی گرفت مسلمانوں پر ڈھیلی ہوتی چلی گئی اور انھوں نے قومی رنگ اختیار کرنا شروع کر دیا تو پھر جن ملکوں میں اسلام گیا وہاں اقتدار پر تو بلاشبہ اس کا قبضہ ہوتا چلا گیا۔ لیکن عوام کے دلوں کی دنیا بدل نہ سکی اور یہی بات آج ہم دیکھتے ہیں کہ ایسے تمام ممالک میں غیر مسلموں کی اکثریت تھی اور مسلمان اقلیت میں رہ گئے۔

یہی تمام پہلو ہیں جن کی بنا پر ہم نے پاکستان میں قائم ہونے والے نظامِ اسلامی کے اعلان کو خوشی سے سنا ہے اور اب ہم اس کی رفتارِ کار اور اس کے عملی نتائج پر برابر نظر رکھنا چاہتے ہیں۔ چونکہ ہم عقیدے اور یقین کی حد تک اس خدائی نظام کو دنیا کے لیے ایک انتہائی نعمت تصور کرتے ہیں اس لیے ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس تجربے کو صحیح معنیٰ میں کامیاب بنائے اور ماضی کی طرح مسلمانوں کی اپنی غلطیوں کی وجہ سے اس کی کوئی ایسی تصویر سامنے نہ آئے جو لوگوں کو اسلام سے بدظن کرنے کا موجب بن سکے الحسنات کا جو خاص نمبر آپ کے ہاتھوں میں ہے اس میں ہم نے علمی طور پر نظامِ اسلامی کی تفصیلات و تشریحات پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور ہمیں امید ہے کہ یہ تفصیلات جن لوگوں کی نظر میں رہیں گی وہ پاکستانی حکومت کے ہر رویّہ کو اس معیار پر پرکھنے کی کوشش کریں گے اور اگر خدانخواستہ وہ کچھ غلطیاں کریں تو اس کا ذمہ دار اسلام کو نہیں بلکہ خود مسلمانوں کو سمجھیں گے۔ [illegible]

ہمارے حاکم کو دیکھیں پھر بہار کے دن

صدر مملکت جنرل ضیاءالحق نے عید میلادالنبی کے روز چند اہم اسلامی احکام وقوانین کے نفاذ کا جو اعلان کیا ہے وہ ان بیشمار نعتوں اور مدحیہ تقریروں سے زیادہ قیمتی ہے جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں کی اور کہی گئی ہیں اس لیے کہ حضورؐ کی محبت کا اصل تقاضا تو آپ کے لائے ہوئے دین کو قائم کرنا اور آپ کے دیئے ہوئے احکام کو نافذ کرنا ہے جس کی نہایت مبارک اور قابلِ تحسین ابتدا، صدر پاکستان کے اس اعلان سے ہوتی ہے' یہ پاکستان کی بہت بڑی خوش قسمتی ہے کہ اپنے جس مقصدِ وجود سے وہ ۳۲ سال محروم رہا، اب اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے وہ اس کی راہ پر گامزن ہو رہا ہے. تمام مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ اس ربِ کریم کے شکر گزار رہوں اور اس نعمت کی ناقدری کر کے اس کی رحمت کے بجائے لعنت کے مستحق نہ بنیں۔

اور اجرائے احکامِ اسلامی کا اعلان ہو جانے کے بعد صدرِ مملکت اور ان کی حکومت، انتظامیہ اور عدلیہ کے حکام اور عام مسلمان سب بڑی آزمائش میں پڑ گئے ہیں۔ انسانی قوانین کی خلاف ورزی کرنا اور چیز ہے اور خدا اور رسولؐ کے قانون کو توڑنا بالکل ہی دوسری چیز ہے۔ اس سے تو آدمی کا ایمان خطرے میں پڑ جاتا ہے اور وہ خدا کے غضب کا مستحق بن جاتا ہے۔ ضرورت ہے کہ ہر شخص اپنے دائرہ عمل میں اس عظیم ذمہ داری کو پوری طرح محسوس کرے اور سب سے زیادہ حکومت کے لیے لازم ہے کہ وہ اپنے افسروں اور ملازمین اور عوام کو تمام ممکن وسائل سے کام لے کر اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے قابل بنانے کی کوشش کرے۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

(۱۱ فروری ۱۹۷۹ء اور ۱۲ ربیع الاول کے تاریخی اعلان پر بیان)

نظامِ اسلام

ماہر القادری

جبر باطل سے گذرنے کا زمانہ آیا
صرف اللہ سے ڈرنے کا زمانہ آیا

زلفِ گیتی کے سنورنے کا زمانہ آیا
آدمیت کے نکھرنے کا زمانہ آیا

قافلے جن کے اُجالے میں چلا کرتے تھے
اُن ستاروں کے اُبھرنے کا زمانہ آیا

ایک مدت سے جو بے آب تھی حق کی کھیتی
اُس کے اب پھولنے پھلنے کا زمانہ آیا

خواہ افسر ہو کہ مزدور، مکاں ہوں کہ محل
سب کے انداز بدلنے کا زمانہ آیا

اب معیشت بھی عبادت ہے سیاست بھی ثواب
خانقاہوں سے نکلنے کا زمانہ آیا

اطلس و مخمل و کمخواب کی گرمی کو سلام
راہِ پُرخار میں چلنے کا زمانہ آیا

غیر مسلم کو بھی مژدہ کہ بہ فیضِ اسلام
اُس کے حالات سنبھلنے کا زمانہ آیا

شراب نوشی، زنا، چوری اور الزام تراشی کے لیے اسلامی سزاؤں کے نفاذ کا اعلان

صدر مملکت جنرل ضیاء الحق نے

۱۲ ربیع الاول (فروری ۱۰) کے موقع پر

ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر قوم سے جو خطاب کیا اس کا متن حسب ذیل ہے

ایک تاریخی تقریر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

معزز خواتین و حضرات!

السلام علیکم! آج عید میلاد النبیؐ ہے جو ہماری دینی اور ملی زندگی کا ایک اہم سنگِ میل ہے۔ یہ دن اگرچہ قوم ہر سال مناتی ہے لیکن سرکاری طور پر اس کی وسیع پیمانے پر تقریبات کا اہتمام پہلی بار کیا گیا ہے۔ کیونکہ جس عظیم و برتر ہستی کا یوم ولادت ہم منا رہے ہیں، اس کے ہم پر اتنے احسان ہیں کہ آج کے دن ہی کیا ساری عمر اس کا شکریہ ادا کرتے رہیں تو بھی حق ادا نہ ہوگا۔ اس محسنِ انسانیت کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ اس نے بنی نوعِ انسان کو ایک پُرامن اور روشن انقلاب سے روشناس کرایا جس میں فرد اور معاشرے کی دُنیوی اصلاح کے علاوہ ان کی اَبدی نجات کی ضمانت بھی موجود ہے۔ سرورِ کونین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ اقدس کا ایک اعجاز ہے کہ وہ اس انقلاب کی خود عملی تفسیر تھے۔ نہ صرف ان کی اپنی

اپنی غلطی کا فوراً احساس کریں، اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگیں اور اپنی بقیہ زندگی اسلام کے مطابق گزار کر اس دنیا اور اگلی دنیا میں سرخرو ہو جائیں

اور ان کے اہلِ خاندان کی زندگی اسلامی اصولوں کے مطابق گزری بلکہ انہوں نے اپنی زندگی میں وہ نظریاتی معاشرہ بھی قائم کر دیا جس کی نوید انہوں نے الہامی آیات میں سنائی تھی۔

ہم اس عظیم ہستی کے غلام ہونے کے دعویدار ہیں لیکن اگر ہم اپنی عملی زندگی اور معاشرتی ماحول پر نظر ڈالیں تو ہمیں افسوس سے یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ہم اسلام کی مقرر کردہ راہ سے ہٹ گئے ہیں۔ ہم میں ایسے بھی لوگ ہیں جو نماز روزہ، زکوٰۃ اور حج جیسے بنیادی ارکان کو پس پشت ڈال کر ایسی زندگی گزار رہے ہیں جو سماجی بہبود، عدل و انصاف کے اسلامی اصولوں کے بجائے مادہ پرستی کا شکار ہیں۔

اب ہم زندگی کے دو راہے پر کھڑے ہیں جہاں سے ایک راستہ یہ ہے کہ ہم خدانخواستہ گمراہی کی زندگی گزارتے گزارتے بالآخر تباہی کا شکار ہو جائیں اور دوسرا یہ ہے کہ اپنی غلطی کا فوراً احساس کریں۔ اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگیں اور اپنی بقیہ زندگی اسلام کے مطابق گزار کر اس دنیا میں اور اگلی دنیا میں سرخ رو ہو جائیں۔

اس ملک کے رہنے والے پہلے ہی اپنی راہ کا تعین کر چکے ہیں۔ انفرادی طور پر ہر مسلمان پر لازم ہے کہ وہ اسلامی طرزِ زندگی اختیار کرے۔ اجتماعی طور پر بھی ہم قیام پاکستان سے پہلے ہی یہ عزم مصمم کر چکے ہیں کہ ہم ایک علیحدہ ملک قائم کریں گے جہاں ہم اپنے دین کے مطابق زندگی بسر کریں گے۔ آج بھی وہ لوگ اس ملک میں موجود ہیں جنہوں نے ایشیا کے شہر شہر گلی گلی اور کوچے کوچے میں یہ نعرہ بلند کیا تھا:

"پاکستان کا مطلب کیا۔ لا الٰہ الا اللہ"

قرار داد مقاصد

قیام پاکستان کے بعد پہلی دستور ساز اسمبلی نے جو قرار داد مقاصد منظور کی اس میں بھی اسلام کو کلیدی حیثیت حاصل تھی۔ مختلف مکاتب فکر کے ۳۱ علماء نے جو ۲۲ نکات تیار کیے وہ بھی ہماری منزل کا تعین کرتے تھے اور پھر ۱۹۵۶ء اور ۱۹۶۲ء میں جو آئین بنے ان میں اسلام اور پاکستان کے بنیادی رشتے کو تسلیم کیا گیا اور ۱۹۷۳ء کے دستور میں بھی یہی رشتہ بدستور قائم ہے۔ ملک کی تمام سرکردہ سیاسی پارٹیاں اپنے دیگر اختلافات کے باوجود اس بات پر متفق ہیں کہ ملک میں نظام اسلام قائم کیا جائے۔ اس سے یہ واضح ہے کہ اس قوم نے جس نظریے کے لیے پاکستان حاصل کیا تھا وہ اس پر آج بھی قائم ہے۔ وہ یقیناً اس نظریے کو عملی زندگی میں رواں دواں دیکھنے کے آرزومند ہیں۔

یہ اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ موجودہ حکومت کو ان امنگوں کو پورا کرنے کی سعادت نصیب ہوئی ہے۔ گزشتہ ڈیڑھ سال کے قلیل عرصے میں اتنی پیش رفت ہو چکی ہے کہ میں آج باقاعدہ اسلامی نظام نافذ کرنے کا اعلان کر رہا ہوں۔

اللہ تعالیٰ ہماری ان کوششوں کو برکتوں سے نوازے۔ اِس سلسلے میں چند کام پہلے ہی کیے جا چکے ہیں جن کا میں مختصراً تذکرہ کرنا چاہتا ہوں۔

نئی نسل کی تربیت

ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم نے اپنی نئی نسل کو اس نظریے سے روشناس نہ کرایا جو قیام پاکستان کی بنیاد بنا تھا۔ ہماری درسی کتابوں اور نصاب میں ایسا مواد شامل کر دیا گیا تھا جو ہمیں اپنے محور سے دور لے جا رہا تھا۔ لہٰذا نئی نسل کو اپنے فکری محور پر رکھنے کے لیے نئی تعلیمی پالیسی وضع کی گئی۔ جس کا بنیادی مقصد نظریہ

پاکستان اور نظریۂ اسلام سے وابستہ نسل تیار کرنا ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے سب سے پہلی کڑی درسی کتابوں میں ترمیم ہے جو پہلے ہی کی جا چکی ہے۔ یہ ترمیم شدہ کتابیں اس سال یکم اپریل سے پڑھائی جائیں گی جب کہ مکمل طور پر نئے سرے سے لکھی گئی کتابیں اگلے تعلیمی سال سے شروع کی جائیں گی۔ علاوہ ازیں آئندہ تعلیمی سال سے انگلش میڈیم اسکول بھی قومی زبان "اُردو" کو بتدریج ذریعہ تعلیم کے طور پر اپنا رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ابلاغ عامہ خصوصاً ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر وگراموں میں بھی مناسب تبدیلیاں کی گئی ہیں تاکہ وہ بھی ہمارے قومی تشخص کو ابھار سکیں۔

شریعت بنچوں کا قیام

دوسرا اہم اقدام شریعت بنچوں کا قیام ہے جس کا اعلان میں نے اسلامی سال کے آغاز پر کیا تھا۔ گذشتہ دو اڑھائی ماہ میں شریعت بنچوں کے متعلق جو آراء اور تجویزیں موصول ہوئی تھیں ان کی روشنی میں متعلقہ ایکٹ میں ترمیم کر کے اسے آئین کا حصہ بنا کر نافذ کر دیا گیا۔ گویا اب ہر شہری قانون کو عدلیہ کے سامنے لے جا سکتا ہے تاکہ اس کے کُلی یا جزوی طور پر غیر اسلامی ہونے کا فیصلہ لے سکے۔ دوسرے الفاظ میں ملک کے قانون پر شریعت کی بالادستی قائم کر دی گئی ہے۔

مستقل لاکمیشن

قانون کو اسلامی سانچے میں ڈھالنا ہی کافی نہیں۔ یہ بھی لازم ہے کہ ہر شخص کو عدل و انصاف بلا تاخیر اور با آسانی ملے۔ ہمارے ہاں مشکل یہ ہے کہ قانونی طریقہ کار اتنا طویل اور پیچیدہ ہے کہ انصاف بہ آسانی حاصل نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا حکومت نے ایک مستقل لاکمیشن قائم کیا ہے جس کو یہ کام سونپا گیا ہے کہ وہ جلد از جلد عدل و انصاف کے طریقہ کار کو سہل بنانے کے لیے اپنی سفارشات حکومت کو پیش کرے۔ اس کمیشن کے سربراہ سپریم کورٹ کے چیف جسٹس ہیں اور ممبروں میں تمام ہائی کورٹوں کے چیف جسٹس اور مسٹر شریف الدین پیرزادہ شامل ہیں۔ ایک اور اقدام قائد اعظم یونیورسٹی میں کلیہ شریعت یعنی پوسٹ گریجویٹ فیکلٹی اس لیے قائم کی گئی ہے کہ اسلامی قانون رائج کرنے کے ساتھ

ساتھ ایسے ماہرین کی بھی ضرورت محسوس کی جا رہی ہے جو مروجہ قانون کے علاوہ اسلامی فقہ اور شریعت پر بھی عبور رکھتے ہوں۔ اس فیکلٹی کے قیام کی منظوری دی جا چکی ہے۔ اس کا نقشہ کار بھی تیار ہو چکا ہے اور اس کے لیے ضروری فنڈز مخصوص کیے جا چکے ہیں۔ انشاء اللہ فیکلٹی اس سال ستمبر، اکتوبر سے کام شروع کر دے گی۔

نئے اقدامات

آج میں جن اقدامات کا ذکر کرنے والا ہوں ان کا تعلق بعض معاشرتی اور رفاہی پہلوؤں سے ہے۔ ان کی تفصیل میں جانے سے پہلے میں اس بات پر زور دینا چاہتا ہوں کہ اسلام ایک نہایت ہی رفاہی، ترقی پسند، روشن خیال اور عدل قائم کرنے والا دین ہے۔ یہ ہر دور کے بدلتے ہوئے تقاضوں اور مسائل حل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ یہ امیر سے زیادہ غریب اور طاقتور سے زیادہ کمزور کا خیال رکھنے کے ساتھ ساتھ مرد اور عورت، آجر اور مزدور اور مسلم اور غیر مسلم کے حقوق کا تحفظ کرتا ہے۔ یہ دینی اور دنیوی معاملوں میں عدل اور توازن کی ضمانت دیتا ہے۔ تحقیق یہ ثابت کرتی ہے کہ آج کل کے نام نہاد، جدید اور ترقی یافتہ معاشرے درحقیقت اسلام کے ان اصولوں کے خوشہ چیں ہیں جو آج سے چودہ سو سال پہلے ایک مکمل ضابطہ حیات کی شکل میں رائج کیے گئے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے اصول ابدی اور اس کے قوانین لافانی ہیں جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اور ہمہ گیر ہوتے جاتے ہیں۔

امیر اور غریب میں تفریق کو کم کرنا
اور غربا اور مساکین کا خیال رکھنا
اسلامی معاشرے کا اہم جزو ہے۔

فوری نفاذ میں مشکلات

بگڑے ہوئے معاشرے کو سدھارنا آسان کام نہیں۔ اس میں ہمت، وقت اور مسلسل جدوجہد کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ کام ایک دن یا ایک ہفتہ میں ہو سکتا ہے وہ شاید کسی اور مصلحت کے تحت

حقیقت سے چشم پوشی کرتے ہیں۔ میں ان مشکلات کی تفصیل میں جانا نہیں چاہتا جو اس سلسلہ میں درپیش ہیں لیکن اتنا بتا دینا چاہتا ہوں کہ گذشتہ ایک سال کی محنت کے بعد اسلامی نظریاتی کونسل، ملکی اور غیر ملکی علماء، وزارت قانون اور مذہبی امور ماہرین کی کمیٹیاں اور کابینہ کے ارکان چیدہ چیدہ اقدامات کا فیصلہ کر سکے ہیں جن کا میں آج اعلان کر رہا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ ابھی اور بھی بہت سے اقدامات باقی ہیں۔ جن پر پوری محنت اور توجہ کے ساتھ کام جاری ہے بعض شعبوں حوصلہ افزا پیش رفت ہوئی ہے اور بعض شعبوں میں فی الحال کچھ دقتوں کا سامنا ہے۔ ان کا حل تحقیق اور اجتہاد کے ذریعہ تلاش کیا جارہا ہے۔ مثال کے طور پر موجودہ معاشی نظام کو بدلنے کی ضرورت سے سبھی متفق ہیں لیکن ایسا کرنا صرف اس صورت میں ممکن ہے کہ اس کا نعم البدل تیار کر لیا جائے جو اسلام کے تقاضوں پر پورا اترتا ہو جو ماہرین اس کام میں مصروف ہیں ان کا خیال ہے کہ اسلام کا بلا سود اقتصادی نظام بتدریج جاری کیا جائے گا جس کی تکمیل ان شاء اللہ تین سال میں ہو جائے گی۔

زکوٰۃ اور عشر

ہم نے جس چیز کو سب سے پہلے منتخب کیا ہے وہ زکوٰۃ اور عشر ہیں۔ زکوٰۃ کو منتخب کرنے کی بڑی وجہ یہ ہے کہ یہ اسلام کے بنیادی ارکان میں سے ایک اہم رُکن ہے اور اس کا تعلق معاشرے کی معاشی اور رفاہی زندگی سے ہے زکوٰۃ اور عشر کے آرڈر کا مسودہ آج جاری کیا جارہا ہے۔ اس کی موٹی موٹی باتیں یہ ہیں: (۱) نصاب زکوٰۃ، شرح اور مصارف زکوٰۃ شریعت کے عین مطابق ہیں۔ شریعت حکومت وقت پر یہ فرض عائد کرتی ہے کہ وہ کلّی یا جزوی طور پر صاحب نصاب مسلمانوں سے زکوٰۃ اور عشر وصول کرنے کا اہتمام کرے۔ یہی ذمہ داری پاکستان کے آئین میں بھی رکھی گئی ہے۔ اس ذمہ داری کو پورا کرنے کے لیے دو چیزوں کی ضرورت ہے۔ ایک یہ کہ زکوٰۃ فنڈ قائم کیا جائے اور دوسرا ایک ایسا نظام تشکیل دیا جائے جس کے ذریعے زکوٰۃ کی تشخیص وصولی اور خرچ کا بندوبست کیا جائے۔ لہٰذا ایک زکوٰۃ فنڈ قائم کیا گیا ہے جس کے تین کھاتے

ہوں گے (۱) مقامی کھاتا (لوکل اکاؤنٹ) اس کھاتے میں زکوٰۃ اور عشر کی وہ تمام رقوم جمع کی جائیں گی جو مقامی طور پر گاؤں محلّے یا دیہہ وغیرہ سے حاصل ہوں گی (۲) صوبائی کھاتہ (پروونشل اکاؤنٹ) مقامی کھاتے کا ۲۵ فیصد حصّہ اس کھاتے میں جمع کیا جائے گا۔ (۳) مرکزی کھاتہ (سنٹرل اکاؤنٹ) اس کھاتے میں وہ زکوٰۃ جمع ہو گی جو براہ راست بنکوں و دیگر مالیاتی اداروں میں جمع شدہ رقوم اور اثاثوں پہ وصول کی جائے گی۔ اس کھاتے سے ضرورت کے مطابق مقامی کھاتے اور صوبائی کھاتے میں رقوم منتقل کی جائیں گی۔

ان تینوں کھاتوں میں صدقات اور عطیات بھی جمع کیے جاسکیں گے۔ اس نظام کو چلانے کا طریقہ یہ ہوگا: (۱) مقامی کھاتے چلانے کے لیے ہر گاؤں، دیہہ اور محلّے میں چار سے چھ ارکان پر مشتمل ایک لوکل کمیٹی ہو گی جس کا انتخاب اس آبادی میں رہنے والے خود کریں گے۔ (۲) اس طریقے پر ایک ایک کمیٹی تحصیل اور ضلعی سطح پر بنائی جائے گی۔ یہ کمیٹیاں لوکل کمیٹیوں کی مدد، باہمی رابطے اور نگرانی کے فرائض انجام دیں گی (۳) صوبائی سطح پر ایک صوبائی زکوٰۃ کونسل بنائی جائے گی جس کا چیئرمین ایسا شخص ہوگا جو ہائی کورٹ کا جج ہو، یا جج رہ چکا ہو، یا جج بننے کی اہلیت رکھتا ہو۔ اس کونسل کے پانچ ممبر ہوں گے جن میں سے تین علماء ہوں گے (۴) صوبائی کھاتے کا نظم و نسق چلانے کے لیے ایک چیف ایڈمنسٹریٹر ہوگا۔ جو صوبائی زکوٰۃ کونسل کی ہدایت، راہ نمائی اور نگرانی میں کام کرے گا۔ چیف ایڈمنسٹریٹر اور صوبائی سکریٹری مالیات بلحاظ عہدہ کونسل کے ممبر ہوں گے (۵) مرکزی سطح پر ایک مرکزی زکوٰۃ کونسل ہو گی جو سولہ ارکان پر مشتمل ہو گی۔ ان ارکان میں ہر صوبے کے چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر شامل ہوں گے۔ ان کے علاوہ چار اشخاص صدر مملکت کی طرف سے نامزد کیے جائیں گے جن میں تین علماء ہوں گے جن کے ناموں کی سفارش نظریاتی کونسل کرے گی۔ صدر مملکت چار دیگر اشخاص کو نامزد کریں گے جن کا تعلق چاروں صوبوں اور مختلف شعبہ ہائے زندگی کے ماہرین سے ہوگا۔ سیکریٹری مالیات اور سیکریٹری وزارت مذہبی امور بلحاظ عہدہ اس کے ارکان ہوں گے۔

اس کونسل کا چیئرمین ایسا شخص ہوگا جو ہائی کورٹ یا سپریم کورٹ کا جج ہو یا جج رہ چکا ہو یا جج بننے کا اہل ہو۔ اس کا انتخاب چیف جسٹس آف پاکستان

کے مشورے سے کیا جائے گا (۶) پورے زکوٰۃ فنڈ کے نظم ونسق کو چلانے کے لیے ایک انتظامی سربراہ ہوگا جو ایڈمنسٹریٹر جنرل کہلائے گا جس کا تقرر صدر پاکستان کریں گے۔ یہ ایڈمنسٹریٹر جنرل مرکزی زکوٰۃ کونسل کی زیر نگرانی اور زیر ہدایت کام کرے گا۔

زکوٰۃ جمع کرنے کے خصوصی نکات یہ ہیں۔

(۱) ہر صاحب نصاب فرد اپنے "اموال باطنہ" کا حساب کرکے خود زکوٰۃ کی رقم کا تعین کرے گا اور یہ رقم رضاکارانہ طور پر زکوٰۃ فنڈ میں جمع کرائے گا۔ یا اپنی مرضی سے مستحق لوگوں میں تقسیم کردے گا۔

زکوٰۃ کی وصولی

(۲) اموال ظاہرہ پر زکوٰۃ حکومت خود وصول کرے گی۔ اس وصولی کے وقت حسب ذیل باتوں کا خیال رکھا جائے گا۔

(الف) کسی بینک یا مالیتی ادارے میں ایک ہزار روپے تک جمع شدہ رقم پر زکوٰۃ نہیں لی جائے گی (ب) کرنٹ اکاؤنٹ رکھنے والوں کو یہ اختیار حاصل ہوگا کہ وہ خود اپنی زکوٰۃ کا تخمینہ لگائیں اور مطلوبہ رقوم زکوٰۃ فنڈ میں جمع کرا دیں یا اپنی مرضی سے مستحق افراد میں تقسیم کردیں۔ کرنٹ اکاؤنٹ کے علاوہ باقی تمام حسابات پر ڈھائی فیصد کی شرح سے زکوٰۃ وصول کی جائے گی۔ (ج) تمام پرائیویٹ اور پبلک لمیٹڈ کمپنیوں پر ماسوائے ان کمپنیوں کے جن کے حصص سو فیصدی حکومت کے پاس ہیں زکوٰۃ واجب الادا ہوگی جن کی تفصیلات آرڈر میں دی گئی ہیں (د) عمارتوں، دکانوں اور مکانوں پر زکوٰۃ نہیں لی جائے گی البتہ ان کے کرایہ وغیرہ سے "صاحب نصاب" شخص کو جو بچت حاصل ہوگی وہ اس پر زکوٰۃ ادا کرے گا۔

(س) زکوٰۃ کے لیے جن اثاثوں کی اطلاع حکومت کو دی جائے گی وہ صیغۂ راز میں رکھی جائے گی اور کسی مقصد کے لیے اس شخص کے خلاف استعمال نہیں کی جائے گی (ش) زکوٰۃ میں جو رقم ادا کی جائے گی وہ انکم ٹیکس کی تشخیص کے لیے شمار نہیں ہوگی (ص) جن اثاثوں پر زکوٰۃ حکومت وصول کرے گی وہ دولت ٹیکس کی تشخیص سے بھی مستثنیٰ ہوں گے۔

عشر کی وصولی

(ط) عشر کی شرح شریعت میں یہ مقرر کی گئی

ہے کہ بارانی زمین کی پیداوار کا دس فیصد اور
چاہی یا نہری زمین کی پیداوار کا پانچ فیصد ادا کیا
جائے حکومت بارانی چاہی اور نہری زمینوں کی
پیداوار پر پانچ فیصد کے حساب عشر وصول کرے گی
اور بارانی زمینوں والے باقی پانچ فیصد اپنی مرضی
کے مطابق مصارف زکوٰۃ پر خرچ کریں گے۔
عشر ان مالکان اراضی سے وصول
کیا جائے گا جن پر یہ شرعی لحاظ
سے واجب ہوتا ہے۔
مزارعین کو یہ اختیار [illegible] حاصل ہوگا
کہ وہ اپنی [illegible] کمائی میں سے
"عشر" کی رقم [illegible] رضاکارانہ طور پر حکومت
کے مقرر کردہ کھاتے میں جمع کرادیں یا خود مستحق
لوگوں میں تقسیم کردیں۔
عشر کی ادائیگی کے ساتھ ہی مالیہ معاف
ہوجائے گا البتہ آبیانہ جاری رہے گا۔
زکوٰۃ اسی سال یکم جولائی سے اکٹھی کی
جائے گی جبکہ عشر کا اطلاق آئندہ فصل خریف
یعنی اکتوبر ۱۹۷۹ء سے ہوگا۔
زکوٰۃ اور عشر کے بقایاجات مالیے کی طرح
وصول کیے جائیں گے۔ زکوٰۃ اور عشر کا اطلاق
غیر مسلم اقلیتوں پر نہیں ہوگا۔

امیر و غریب کا فرق

امیر اور غریب میں تفریق کو کم کرنا اور غرباء و
مساکین کا خیال رکھنا اسلامی معاشرے کا اہم جزو
ہے اور یہی اس حکومت کی پالیسی کا بنیادی
ستون ہے۔ زکوٰۃ اور عشر کا نظام ہمیں
ایسے وسائل مہیا کرے گا جن کے
صحیح مصرف سے غریب عوام
کی فلاح و بہبود کے امکانات پیدا
ہوں گے۔ اس [illegible] نظام کو نافذ
کرنے کے [illegible] زکوٰۃ کی [illegible] وصولی
اولین [illegible] میں کچھ وقت لگے گا جب
تک یہ رقم جمع نہیں ہوجاتی اس کار خیر کا آغاز
نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ فوری طور پر
اس کام کے لیے ایک رقم مختص کردی جائے۔ اس
سلسلے میں میں یہ اعلان کرنے میں خوشی محسوس کرتا
ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہم ۲۲۵ کروڑ روپے
کی خطیر رقم سے زکوٰۃ فنڈ کا آغاز کر رہے ہیں جس
میں حکومت کے عطیے کے علاوہ جلالۃ الملک شاہ
خالد بن عبدالعزیز ولی عہد شہزادہ فہد بن عبدالعزیز اور

ایک تاریخی تقریر

متحدہ عرب امارت کے حکمران ہز ہائی نس شیخ زید بن سلطان النہیان نے گرانقدر رقوم مہیا کی ہیں۔ میں اپنی قوم کی طرف سے اس جذبے کی قدر کرتا ہوں اور ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

یہ رقم زکوٰۃ فنڈ کے ابتدائی سرمائے کا کام دے گی جس میں زکوٰۃ اور عشر کی رقوم سے اضافہ ہوتا جائے گا۔ جونہی انتظامی مشینری وجود میں آئیگی اس میں سے اخراجات بھی شروع ہو جائیں گے مگر اخراجات فنڈ کی مستقل آمدنی کے تناسب سے ہوں گے۔ تاکہ فنڈ خود کفیل رہے۔

زکوٰۃ اور عشر کا مصرف

میں تمام اہل وطن، خاص طور پر صاحب حیثیت لوگوں سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ دل کھول کر اس فنڈ میں زکوٰۃ، صدقات اور عطیات دیں تاکہ اس رقم کو کارِ خیر پر خرچ کیا جا سکے۔ مجھے یقین ہے کہ ہماری قوم اس دینی اور ملی فریضے کو انجام دینے کے لیے بھرپور حصہ لے گی۔ اب میں چند باتیں زکوٰۃ کے مصرف کے بارے میں کہنا چاہتا ہوں:۔

(۱) زکوٰۃ اور عشر کے مجوزہ نظام کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ مقامی کھاتے میں جمع شدہ رقم کا ۵، فیصد اس گاؤں، محلے یا دیہہ میں خرچ کیا جائے جہاں سے یہ رقم حاصل ہوئی ہے۔

(۲) یہ رقم مقامی لوگ ہی خرچ کریں گے جن کا انتخاب خود محلے، گاؤں یا دیہہ والے ان کی اچھی شہرت یا اعلیٰ کردار کی بنا پر کریں گے۔ یہ نیک اور خدا ترس لوگ یقیناً بیواؤں، یتیموں، مسکینوں اور حاجت مندوں کا خیال رکھیں گے اور اپنے علاقے کی جائز ضرورتوں کو پورا کریں گے۔ البتہ حاجت مندوں کی مالی امداد کرتے وقت اس بات کا خیال رکھا جائے گا کہ لوگوں میں مفت خوری کی عادت نہ پڑ جائے۔ بلکہ کوشش یہ ہوگی کہ اس پیسے سے حاجت مندوں کو اپنے پاؤں پہ کھڑا ہونے میں مدد دی جائے تاکہ وہ دوسروں کے محتاج نہ رہیں اور معاشرے کے صحت مند رکن بن جائیں جب بلدیاتی اداروں کے انتخابات ہو جائیں گے تو یہ کارِ خیر بھی انہی کے سپرد کیا جا سکے گا۔

(۳) زکوٰۃ اور عشر سے جمع ہونے والی رقم کا جو ۲۵ فیصد صوبائی کھاتے میں جمع کیا جائے گا اسے صوبائی زکوٰۃ کونسل ان علاقوں پر خرچ کرے گی

جہاں زکوٰۃ یا عشر سے جمع ہونے والی رقم کم ہو اور حاجت مند زیادہ ہوں۔

(۴) اسی طرح مرکزی کھاتے میں جمع شدہ رقوم بھی مرکزی زکوٰۃ کونسل کی ہدایت کے مطابق صوبائی اور مقامی کھاتوں میں ان کی ضروریات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے منتقل کی جائیں گی۔

اس سلسلے میں حکومت نے دو باتوں کا تہیّہ کر رکھا ہے۔ پہلی بات یہ کہ زکوٰۃ کی ایک ایک پائی صرف ان مدوں پر خرچ ہو جن کی شریعت نے اجازت دی ہے۔ دوسری یہ کہ یہ رقم ایسے ہاتھوں سے خرچ ہو جن پر لوگوں کا پورا اعتماد ہو۔

یہاں یہ بات بھی واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ مقامی کھاتے سے لے کر مرکزی کھاتے تک زکوٰۃ کی وصولی اور اس کے مصرف کا باقاعدہ حساب رکھا جائے گا جس کا معروف طریقے سے آڈٹ کیا جائے گا اور اس کی سالانہ رپورٹ پارلیمنٹ میں پیش کی جائے گی۔

زکوٰۃ اور عشر کا قانون بناتے وقت ہم نے پوری کوشش کی ہے کہ شریعت کے منشاء کو پورا کریں اور موجودہ تقاضوں کو سامنے رکھ کر ایک مؤثر نظام وضع کریں لیکن چونکہ ہماری تاریخ میں یہ تجربہ پہلی بار ہو رہا ہے اس لیے میں اسے زیادہ جامع اور موثر بنانے کے لیے مسودے کی شکل میں آج قوم کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔ میں اہلِ وطن سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ اس کا بغور مطالعہ کریں اور اپنی رائے اور تجاویز سے حکومت پاکستان کی وزارتِ مالیات کو مطلع کریں۔ تجاویز ۳۰ اپریل تک بھیجی جا سکتی ہیں۔ ان تجاویز کی روشنی میں حسبِ ضرورت اس مسودے میں ترمیم کی جائے گی۔ جس کے بعد اسے یکم جولائی ۱۹۷۹ء سے نافذ کر دیا جائے گا۔ دریں اثناء مرکزی زکوٰۃ کونسل کی تشکیل کی جائے گی۔ ایڈمنسٹریٹر جنرل مقرر کیا جائے گا اور ہر صوبے میں کمیٹیاں بنائی جائیں گی جن کا اولین کام اپنے علاقوں میں زکوٰۃ کے مستحق افراد کی فہرستیں تیار کرنا ہوگا۔

زکوٰۃ کے فنڈ کی فراہمی

زکوٰۃ اور عشر کے بارے میں یہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ ہم سب اللہ اور رسولؐ کے ماننے والے ہیں زکوٰۃ اور عشر کو اللہ کا حکم

سمجھ کر ادا کریں۔ انہیں مروجہ مفہوم میں ایک اور ٹیکس نہ سمجھیں۔ اور اپنی کمائی میں سے شریعت کا مقرر کردہ حصہ بخوشی زکوٰۃ فنڈ میں جمع کرائیں۔ اس طرح ہم نہ صرف ایک رفاہی کام میں ہاتھ بٹائیں گے بلکہ ایک عبادت ادا کر کے ثواب بھی کمائیں گے اور اللہ اور رسولؐ کی خوشنودی حاصل کریں گے۔

زکوٰۃ اور عشر کا ذکر کرتے ہوئے میرا دھیان انکم ٹیکس کے موجودہ نظام کی طرف بھی ہے جس سے ٹیکس دینے والے والوں کو بہت سی جائز شکایات ہیں کیونکہ یہ نظام بہت پیچیدہ اور فرسودہ ہے۔ اس کو سادہ، عام فہم اور رفاہی بنانے کی طرف خصوصی توجہ دی جارہی ہے۔

نجی شعبے کے لیے تحفظ

میں نے کئی بار ملکی معیشت کی بدحالی کا ذکر کیا ہے۔ معیشت کو تباہ کرنے میں جہاں بہت سے عناصر کا ہاتھ ہے وہاں قومیانے کی پالیسی کا بھی ہے جس کا ماضی میں جا و بے جا استعمال کیا گیا۔ اسلام میں مملکت اور فرد دونوں کو ملکیت کا حق حاصل ہے۔

پبلک پرائیویٹ سیکٹر ایک ہی گاڑی کے دو پہیے ہیں جب تک یہ دونوں باہمی ربط اور توازن کے ساتھ کام نہیں کرتے قوم ترقی کی راہ پر گامزن نہیں ہو سکتی۔

موجودہ حکومت نے پرائیویٹ سیکٹر کو قومی معیشت میں اپنا بھرپور کردار ادا کرنے پر آمادہ کرنے کے لیے کئی اقدامات کیے ہیں لیکن بعض صنعت کاروں کو اب بھی یہ خدشہ ہے کہ پتہ نہیں کہ موجودہ یا آئندہ حکومت پھر ان کو بلا جواز یا بلا معاوضہ قومی تحویل میں لے لے ان خدشات کو دور کرنے کے لیے ہم آئینی تحفظ دے رہے ہیں جن کا اعلان آج کیا جا رہا ہے۔ اس آئینی تحفظ میں یہ ضمانت دی گئی ہے کہ آئندہ کوئی صنعتی ادارہ معقول معاوضہ ادا کیے بغیر قومی ملکیت میں نہیں لیا جا سکے گا۔ اس آئینی تحفظ سے نہ صرف نجی شعبے میں سرمایہ کاری کو فروغ حاصل ہوگا بلکہ قومی مقاصد حاصل کرنے میں بھی مدد ملے گی۔

بلا سود معیشت

اسلام کے معاشی نظام کا ایک اور اہم پہلو یہ ہے کہ معاشرے کو سود کی لعنت سے پاک کیا جائے۔ ہم یہ کام پوری تندہی سے کرنا چاہتے ہیں لیکن مقصد کا حصول بتدریج ہی ممکن ہے۔ مجھے

یہ اعلان کرکے خوشی محسوس ہوتی ہے کہ آئندہ مالی سال سے ہاؤس بلڈنگ فناس کارپوریشن سود کے بجائے کرنسی میں شراکت کی بنیاد پر مالی وسائل فراہم کرے گی۔ یہ سہولت صرف انہی مکانوں کے لیے دستیاب ہوگی جن کا تعمیر شدہ رقبہ ۲۲۵۰ مربع فٹ سے زیادہ نہ ہو۔ قرضے کی انتہائی حد ایک لاکھ روپے ہوگی۔ حکومت کی طرف سے ہر سال اس کام کارپوریشن سے ایک لاکھ روپے قرض لیتا ہے وہ بیس سال میں مع سود دو لاکھ ۹۳ ہزار روپے ادا کرتا ہے۔ نئی سہولت کے تحت یہی رقم اس عرصے میں تقریباً ایک لاکھ ستاسی ہزار روپے واجب الادا ہوگی۔ مجھے قوی اُمید ہے کہ اس سہولت کے ملنے سے کئی غریب لوگوں کو سر چھپانے کے لیے جگہ مل جائے گی۔

شراب نوشی ایک ایسی بُرائی ہے جو بہت سی بُرائیوں کو جنم دیتی ہے۔ اس سے نجات حاصل کرنے کے لیے آج سے پورے ملک میں شراب نوشی ممنوع قرار دی جاتی ہے۔ غیر مسلم پاکستانی اپنی مذہبی تقریبات کے موقع پر اور غیر ملکی اپنے سفارت خانوں اور اپنی رہائش گاہوں کی حد تک اس سے مستثنیٰ ہونگے

کے لیے جو رقم مختص کی جائے گی اس میں سے ہی یہ قرضے دیئے جائیں گے۔ ان حدوں کے اندر رہتے ہوئے ہاؤس بلڈنگ فناس کارپوریشن چھوٹے مکان بنانے والوں کی ضروریات پوری کرنے کو ترجیح دے گی۔ اس طریقہ کار سے سرکاری تعاون سے مکان بنانے والوں کا مالی بوجھ بہت کم ہو جائے گا۔ مثلاً آج کل کے شرح کے مطابق جو شخص اس

شراکتی سرمایہ کاری

میں نے اپنی پچھلی تقریر میں اعلان کیا تھا کہ وزارتِ مالیات کو یہ ہدایت کی گئی ہے کہ وہ ایسا طریقہ وضع کرے کہ این۔ آئی۔ ٹی اور آئی۔ سی۔ پی سود کے بجائے شراکتی سرمائے کی بنیاد پر یہ کام کیا کریں۔ متعلقہ وزارت نے اس کام کا منصوبہ تیار کر لیا ہے

جس کی حکومت نے منظوری دے دی ہے۔ اور منصوبے کے تحت آئندہ یکم جولائی سے این۔ آئی ڈی مکمل طور پر اور آئی۔ سی پی اجتماعی باہمی فنڈز کی حد تک سود کے بجائے شراکتی سرمائے کی بنیاد پر کاروبار کریں گے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اب ملک میں کم از کم دو ایسے ادارے موجود ہیں جن میں لوگ سود کی لعنت کے بغیر بھی منافع بخش طریقے سے اپنا سرمایہ لگا سکتے ہیں۔

تعزیری قوانین
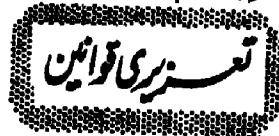
ابھی تک میں نے ان معاشی اور رفاہی باتوں پر زیادہ زور دیا ہے جن کا اسلام نے ہمیں حکم دیا ہے۔ اب میں مختصراً ان تعزیری پہلوؤں کا ذکر کروں گا جو اسلام کے ضابطہ حیات کا حصہ ہیں۔

قرآن مجید اور سنت رسول میں مختلف جرائم کے لیے سزاؤں کی جو انتہائی صورت درج ہے۔ اسے "حد" کہتے ہیں۔ یہ حدود صرف چار ہیں:

(۱) شراب نوشی (۲) زنا (۳) چوری (۴) قذف، یعنی الزام تراشی۔

شراب نوشی

(الف) شراب نوشی ایک ایسی برائی ہے جو بہت سی برائیوں کو جنم دیتی ہے۔ اس سے نجات حاصل کرنے کے لیے آج سے پورے ملک میں شراب نوشی ممنوع قرار دی جاتی ہے۔ غیر مسلم پاکستانی اپنی مذہبی تقریبات کے موقع پر اور غیر ملکی اپنے سفارت خانوں اور اپنی رہائش گاہوں کی حد تک اس سے مستثنیٰ ہوں گے۔

(ب) شراب اور دیگر نشہ آور چیزوں کے استعمال کے ساتھ ساتھ ان کی تیاری ان کو قبضہ میں رکھنا، ان کی خرید و فروخت اور درآمد و برآمد بھی ممنوع ہوگی۔ البتہ طبی اور سائنٹیفک مقاصد کے لیے حکومت سے کسی نشہ آور کیمیائی مواد تیار کرنے کی اجازت حاصل کی جا سکے گی۔

زنا

زنا ایک ایسی لعنت ہے جس کی اسلام سمیت تمام مذاہب عالم نے مذمت کی ہے۔ آج سے اس جرم کی اسلامی سزا نافذ کر دی گئی ہے۔ اس کا اطلاق ہر طرح کی بدکاری پر ہوگا خواہ اس میں فریقین کی رضامندی کا دخل ہو یا نہ ہو۔

چوری اور ڈاکہ زنی

چوری اور ڈاکہ زنی کی سزائیں تقریباً ہر معاشر

میں مقرر ہیں جن کا مقصد دوسرے لوگوں کو عبرت دلانا اور مجرموں کی حتی الامکان اصلاح کرنا ہے جن ممالک میں یہ اسلامی سزائیں رائج ہیں ان میں جرائم کا بڑی حد تک انسداد ہو گیا ہے۔

• "قذف" یا الزام تراشی، اسلام نہ صرف جان اور مال کی حفاظت کرتا ہے بلکہ انسانی عزت و آبرو کو بھی تحفظ بخشتا ہے۔ اس قانون کا مقصد یہ ہے کہ لوگوں کو سنگین الزامات کے جھوٹے بہتان سے محفوظ رکھا جائے۔

ان چاروں جرائم کی جو سزائیں مقرر کی گئی ہیں وہ "حدود" کہلاتی ہیں اور یہ انتہائی سزا صرف اسی صورت میں دی جا سکتی ہے جب جرم ثابت کرنے کے لیے شریعت کی مقرر کردہ شرائط پوری ہو جائیں۔

مجھے امید ہے کہ ان اقدامات سے شریعت کے مقاصد حاصل کرنے میں مدد ملے گی جن میں شہریوں کے جان و مال اور عزت کی حفاظت سر فہرست ہے جو ایک صحت مند اور خوش حال معاشرے کی تشکیل دینے کے لیے ضروری ہے۔

خواتین و حضرات! قوانین چار نافذ کیے جائیں یا چار سو، معاشرہ جرائم سے اس وقت تک پاک نہیں ہو سکتا جب تک کہ ہر شہری خود اپنی اصلاح نہ کرے، میں جب اسلام پر زور دیتا ہوں تو میری مراد یہی ہوتی ہے کہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کا ہر باشندہ اسلام کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق اپنی اصلاح خود کرلے تاکہ یہ ملک اور معاشرہ سدھر جائے

پولیس کی تنظیم نو

مجھے اس بات کا پورا احساس ہے کہ ہر پاکستانی کو توقع ہے کہ نظام اسلام آتے ہی جرائم ختم ہو جائیں گے اور اگر کوئی جرم کرے گا بھی تو ہماری انتظامیہ اور عدلیہ کا نظام ایسا ہو گا کہ بر وقت اور سہل طریقے سے انصاف مل جائے گا بلاشبہ ہماری منزل بھی یہی ہے لیکن اسے پانے کے لیے ہم سب کو انفرادی اور اجتماعی طور پر کوشش کرنی ہو گی اور اس جدوجہد میں کچھ وقت ضرور لگے گا اس سلسلے میں پولیس کی اصلاح بھی ایک اہم قدم ہے جس کے لیے مندرجہ ذیل اقدامات کیے جا رہے ہیں۔

(۱) پولیس کے لیے ایک جامع ضابطہ اخلاق بنایا گیا ہے جو اسلامی تعلیمات، ملکی آئین اور مختلف قوانین کی روشنی میں مرتب کیا گیا ہے۔ محکمہ پولیس کا

کا ہر ایک فرد اس ضابطے کا پابند ہوگا۔

(۲) پولیس کی تنظیم نو کی جائے گی جس کے تحت سراغ رسانی (ڈیٹیکٹو) اور واچ اینڈ وارڈ کے شعبے الگ الگ ہوں گے۔

(۳) ہر پولیس افسر کی قابلیت اور کارکردگی کا معیار یہ ہوگا کہ وہ جرائم کی روک تھام میں کہاں تک کامیاب ہے اور اس کے علاقہ میں امن وامان کی حالت کیسی ہے۔

(۴) آئندہ فوجی مقدمات کی پیروی پولیس کا کام نہیں ہوگا بلکہ یہ ذمہ داری ایک اور خود مختار ادارے کو سونپی جائے گی۔

(۵) پولیس کی بھرتی، ٹریننگ، ریسرچ اور تفتیش کی سہولتوں اور رسل ورسائل کے انتظام کو بہتر بنایا جائے گا۔ ٹریننگ میں اسلامی تعلیمات کے مطابق اخلاقی پہلوؤں پر خصوصی توجہ دی جائے گی۔ اگر پولیس کی اصلاح کے ساتھ ساتھ ہر فرد خود تھوڑی بہت اپنی اصلاح کرے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم بہتر معاشرہ تشکیل دینے میں کامیاب نہ ہوسکیں۔ مثلاً نماز ہی کے فلسفہ کو لیجئے۔ نماز انسان کو برائیوں سے دور اور جسمانی اور روحانی لحاظ سے پاکیزہ رکھتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے حضور ہر روز پانچ مرتبہ حاضری اس بات کی ضمانت ہے کہ انسان ظاہری اور باطنی آلودگی سے محفوظ رہتا ہے۔ اس لیے ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ خود باقاعدگی سے نماز قائم کرے اور اپنے گھروالوں اور دوسرے زیر اثر لوگوں کو نماز کی تلقین کرے اسی طرح روزہ، زکوٰۃ اور حج کی پابندی بھی اشد ضروری ہے۔ کیونکہ یہ سب ارکان ایک اجتماعی ضابطے اور ایک صالح معاشرے کا ایک حصہ ہیں۔

سادگی کو اپنایا جائے

اس اجتماعی ضابطے کا ایک اہم پہلو سادگی ہے۔ لباس میں سادگی، عادت میں سادگی اور بود وباش میں سادگی ــــ میں توقع کروں گا کہ سرکاری محکموں سمیت ہر شعبۂ زندگی میں سادگی کو اپنایا جائے گا جس کی مثال متعلقہ شعبوں کی سرکردہ ہستیوں اور سربراہوں کو قائم کرنی چاہئے۔

قیدیوں کے لیے معافی

عید میلاد النبی کے مبارک موقع پر میں تمام قیدیوں کی سزاؤں میں ایک ماہ کی معافی کا

اعلان کرتا ہوں۔

ہموطنوں کو مبارک باد

تقریر ختم کرنے سے پہلے میں اہل وطن کو مبارکباد دیتا ہوں کہ آج اللہ تعالیٰ کے فضل سے نظام اسلام کی ہمارے ملک میں باقاعدہ ابتداء ہو گئی ہے جس کے وہ برسوں سے منتظر تھے۔ میں ان سے یہی درخواست کروں گا کہ وہ آج ۱۲ ربیع الاول کے موقع پر عہد کریں کہ وہ اپنی ذاتی رنجش اور سیاسی رقابتوں سے بالاتر ہو کر اس تجربے کو کامیاب بنانے کی کوشش کریں گے۔ مجھے اپنے ہم وطنوں کی صلاحیتوں پر پورا پورا اعتماد ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے عوام جو اسلام کی خاطر بڑی سے بڑی قربانی سے گریز نہیں کرتے یقیناً اس تجربے کو کامیاب بنا دیں گے۔

مجھے سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ کی رحمت اور توفیق پر بھروسہ ہے اور مجھے پورا یقین ہے وہ ہماری ان کوششوں کو قبول فرمائے گا اور مزید اقدامات کے لیے ہمیں قوت، حوصلہ اور توفیق بخشے گا۔

آمین!

قوم کے امتحان کا وقت

آج وہ مبارک دن ہے جب اس کرہ ارض پر ایک عظیم ہستی نے جنم لیا اور بنی نوع انسان کی تقدیر بدل دی۔ اس ہستی کے یوم ولادت پر آج ہم اسلامی نظام نافذ کر رہے ہیں جس سے انشاء اللہ ہماری کایا پلٹ سکتی ہے۔ کایا پلٹنے کا دارومدار ہمارے اپنے کردار اور کوشش پر ہے۔ کیونکہ کوئی بھی نظام انسان کی راہنمائی تو کر سکتا ہے اسے مجبور نہیں کر سکتا۔ اپنے کردار کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے جو ہمیں اختیار دیا ہے اب اس کے امتحان کا وقت آ گیا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ آج کے بعد ہمارے کردار میں کوئی مثبت تبدیلی آتی ہے یا نہیں۔ مجھے اپنی قوم سے بہت سی توقعات ہیں۔ مجھے اس کی طاقت کا بھی اندازہ ہے۔ مجھے پوری طرح احساس ہے کہ جو قوم تحریک پاکستان اور تحریک نظام اسلام میں سرخرو ہوئی وہ اب انشاء اللہ قیام نظام اسلام میں بھی کامیاب ہو گی۔

اسلام زندہ باد

پاکستان پائندہ باد

پاکستان میں اسلامی نظام کے نفاذ کے موقع پر

صباحسنی

مخمور دل پھر اپنا کچھ گنگنا رہا ہے
ظلمت کی حکمرانی کا دور جا رہا ہے
اہلِ چمن مبارک اسلام آ رہا ہے
کیف و سرور راحت کے جام لا رہا ہے
بن کر سحابِ رحمت گلشن پہ چھا رہا ہے
اسلام آ رہا ہے، اسلام آ رہا ہے

جس خوبرو کی مدت سے منتظر تھیں آنکھیں
برسوں سے تک رہے تھے جس دلربا کی راہیں
پروانہ وار جس پر قربان کی تھیں جانیں
آمد ہے اب اسی کی پھر کیوں نہ گیت گائیں
ہر طائرِ گلستاں نغمے سنا رہا ہے
اسلام آ رہا ہے اسلام آ رہا ہے

سب بھولی بسری باتیں تڑپاتی ہیں دلوں کو
پھونکا تھا آشیاں کو، گلزار کو، گلوں کو
کٹوایا گردنوں کو، لٹوایا عصمتوں کو
پھر بھی نہ غم تھا کوئی واللہ سر پھروں کو
اک سرخوشی تھی، مومن مقصود پا رہا ہے
اسلام آ رہا ہے، اسلام آ رہا ہے

کیا کیفیت تھی اپنی کچھ سوچ تو مسلماں
دریائے خوں میں اترے چہرے تھے پھر بھی تاباں
بچے، جوان، بوڑھے سب ہو رہے تھے قرباں
قربان گاہ پر بھی خنداں تھے اور شاداں
سمجھے تھے کفر و باطل بستر اٹھا رہا ہے
اسلام آ رہا ہے، اسلام آ رہا ہے

کس واسطے کیا تھا ارضِ وطن کو حاصل
سب بھول بیٹھے یارو اپنی حسین منزل
جو بھی بنا نگہباں، نکلا ہر ایک قاتل
مقصد کے جو تھے عاشق بنتے رہے وہ بسمل
ان کی ہی کاوشوں سے اب کفر جا رہا ہے
اسلام آ رہا ہے، اسلام آ رہا ہے

طوفاں جو دیں کے اٹھے اللہ کے سپاہی
سر پر کفن لیے جب نکلے ہیں مصطفائی
دیوانہ وار بڑھ کر قرباں جان کر دی
رحمت کو جوش آیا، آئی مدد خدا کی
ظالم کو دیکھ لیجے کیا منہ کی کھا رہا ہے
اسلام آرہا ہے، اسلام آرہا ہے

یہ فتح و کامرانی اے دوستو مبارک
یہ من کی حکمرانی اے ساتھیو مبارک
اللہ کی شریعت اے مومنو مبارک
اے عاصیو مبارک، اے عابدو مبارک
اپنے کرم کا جلوہ مولیٰ دکھا رہا ہے
اسلام آرہا ہے، اسلام آرہا ہے

عالی مقام سیدؒ! اے جانِ جاں فروشاں
اے دین کے سپاہی! اے شب گزارِ زنداں
دار و رسن کو چوما تو نے بہ نورِ ایماں
دراصل ہو مبارک تجھ کو ہی مردِ میداں
کارِ عظیم تیرا ثمرہ دکھا رہا ہے
اسلام آرہا ہے، اسلام آرہا ہے

اے راہِ حق کے ساتھی اس پر نہ پھول جانا
مہماں جو آرہا ہے عزت سے اس کو لانا
غفلت سے اپنی بٹہ عزت پہ مت لگانا
چوکس حدود سے رہنا، دھوکہ کبھی نہ کھانا
جوشِ غضب میں دشمن بھی تاؤ کھا رہا ہے
اسلام آرہا ہے، اسلام آرہا ہے

دل میں ہے گر تمہارے اسلام کی محبت
فرقوں میں بٹ نہ جاؤ اے رہبرانِ امت
مل کر بڑھو خدارا، اے عاشقانِ ملت
رسی خدا کی پکڑو، ہو جاؤ ایک وحدت
یہ افتراق آخر کس طرح بھا رہا ہے
اسلام آرہا ہے، اسلام آرہا ہے

مقصود آپ کا ہے اللہ کی حکومت
محبوب آپ کو ہے اسلام کی شریعت
اور چاہتے ہیں دل سے اس راہ میں شہادت
پھر جان لیجے ہے یہ ثابت شدہ حقیقت
ہر تفرقہ کا رستہ شیطان دکھا رہا ہے
اسلام آرہا ہے، اسلام آرہا ہے

روزِ ازل سے قائم اللہ کا ہے دستور
جو اس کی نعمتوں کی کرتے ہیں قدر بھرپور
پھر نعمتیں بھی ان سے ہوتی نہیں کبھی دور
ورنہ گرفت اس کی ہے چار دانگ مشہور
پیغامِ حق صبا تو ہر حق سنا رہا ہے
اسلام آرہا ہے، اسلام آرہا ہے

اسعد گیلانی

نظام مصطفیٰ کے اجراء کے اعلان کا متن

مالک الملک۔ اللہ تعالیٰ جل جلالہ اور خلق خدا کو گواہ کر کے اعلان کیا جاتا ہے کہ مملکت اسلامیہ جمہوریہ پاکستان میں آج مورخہ بوقت بارہ بج کر ایک منٹ پر بروز جمعۃ المبارک سے نظام مصطفیٰ کا اجرا و نفاذ کیا جاتا ہے۔ اب اس مقدس لمحہ سے مملکت پاکستان میں بالاتر قانون صرف قرآن و سنت کو قرار دیا جاتا ہے۔ اب مملکت اور اس کے عام باشندوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے تمام مسائل اور تنازعات کے لیے اسی الٰہی ہدایت کی طرف رجوع کیا جائیگا۔ مملکت کے اندر رائج ہر ضابطہ، قانون، رسم و رواج اور روایت کو اسی کی روشنی میں قبول کیا جائے گا اور اس سے متصادم تمام قوانین و ضوابط رسم و رواج اور روایات کالعدم قرار پائیں گے اب یہ قانون مملکت کے ہر باشندے پر نافذ ہوگا اور اس سے کوئی ادارہ یا فرد اجتماعی یا انفرادی حیثیت سے مستثنیٰ نہ ہوگا۔ مملکت کے داخلی اور خارجی، معاشی اور سیاسی، معاشرتی اور ثقافتی تمام پالیسیاں اسی کی روشنی میں طے کی جائیں گی۔ اس مملکت کا مشن نفاذ شریعت، تبلیغ اسلام اور اعلاء کلمۃ الحق ہوگا۔ اس کو چلانے کی ذمہ داری انہیں پر ہوگی جو اطاعت قرآن و سنت میں سب سے آگے اور علم و آگہی اور خدا ترسی میں ممتاز ہونگے۔ اس مملکت کے تمام ادارے اور اعضاء و جوارح منصب دار، عمال و حکام اس مشن کی تکمیل پر کاربند اور اس کے پابند قرار دیئے جاتے ہیں اور اسی

مشن کی روشنی میں ان کی کارکردگی اور فرائض کی ادائیگی کا محاسبہ ہوگا۔ یہ مملکت زمین پر خدائی بادشاہت کے مقصد کو پورا کرے گی۔ اور اپنے حقیقی بادشاہ کے احکام کی پابند اور اس کی حکمت کی علمبردار ہوگی۔ دنیا کے تمام مسلمانوں کو اس کے شہری حقوق حاصل ہیں۔ اور دنیا کے عام انسانوں کے بنیادی حقوق کی حفاظت اس کے فرائض میں داخل ہے۔ انسان ہونے کی حیثیت سے تمام خلقِ خدا اس کی نظر میں مساوی ہے۔ یہ مملکت عدل اجتماعی اور عالمگیر برادری پر یقین رکھتی ہے۔ یہ مملکت مظلوم کا ساتھ دے گی، ظالم کا ہاتھ پکڑے گی۔ باطل کو ٹوکے گی اور حق کی پشت پناہی کرے گی۔ یہ مملکت اپنے وجود میں فلاحِ عامہ اور خدمتِ انسانیت کی جدوجہد کرے گی۔ اللہ تعالےٰ اس مملکت کا حامی و ناصر ہو۔"

اس مضبوط واضح اور غیر مبہم اعلان کے ساتھ وہ نظریاتی فضا وجود میں آجائے گی۔ جس کے بعد پوری قوم میں احساسِ فرض اور پابندیٔ اسلام کا جذبہ بیدار ہو جائے گا اور نظامِ باطل کی مروجہ قدروں کی جگہ اسلام کی انقلاب آفریں قدریں لوگوں کے سامنے واضح اور واہم تر ہو جائیں گی۔ انہیں کا التزام ہر دل کی تمنا قرار پائے گا۔

اس اعلان کے بعد قاتلوں کے سوا تمام قید خانوں کے پھاٹک کھول دیئے جائیں اور نظامِ باطل میں گرفتار شدہ سب قیدی نیک چلنی کی ضمانت پر رہا کر دیئے جائیں۔ اس کے بعد زندگی کے مختلف شعبوں میں اقدامات کا سلسلہ فوری طور پر شروع کر دیا جائے۔

نشرواشاعت

۱۔ ریڈیو، ٹیلی ویژن، اخبارات و رسائل اور دیگر اشاعتی مواد، اشتہاری بورڈ اور کتبات میں فحش زبان، فحش حرکات اور عورت کو ذریعۂ تشہیر بنانے کو فی الفور ترک کر دیا جائے۔ اور سارے ملک سے ایسے تجارتی، فلمی اشتہاری کتبات ہٹا کر بدل دیئے جائیں گے جن میں فحش عبارت، فحش مناظر یا عورت کو ذریعہ اشتہار بنایا گیا ہو۔

۲۔ ریڈیو، ٹیلی ویژن اور اخبارات میں سے بے دین، ملحد اور غیر پاکستانی ذہن والے حضرات کو فی الفور رخصت کر دیا جائے۔

۳۔ فلموں کی نمائش کو فوری طور پر ایک ماہ کے لیے روک کر انہیں ایڈیٹنگ کے لیے لیبارٹریز

بھیج دیا جائے تاکہ نشر و اشاعت کی پالیسی کے
مطابق ان پر نظر ثانی کی جائے اور ان میں سے
وہ مناظر، مکالمے اور گانے حذف کر دیئے جائیں
جو اسلامی اخلاق کی رُو سے فحاشی کے ضمن میں آتے
ہوں۔ جو فلمیں ایڈیٹنگ کے باوجود اسلامی معیار
اخلاق پر پوری نہ اتر سکیں انہیں تلف کر دیا جائے۔

۴۔ سائنسی اور فنی جرائد کو چھوڑ کر دیگر تمام غیر ملکی
جرائد کی درآمد فوری طور پر بند کر دی
جائے اور متعلقہ رسائل کے مالکان اور
کتب خانوں کو اپنی اشاعتی پالیسی سے آگاہ
کر دیا جائے، تاکہ وہ آئندہ اسی پالیسی کی
روشنی میں شائع کردہ مواد پاکستان کے
لیے ارسال کریں۔

ثقافتی سرگرمیاں اور دیگر منکرات

۱۔ فحش گانے، عورتوں مردوں کے مخلوط گانے
اور رمز و کنایہ میں ایک دوسرے کو مخاطب
کرنے والے عشقیہ گیت بلا تاخیر بند کر دیئے
جائیں۔

۲۔ نائٹ کلب، ناچ گھر، ناچ رنگ کے ثقافتی
ادارے، آرٹ کونسلیں، ثقافتی شو، ریس
کورس، جوئے خانے، شراب خانے اور بھنگ
چرس کے سب ٹھیکے فی الفور بند کر دیئے
جائیں۔ شراب نہ دوا ہے نہ کسی مذہب
میں جائز ہے۔ اس لیے غیر مسلموں کے لیے
بھی اس کی اجازت ختم کر دی جائے۔ اس
لیے کہ غیر مسلموں کو شراب مہیا کرنا اسلامی
حکومت کے فرائض میں شامل نہیں ہے۔

۳۔ عصمت فروشی کے تمام اڈے بلا تاخیر
ختم کر دیے جائیں اور بازاری عورتوں کی
شادیاں انہیں بازاری مردوں سے کر دی
جائیں جو اُن کے گاہک ہیں۔

۴۔ ملک کے ہر کونے سے سڑکوں، عمارتوں
یا چوراہوں پر یادگاری نصب بت اٹھا
دیئے جائیں اور اداروں، سڑکوں یا دیگر
عمارات کے غیر اسلامی نام بدل کر بلا تاخیر
اسلامی نام رکھ دیئے جائیں۔

اسلامی اور قومی کلچر

۱۔ ہر ایک پاکستانی کے لیے لازم ہوگا کہ وہ
سادہ لباس پہنے۔ ایسا لباس جس سے وہ
پاکستانی نظر آئے اور موجودہ پاکستان میں
شلوار قمیص پورے ملک کے تمام علاقوں
کا لباس رہے۔ اور یہ ایک ساتر لباس بھی ہے

اس لیے یہی ہمارا قومی لباس ہو۔ دیگر رنگ برنگے لباس ممنوع قرار دیئے جائیں۔ خصوصاً ایسے لباس جن سے دوسری قوموں کی نقالی کا گمان اور غلامانہ ذہنیت کا اظہار ہو۔

۲۔ غیر ملکی لباس بھی جو غیر ساتر ہو غیر ملکیوں کے لیے بھی پہننا ممنوع ہو۔ غیر ملکی عورتیں بھی پاکستان میں ساتر لباس ہی پہنیں۔ اس لیے کہ غیر ساتر لباس سے اسلامی کلچر اور اس کی فضا کو سخت نقصان پہنچتا ہے جس کی حفاظت ہمارا فرض ہے۔

۳۔ پاکستانی مسلم خواتین چادر اور چار دیواری کا پورا اہتمام کریں۔ چادر کے بغیر کوئی خاتون بیرونی سرگرمیوں میں شریک نہ ہو۔ عورت کی آبرو ہی اس کا حقیقی زیور ہے۔ حکومت کی یہ ذمہ داری ہو کہ وہ معاش سے مجبور عورتوں کو بلا تاخیر معاشی سہارا دے اور عورتوں کو معاش کمانے پر مجبور نہ کیا جائے۔

تعلیم

۱۔ پہلے مرحلے پر تمام تعلیم گاہوں میں پرائمری ایم اے تک اور تعلیم کے ہر میدان اور ہر قسم میں انگریزی کو اختیاری اور عربی کو لازمی مضمون قرار دیا جائے۔ عربی پڑھانے کے لیے اساتذہ تعلیمی سطح پر دینی مدارس سے اور اعلیٰ سطح پر سعودی عرب اور مصر کی حکومتوں سے حاصل کیے جائیں جو بالعموم اپنی حکومتوں کے اخراجات پر مسلمان ملکوں میں عربی سکھاتے ہیں، ورنہ خود ہمارے ملک میں عربی دان حضرات کی بہت کثرت ہے جو ہر سطح پر طالب علموں کو عربی پڑھا سکتے ہیں۔

۲۔ روزانہ درسِ قرآن کا پیریڈ تمام درجات میں لازمی کر دیا جائے جس میں تعلیماتِ قرآن کو عام فہم کر کے بیان کیا جائے۔

۳۔ تمام غیر ملکی مشنری تعلیمی ادارے قومیا لیے جائیں اور ان میں مروجہ ملکی تعلیمی نصاب رائج کر دیا جائے۔ مختصر درسِ قرآن کا سلسلہ ہر تعلیمی ادارے میں جاری ہو اور ایک ارشادِ رسول روزانہ سکھایا جائے۔

۴۔ مختلف تعلیمی معیار والے خصوصی اسکول ختم کر کے سب یکساں کر دیئے جائیں جو سب کے لیے عام ہوں، سب کا نصاب یکساں ہو جس سے یکساں ذہن تیار ہوں۔

۵۔ غیر مسلموں کو مذہبی تعلیم کے لیے اپنے

سکول قائم کرنے کی مکمل اجازت ہو جس میں مسلمان طالب علموں کا داخلہ ممنوع ہو۔

۶۔ غیر ملکی مشنوں کو جاسوسی کرنے اور لوگوں کے عقائد و اخلاق بگاڑنے سے روک دیا جائے۔

۷۔ عام آبادی کو قرآن یا ترجمہ پڑھانے کے لیے تعلیم بالغان کے سنٹر محلوں کی مساجد میں بلا تاخیر قائم کر دیئے جائیں جہاں تعلیم یافتہ لوگ اَن پڑھ آبادی کو قرآن پڑھائیں اور ساتھ ہی معمولی نوشت و خواند سکھائیں۔

۸۔ تعلیم گاہوں میں سے، ملحد، بے دین، بدکردار اور غیر ملکی نظریات رکھنے والے اساتذہ کو تعلیمی ماحول میں سے چن چن کر الگ کر دیا جائے تاکہ ہماری نسل ان گمراہ کرنے والوں سے محفوظ ہو جائے۔

زراعت

۱۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے سب سے پہلے جو کام کیا وہ غصب کی ہوئی جائیدادوں کی واپسی اور جاگیرداری کی تنسیخ تھی۔ وہ قینچی لے کر بیٹھ گئے تھے اور ایک ایک جاگیر کی دستاویزات قینچی سے کاٹ کاٹ کر پھینکتے چلے گئے تھے۔ یہاں تک کہ انہوں نے چند ہی دنوں میں پوری مملکت سے جاگیرداری کو ختم کر دیا تھا۔ آج جو اسلامی حکومت قائم ہو اور وہ نظام مصطفےٰ جاری کرے اس کے لیے بھی لازم ہے کہ سب سے پہلے وہ قوم سے غداری اور انگریزوں اور جابر حکمرانوں سے وفاداری اور خوشامد کے نتیجے میں حاصل کی ہوئی تمام جاگیریں یک قلم منسوخ کر دے۔ یہ کام ایک تحقیقاتی عدالتی کمیشن کے ذریعے تین ماہ کے اندر اندر مکمل کر دیا جائے جو کچھ دشوار نہیں ہے اس لیے کہ جاگیروں کی مکمل تحقیق دکوائف موجود ہیں۔ ان میں کچھ بھی جائز نہیں ہے۔

۲۔ جاگیروں سے حاصل کی ہوئی زمین اس کے مزارعوں میں تناسب سے بانٹ دی جائے۔

۳۔ سرکاری زمین کو بھی بے زمین کاشتکاروں میں تین ماہ کے اندر بانٹ دیا جائے۔

۴۔ ان تقسیم کی جانے والی زمینوں کا کوئی معاوضہ رجسٹریشن فیس کے علاوہ کسی کاشتکار سے وصول نہ کیا جائے۔

۵۔ غیر آباد زمینوں کو محکمۂ زراعت اور

نظام مصطفیٰ کے اجرا کے اعلان کا متن

ترقیاتی اداروں کے ذریعے ہموار اور آباد کر کے کاشتکاروں میں بلا معاوضہ تقسیم کر دیا جائے۔ صرف آبادکاری کے ترقیاتی مصارف لے لیے جائیں۔

۶۔ یہ ساری زمین بے زمین کاشتکاروں کو ۱۲ ایکڑ فی خاندان کے تناسب سے تقسیم کی جائے۔ یہ کام مہاتی انداز میں ۱۰ ماہ کے اندر اندر محکمہ مال کی مدد سے سرانجام دے دیا جائے۔

۷۔ کھاد بلا معاوضہ مہیا کی جائے اور باہر سے کھاد منگانے کی کھلی اجازت تاجروں کو حاصل ہو تاکہ مسابقت پیدا ہو سکے۔ اس کا نرخ گرا کر حتی الوسع ۲۵/- روپے بوری تک لایا جائے۔ خسارہ اگر ہو تو اُسے حکومت برداشت کرے۔

۸۔ اشیاء خوراک کی ذخیرہ اندوزی کو سخت جرم قرار دیا جائے جس کی سزا ہو تاکہ ہر پیداوار ہر وقت بازار میں موجود ہو اور تجارت آزاد اور کھلی مسابقت پر ہو۔

۹۔ اشیاء خوردنی اور گھریلو استعمال کی چیزوں پر سے تمام کنٹرول ختم کر دیئے جائیں۔ راشننگ کا نظام ختم کرا یا جائے۔

صنعت و حرفت

۱۔ تمام قومیائی ہوئی چھوٹی صنعتیں مالکان کو بلا تاخیر واپس کی جائیں۔

۲۔ تمام قومیائی ہوئی بڑی صنعتوں میں اس کے سابق حصہ داروں کا ۳۳ فیصدی مزدوروں کا ۳۳ فیصدی اور مملکت کا ۳۴ فیصدی حصہ مقرر کر دیا جائے اور اس کی نظامت میں اسی تناسب سے تینوں حصہ داروں کے نمائندے شریک کیے جائیں۔

۳۔ ملک میں بنیادی صنعتوں کے لیے سرمایہ کاری کی دعوت عام دی جائے اور چھوٹی چھوٹی گھریلو صنعتوں کو دیہاتوں اور قصبات تک پہنچایا جائے خصوصاً جو صنعتیں اپنا خام مال ملک کے اندر رکھتی ہیں۔

۴۔ مشینوں اور اس سے متعلق سامان صنعت کے سوا لباس، خوراک، آرائش اور دیگر سامان تعیش کی غیر ملکی درآمد پر فوری طور پر اور مکمل پابندی لگادی جائے۔

۵۔ پانچ سال سے پرانی صنعتوں پر تاوان کا اصول ختم کر دیا جائے

تقسیم زکوٰۃ اور مستحقین

١. پورے ملک کے تمام صاحب نصاب افراد سے فوری طور پر ایک سال گذشتہ کی زکوٰۃ وصول کر لی جائے جو شریعت کے مطابق بنکوں کے سرمایوں، اثاثوں، زیورات، تمسکات اور مویشیوں پر عائد ہوتی ہو، اس کی مقدار کا اندازہ کئی ارب روپے ہوگا۔

٢. تمام مملکت میں تین ماہ کے اندر ہر گاؤں ہر محلے اور ہر آبادی میں اتحاد کمیٹیاں یا رفاہ عامہ کمیٹیاں برادریوں کے سربراہوں، اہل علم، دین دار اور معززین پر مشتمل بنادی جائیں۔ ہر کمیٹی کم از کم دس افراد پر مشتمل ہو۔ یہ کمیٹیاں اپنے علاقے میں مساکین، بیوگان، یتیم محتاج اور اہل حاجت کی فہرستیں اور ان کی ضروریات کے گوشوارے مرتب کر دیں اور ان کی سفارش پر ان کے وظائف زکوٰۃ فنڈ میں سے بلا تاخیر جاری کر دیئے جائیں۔ اس طرح پورے ملک کے غربا کو اطمینان کا سانس آئے گا۔ اس فنڈ میں سے بے روزگاروں کو الاؤنس بھی دیا جائے۔

فصل خصومات

١. ہر بستی کے چھوٹے چھوٹے تنازعات اور مقدمات وہاں کی اتحاد کمیٹی کے پاس جائیں جو جیوری کا کام کریں اور چھوٹے مسائل کا فیصلہ کریں۔

٢. ہر تحصیل اور ضلع کی سطح پر عدالتوں میں شریعت کے مطابق فیصلے ہوں اور عدالتوں کی مدد کے لیے ہر عدالت کے ساتھ تین علماء کی کمیٹی اسلامی قانون کا مشورہ دینے کے لیے موجود ہو۔ جسے جیوری کی حیثیت حاصل ہو۔

٣. چھوٹی آبادیوں میں یہ عدالتیں مسجدوں میں کام کریں۔

٤. عدالتوں میں انصاف مفت کر دیا جائے — کورٹ فیس ختم کر دی جائے۔

غریبوں کے معاشی مسائل۔

١. ہر تجارت و معیشت میں ہر قسم کی اجارہ داریوں کا مکمل خاتمہ، قیمتوں اور اشیاء پر کنٹرول کا خاتمہ ہو تاکہ طلب و رسد کے اصول پر مسابقت ہو اور اشیا کی قیمتوں میں توازن قائم ہو جائے۔

٢. تمام ذخائر خوراک کی ذخیرہ اندوزی کو جرم قرار دیا جائے اور اسے قابل دست اندازی پولیس بنادیا جائے۔

٣. زکوٰۃ میں سے بے روزگاروں کو روزگار یا بے روزگاری الاؤنس دیا جائے۔ اس کا سرمایہ

اور تصدیق و توثیق اتحاد یا نفاذ عامہ کمیٹیاں کریں۔

۔ شہروں کی کچی بستیوں کو پکی بستیاں قرار دے کر ان میں پانچ مرلے فی خاندان رقبہ مستقل ملکیت کے طور پر الاٹ کر دیا جائے اور معمولی تعمیر کے لیے امدادی سامان بھی مہیا کیا جائے۔ دیہاتوں میں غیر کاشتکاروں کو سات مرلے رقبہ برائے تعمیر مکان مستقل ملکیت کے طور پر دیا جائے۔ یہ کام ابتدائی تین ماہ میں محکمہ مال اور بلدیات کی معرفت ہنگامی بنیادوں میں مکمل کر کے ختم کر دیا جائے ان کے علاوہ بھی جو لوگ بے مکان ہوں ان کو سرکاری زمین پر شہروں میں ۵ مرلے اور دیہاتوں میں ۷ مرلے کے تناسب سے مکمل رہائشی جگہ دی جائے۔

۵۔ دو کنال سے بڑے مکانات کی زائد جگہ میں بے مکان لوگوں کو آباد کیا جائے اور زائد حصہ زمین یا مکان الگ کر کے اسے بے مکان غرباء میں تقسیم کر دیا جائے۔

۶۔ ملک کے تمام دریاؤں کے پاٹ گہرے کرنے کا ملک گیر منصوبہ بنا کر بے روزگار غیر ماہر لوگوں کو اس کام میں اجرت پر لگا دیا جائے۔

۷۔ عام شہریوں کا علاج مفت کرنے کا حکومت اعلان کر دے اور حکومت کے دیانت دار اور اہل معالجین اس کی نگرانی کریں کہ بہترین علاج کا اہتمام کیا جائے۔

۸۔ تنخواہوں میں کم سے کم اور زیادہ سے زیادہ تنخواہ کا فرق ایک اور دس کے تناسب پر لایا جائے۔

۔ افسروں کو سادگی اور ماتحتوں کی کفالت کا اہتمام کیا جائے اور دونوں کے معاشرتی بُعد کو کم کیا جائے۔

۹۔ ایک پرائس بورڈ قیمتوں کا اندازہ کر کے پانچ افراد کے کنبے کے تمام اخراجات کا تخمینہ لگائے اور اسلامی ریاست میں اسی تخمینہ کے مطابق کم سے کم تنخواہ مقرر کی جائے اور افراد کنبہ کے اضافے کے ساتھ ہر فرد کے الاؤنس تنخواہ میں اضافہ کیا جائے تاکہ افراد خاندان کے اضافے پر دیرینہ وحشت باقی نہ رہے۔

۱۰۔ مزدوروں کو کم سے کم تنخواہ گزارہ کی بنیاد پر دی جائے اور انہیں ہڑتال کا حق دیا جائے۔

۱۱۔ عوام کی درخواستوں پر ہر سطح پر سات دن کے اندر اندر کارروائی کا اہتمام کیا جائے۔ اور تاخیر کرنے والے اہل کار کی جواب طلبی اور تساہل کے ثبوت پر تنزلی یا برخاستگی کا اہتمام کیا جائے۔

۱۲۔ عہدوں سے ناجائز فائدہ اٹھانے والوں کے معاملات کی کمیشن کے ذریعہ تین ماہ کے اندر تحقیقات کر کے انہیں پبلک ذمہ داریوں کے نااہل قرار دے دیا جائے اور ان کی ناجائز ملکیت کو بھی سرکار ضبط کر لیا جائے۔

۱۳۔ معاشی پالیسی کے طور پر معاشرے کے بالائی طبقوں کو سادگی کا درس دے کر ذرا نیچے اتار کر عوام کے قریب تر لایا جائے اور عام غریب آدمی کا معیار معیشت بہتر بنا کر اسے ذرا اوپر اٹھایا جائے تاکہ مسلمانوں میں طبقاتی احساس کی شیطانی حس جو بھائی کو بھائی سے لڑاتی ہے پیدا نہ ہونے پائے اور اسلامی اخوت قائم رہے۔

عوامی احتساب کا اہتمام۔

۱۔ حکومت کی طرف سے تنقید کی حوصلہ افزائی کی جائے اور خوشامد کی روش کی سخت سے سخت شکنی کی جائے۔ خوشامدیوں کو معاشرے میں نکو بنا دیا جائے۔

۲۔ عوام کی طرف سے ہر سطح پر حکومت کی اصلاح کے لیے تجاویز طلب کی جائیں اور جن حکام کی شکایات آئیں ان کا بلا تاخیر سخت نوٹس لیا جائے۔

۳۔ حکام کو حقیقی طور پر خادم خلق بن کر رہنے یا سروس سے نکل جانے کا راستہ پختگی کے ساتھ دکھایا جائے۔ حکام کی رعونت کو ان کی نااہلی کے لیے کافی سمجھا جائے۔

۴۔ ترقی کا معیار دیانت اور صلاحیت کو قرار دیا جائے۔

۵۔ کوئی اخبار یا رسالہ تنقید و احتساب کے سبب بند نہ کیا جائے۔ البتہ اخلاقی جرائم پر گرفت کی جائے۔

خصوصی توجہ کا مرکز

مسلمانوں کو ذہنی طور پر خدا کی بندگی، رسولؐ کی اطاعت، آخرت کی فکر اور اسلامی حکومت کے لیے جہاد فی سبیل اللہ کا سبق مسلسل اور متواتر ہر ذریعہ سے دیا جائے۔ نشریاتی اداروں کی عمومی پالیسی یہ ہو کر ان بنیادی باتوں کی نشر و اشاعت پر پوری توجہ صرف کی جائے۔

غصب شدہ حقوق کی واپسی اور بحالی

ایک عام اعلان کر دیا جائے کہ جس کا جو حق تلف ہوا ہو یا غصب کیا گیا ہو۔ وہ اپنا دعویٰ ثبوت کے ساتھ پیش کرے اور چھوٹے چھوٹے عدالتی ٹربیونل کے ذریعے ضلع وار سمری ٹرائل کر کے حقوق کی بحالی

کے تصفیے کئے جائیں اور حق داروں کے حقوق ظالموں سے واپس دلائے جائیں۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے ساداتؑ کے باغ فدک تک کا فیصلہ ان کے حق میں کر کے ایک دیرینہ حق طلبی کا اطمینان کر دیا تھا۔ اس کے لیے دیوانی عدالتوں کا طریق کار چھوڑ کر شرعی طریق شہادت استعمال کیا جائے اور شب و روز یہ کام کر کے ۶ ماہ کے اندر اسے مکمل کر دیا جائے۔

علاقوں کی تنظیم نو

ہمیں صوبائی اور دیگر عصبیتوں نے سخت نقصان پہنچایا ہے۔ اس لیے پاکستان کے سارے علاقے کو جس کی علاقائی تقسیم پہلے انگریزنے کی تھی از سر نو انتظامی یونٹوں کی بنیاد پر تقسیم نو کی جائے۔ ممکن ہو تو متناسب آبادی کو سامنے رکھ کر ڈویژنل سطح پر تقسیم کی جائے۔ جسے ولایت یا علاقہ یا پرگنہ کہا جائے۔ ان کے نام ان کے ہیڈ کوارٹرز کی بنیاد پر یا نظریاتی بنیاد پر رکھے جا سکتے ہیں۔ یہ مسئلہ اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارش کے ذریعے حل کیا جا سکتا ہے۔

تحریکِ نظامِ مصطفےٰ کے مجاہدین۔

۱۔ تحریک نظام مصطفےٰ ہماری قوم کا ایک قیمتی اور ایمان پرور اثاثہ ہے۔ اس میں قیدیوں زخمیوں، اعضا بریدہ افراد، اپاہجوں اور شہید ہونے والوں کے معاوضے شریعت کے مطابق ادا کئے جائیں اور اس کے لیے قوم کے مخیر حضرات سے اپیلِ عام کی جائے تاکہ معذور ہونے والے ان مجاہدین اسلام اور ان کے خاندانوں کو سہارا دیا جا سکے۔ اس کام کے لیے وہ رقم بھی صرف کی جائے جو قوم کے لوٹنے والوں کے اثاثے ضبط کرنے سے حاصل ہو۔

۲۔ مصنفین و مؤرخین کا ایک بورڈ قائم کر کے اس عظیم تحریک انقلاب اسلامی کی تاریخ اور اس کا ریکارڈ محفوظ کر لیا جائے۔ اس لئے کہ یہ ہماری قوم کی وہ قیمتی اخلاقی اور ایمانی متاع ہے جو اسے صدیوں بعد نصیب ہوئی ہے۔

خدا ترسی اور محبت رسولؐ کی بھرپور فضا کا اہتمام۔

تمام ذرائع نشر و اشاعت، اخبارات و جرائد تقاریر و بیانات کے ذریعے پورے معاشرے میں خدا ترسی اور خدا خوفی کے ساتھ ساتھ محبتِ رسول کریمؐ کی ایسی زبردست اور بھرپور فضا پیدا کی جائے کہ ایک ایک دل میں سویا ہوا جذبہ خوفِ خدا جاگ اٹھے۔

اور ایک ایک دل عشق رسولؐ کے جذبے سے معمور ہوجائے۔ اس فضا سے بڑی حکمت اور تدبّر کے ساتھ ایک ایک سینے کو معمور اور ایک ایک دل کو مخمور کیا جائے۔ مادہ پرستی کا طویل اموی دور گزارنے کے باوجود حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے مختصر سے دور میں ہی یہ حال ہوگیا تھا کہ جہاں چند افراد باہم مل بیٹھتے تھے تو مکانوں، دفتروں، کاروباروں اور عورتوں کی بات کرنے کے بجائے خدا اور رسولؐ، تقویٰ، دیانت داری ذکر و اذکار اور خدمتِ خلق کی باتیں کرتے اور ایک دوسرے کو اس کی ترغیب دیتے تھے۔ یہی حقیقی متاعِ انسانیت اور حقیقی دین داری اور قوت ایمانی ہے۔ اگر یہ کیفیت کسی اسلامی مملکت میں پیدا ہو جائے تو اسے گمنامی اور بے سروسامانی سے اٹھ کر صحابہ کرام کی طرح پوری دنیا کی قوموں کی قیادت کے مقام پر پہنچانا کچھ بھی مشکل اور بعید از قیاس نہیں ہے۔

میرے خیال میں نظام مصطفیٰ کے آغاز کی پہلی ششماہی کے لئے یہ اکیس نکاتی ہمہ پہلو پروگرام اس کے خدوخال اجاگر کرنے اور لوگوں کی اس سے خوش آئند امیدیں وابستہ کرنے کے لئے بہت کافی ہے۔ اس ابتدا سے اسلامی نظام کے بارے میں بہت سے لوگوں کی غلط فہمیاں اور خدشات دور ہوجائیں گے اور جب ہر کسی کو اس نظام کے ذریعے مادی اور روحانی طور پر کچھ نہ کچھ حصہ ملے گا تو بہت سے لوگوں کے دلوں کے بند دروازے اس کے لئے کھل جائیں گے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے دور میں صرف تین سال کے اندر اندر غریبوں اور غیر مسلموں میں اسلام کا رُخِ زیبا اس طرح روشن ہوکر سامنے آیا تھا کہ ہر طرف سے غیر مسلم اسلامی نظام کے شیدائی ہوکر مسلمان ہونے لگے تھے۔ جس کے نتیجے میں غیر مسلموں کا ٹیکس (جزیہ) کم ہونے لگا تھا۔ اس پر صوبوں کے حکام نے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کو اپنی اس تشویش سے آگاہ کیا کہ اگر غیر مسلموں کے مسلمان ہونے کی رفتار یہی رہی تو جزیہ کے انتہائی کم ہوجانے سے خزانے اور بجٹ پر بہت برا اثر پڑے گا۔ اس خدشے کے جواب میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے ان لوگوں کو لکھا:

"یاد رکھیے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دین کے معلّم بنا کر بھیجے گئے تھے، محصّل بنا کر نہیں بھیجے گئے تھے۔ اگر غیر مسلموں کے مسلمان ہونے سے سارا خزانہ بھی خالی ہوجائے تو مجھے اس کی پروا نہیں ہے۔

(باقی ۱۲۵ پر)

عروج قادری

الحمدللہ والشکر للہ

بندۂ رحماں، صاحبِ ایماں — اے نہے قسمت میں ہوں مسلماں
الحمدللہ والشکر للہ

جینے کا مقصد تیری عبادت — تیری محبت، تیری اطاعت
الحمدللہ والشکر للہ

تو میرا حاکم، تو میرا مولیٰ — تو میرا مالک، تو میرا آقا
الحمدللہ والشکر للہ

تو نے دکھائی راہِ ہدایت — راہِ نجات و راہِ سعادت
الحمدللہ والشکر للہ

آنکھوں میں تو ہے دل میں بھی تو ہے — حلقۂ طاعت زیبِ گلو ہے
الحمدللہ والشکر للہ

جرم و خطا پر میری ندامت — تیرا کرم ہے بے حد و غایت
الحمدللہ والشکر للہ

شعر و سخن بھی تیرے لیے ہے — میرا یہ فن بھی تیرے لیے ہے
الحمدللہ والشکر للہ

بس یہی میرا جذب و جنوں ہے — ذکر ہی تیرا دل کا سکوں ہے
الحمدللہ والشکر للہ

ڈاکٹر تنزیل الرحمان ایک نامور قانون داں اور اسلامی قانون و فقہ میں ماہر اور ادارہ تحقیقات اسلامی (وفاقی وزارت مذہبی امور حکومت پاکستان، اسلام آباد کے اعزازی مشیر قانون ہیں۔ آپ اسلامی قانون و فقہ پر متعدد اہم کتابوں کے مصنف بھی ہیں۔

اسلام محض ایک ایسے مذہب کا نام نہیں جو اس پر ایمان رکھنے والوں کے لیے بعض شعائر کا یقین کرے بلکہ اس کی تعلیمات کے مطابق انسانی چلن اور نقل و عمل کا ایک مکمل ضابطہ بھی ہے فکری اعتبار سے اس کے اپنے ہی تصورات ہیں۔ یہ کائنات میں انسان کے مقام اور اس کے اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق کا تعین کرتا ہے۔ اور ساتھ ہی حیات انسانی کے تمام پہلوؤں اور سمتوں میں انسانی سرگرمیوں کا ایک وسیع دائرہ بھی مقرر کرتا ہے۔ خواہ یہ سرگرمیاں انفرادی ہوں یا اجتماعی۔ جب کہ اس حیات کا دارومدار تمام تر کتاب الٰہی اور رسول خدا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات پر ہے۔ لہٰذا اسلام کا اپنا ہی ایک نظریہ ہے جو اپنی اساس اور دائرہ کار میں دنیا کے تمام مذاہب سے مختلف ہے اسلامی نظریہ مختصراً مندرجہ ذیل امور پر مشتمل ہے۔

(الف) تمام کائنات پر اللہ تعالیٰ کی حاکمیت۔

(ب) انسان کا اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کا کلّی طور پر تابع اور مطیع ہونا۔

(ج) اس حاکمیت اعلیٰ کے تحت ایک مکمل نظام فکر و عمل۔

(د) آخرت اور یوم جزا پر ایمان۔ اللہ تعالیٰ کا اپنے اطاعت گزار بندوں پر انعام و اکرام اور نافرمانوں کو سزا جو اس کی حاکمیت اعلیٰ کا انکار کرتے ہوتے اس کی مقرر کردہ حدود سے تجاوز کریں۔ اس طرح تمام انسان اپنے اعمال و افعال کے لیے خدائے تعالیٰ کے سامنے جواب دہ قرار پاتے ہیں۔

اسلام محض نمایاں اصولوں ہی کی نشان دہی پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ ایک ایسا نظام اور تربیتی ضابطہ مرتب کرنا لازمی خیال کرتا ہے جن کی بدولت یہ اصول انفرادی واجتماعی یعنی معاشرتی اقتصادی اور سیاسی زندگی میں پوری طرح کارفرما ہوں۔ اسلامی نظریہ قانونی مساوات اور انسان کے لیے سماجی انصاف کا حامی ہے۔ پاکستان ایک اسلامی مملکت کے طور پر وجود میں آیا ہے تاکہ اسلامی نظریے کو عملی جامہ پہنایا جائے۔ چنانچہ پاکستان کے تینوں یعنی ۱۹۵۶ء ۱۹۶۲ء اور ۱۹۷۳ء کے دستور اساسی میں یہ اقرار کیا گیا کہ پاکستان میں اسلامی قانون نافذ کیا جائے گا اور ایسی تدابیر اختیار کی جائیں گی جن سے عوام اپنی زندگیوں کو اسلامی تعلیمات کے سانچے میں ڈھال سکیں۔ لیکن یہ بجیدہ اعلانات اور دستوری یقین دہانیاں کبھی بروئے کار نہ آسکیں۔ اس کے برعکس ۱۹۷۰ء کے عام انتخابات کے بعد جب مشرقی پاکستان کی علیحدگی پر پاکستان پیپلز پارٹی نے اقتدار حاصل کر لیا تو اس نے اپنے منشور کے مطابق سوشلزم کی طرف منہ موڑ لیا۔

۱۹۷۷ء میں الیکشن کی مہم کے دوران انتخاب کنندگان کی خاصی بڑی اکثریت نے ملک میں اسلام کو اپنی تمام جہتوں اور دائروں کے ساتھ نافذ کرنے کا مطالبہ کیا۔ عوام کی اکثریت نے اسلام کے حق میں ووٹ دیا اور متوقع تھے کہ پاکستان قومی اتحاد کے ذریعے اس کو مکمل طور پر نافذ کر دیا جائے گا۔

۵ر جولائی ۱۹۷۷ء کو جب پاک افواج نے مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کو جو اس وقت وزیر اعظم تھے بے دخل کر دیا اور عنان اختیار بحیثیت چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر جنرل محمد ضیاء الحق کے ہاتھ آئی تو انھوں نے ملک میں اسلامی قانون نافذ کرنے کو سب سے زیادہ ترجیح دی۔ اس سلسلے میں چیف مارشل لا

ایڈمنسٹریٹر، موجودہ صدر پاکستان نے جو اقدامات
کیے ہیں وہ حسبِ ذیل ہیں۔

۱۔ صدر نے اپنے اس اعلان پر عمل کرتے
ہوئے کہ عدالتہائے عالیہ ملک کے ان تمام قوانین
کو جو قرآن و سنت کے منافی ہوں، منسوخ کردیں
گی۔ ۲ دسمبر ۱۹۷۸ء کو ایک شریعت بنچ عدالت
ہائے عالیہ کا اعلان کیا۔ ۱۲ ربیع الاول ۱۳۹۹ھ
۱۰ فروری ۱۹۷۹ء سے ہر ہائی کورٹ کا لاہور
پشاور، کراچی اور کوئٹہ میں ایک ایک شریعت
بنچ اور راولپنڈی، اسلام آباد میں سپریم کورٹ
میں ایک اپیلیٹ شریعت بنچ قائم ہو گیا۔ ان
شریعت بنچوں کو اختیار ہوگا کہ وہ ان موجودہ و
آئندہ قوانین کو جو اسلامی احکام کے منافی ہوں
باستثنائے بعض، منسوخ کرکے کالعدم قرار دیں۔

دستوری حکم نمبر۳ مجریہ ۱۹۷۹ء کے تحت
قرار دیا گیا ہے کہ اس کے تحت جو شریعت بنچ
قائم کیے جائیں۔ انہیں مکمل اختیار حاصل ہو کہ
باستثنائے بعض نہ صرف موجودہ اور آئندہ قوانین
کو اسلامی یا غیر اسلامی قرار دیں۔ بلکہ ایک قدم
اور آگے بڑھ کر کسی قانون کے غیر اسلامی ہونے
کی صورت میں فیصلہ صادر کریں کہ یہ کس حد تک
شریعت کے منافی ہے۔ اور اسے کس طرح
بہترین طریقہ پر ایسے تشکیل دیا جا سکتا ہے کہ عملی
طور پر قرآن اور سنت کے متعلقہ احکام کے
مطابق ہو جاتے جسے حکومت معینہ مدت میں
بروئے کار لانے کی پابند ہوگی اور غیر اسلامی
قانون اس مدت کے بعد کالعدم متصور ہوگا۔

۲۔ صدر پاکستان نے ۱۲ ربیع الاول ۱۳۹۹ھ
۱۰ فروری ۱۹۷۹ء کو چار آرڈیننس جاری کیے
جن کی رو سے املاک اور معاشرہ کے اخلاقی
وسماجی نظام سے متعلق بعض جرائم کے سلسلے میں
ضابطۂ تعزیرات پاکستان کی دفعات میں ترمیم کرکے
انہیں قرآن اور سنت کے مطابق بنا دیا گیا
ان آرڈیننسوں کی رو سے اسلامی حدود یعنی
قرآن وسنت کی مقرر کردہ سزا چوری، زنا، زنا
بالجبر، تہمت زنا، اور شراب نوشی سے متعلق مروجہ
قوانین کی جگہ لے لیں گی۔

۳۔ لہٰذا جہاں تک چوری کا تعلق ہے،
قید، جرمانہ یا دونوں پر مشتمل سزا جسے ضابطۂ تعزیرات
پاکستان میں مقرر کیا گیا ہے کی جگہ دایاں ہاتھ
کلائی سے بذریعہ جراح کاٹنے کی سزا مقرر ہوگی۔
ایسے کہ تکلیف کم سے کم اور کاٹنے کا عمل انتہائی

احتیاط سے ہو۔ یہ جرم حد کے اطلاق کا مستوجب ہوگا بشرطیکہ املاک کسی محفوظ جگہ سے کافی مقدار میں چرائی جائے اور اس شخص کی شکایت پر جس کا مال چرایا گیا ہو ملزم کے اعتراف جرم یا عدالت میں کم از کم دو صادق القول اور گناہ کبیرہ سے مبرا اشخاص کی شہادت کی رو سے ارتکاب جرم ثابت ہو اور عدالت کو پوری پوری جانچ اور مناسب جرح کے بعد سرقہ کا پورا پورا یقین ہو لیکن اگر مال مسروقہ مستثنیات میں شامل ہو یا جیسے جنگلی گھاس، مچھلی، پرند، کتا، سور، مسکرات آلات موسیقی، گل سڑ جانے والی خوراک (الا یہ کہ اسے دیر تک محفوظ رکھنے کا بندوبست ہو) یا سارق مال مسروقہ میں حصہ دار ہو۔ بشرطیکہ مال مسروقہ کی قیمت مذکورہ حصے کو وضع کرنے کے بعد مقررہ مقدار یعنی "نصاب" سے کم ہو اس پر حد نافذ ہو سکے۔ یا مال مسروقہ کی مقدار سے متعلق شرط یا گواہوں کی مقررہ تعداد پوری نہ ہو۔ یا نالش کرنے والے کے نالش کرنے سے پہلے سارق مال واپس کر دے۔ ان تمام صورتوں میں عدالت حد قائم نہیں کرے گی۔

قطع ید کی سزا ایسی صورتوں میں عائد نہیں کی جائے گی جب سارق کا مالک سے جدّا اولاد یا میاں بیوی کا رشتہ ہو۔ یا مہمان میزبان کی چوری کرے یا نوکر یا ملازم نے آقا یا ملازم رکھنے والے کے یہاں چوری کی ہو۔ جہاں اسے آنے جانے کی اجازت ہو یا قرض خواہ مقروض کا مال چرائے بشرطیکہ مال مسروقہ کی قیمت واجب الادا رقم وضع کرنے کے بعد نصاب سے کم ہو۔ قطع ید کی سزا اس صورت میں بھی عائد نہیں ہوگی جب مجرم کا بایاں ہاتھ یا بایاں انگوٹھا نہ ہو یا بایاں ہاتھ یا دایاں پاؤں کی کم از کم دو انگلیاں یا ان میں سے کوئی ناکارہ ہو۔

جہاں تک ڈکیتی و رہزنی (حرابہ) کا تعلق ہے، جب کوئی شخص (یا اشخاص) مسلح ہو کر یا بلا اور کسی کی رضامندی کے بغیر کوئی مال ان سے لے/لیں جو اس کے قبضے میں ہو اور جس کے سرقہ پر حد قائم ہو، اس غرض سے طاقت کا مظاہرہ کرے/کریں، اس پر حملہ کرے/کریں، یا بے جا روکے/روکیں، تشدد یا قتل کی دھمکی دے/دیں تو اس/ان پر حد عائد ہوگی۔ یعنی اگر وہ نصاب کے مطابق مال چھینے تو اس کا دایاں ہاتھ کلائی سے اور بایاں پاؤں ٹخنے سے

بذریعہ جراح کاٹ دیا جائے گا۔

اگر کوئی شخص رہزنی میں قتل کا مرتکب ہو تو اسے سزائے موت دی جائے گی جسے مقتول کے ورثا کے معاف کر دینے پر بھی موقوف نہیں کیا جائے گا۔

اگر مجرم نے قتل بھی کیا ہو اور مال بھی نصاب کی حد تک لوٹا ہو تو اسے عدالت کی جانب سے سزائے موت دی جائے گی۔

سنگین خیال کرتا ہے کیوں کہ اس سے سماجی صحت کو گزند پہنچتا ہے اور یہ انسانی معاشرت کے اخلاقی نظام کے منافی ہے جس کا اسلام انسانی حرمت کی خاطر تحفظ چاہتا ہے۔

بنابریں قرآن وسنت کے مطابق زنا سے متعلق قانون کی دفعات کو بدل دیا گیا ہے۔ چنانچہ غیر شادی شدہ مجرم عورت اور مرد دونوں کو سو سو کوڑے لگائے جائیں گے۔ اور شادی شدہ

> غیر شادی شدہ مجرم عورت اور مرد دونوں کو سو سو کوڑے لگائے جائیں گے۔ اور شادی شدہ ہونے کی صورت میں سنگسار کیا جائے گا

ضابطۂ تعزیرات پاکستان کی دفعہ ۴۹۷ کے مطابق جو زنا سے متعلق ہے، مجرم کو اس صورت میں بعض تحفظات حاصل ہیں جب اس کا ارتکاب شوہر کی رضامندی یا چشم پوشی سے ہوا ہو اور قانون کی نظر میں کوئی جرم سرزد نہ ہوا ہو۔ بیوی بھی مروجہ قانون کے تحت اعانت مجرمانہ میں شریک نہیں قرار دی جا سکتی۔ اسلامی قانون اس استثنا کو تسلیم نہیں کرتا۔ یہ زنا کو نہایت

ہونے کی صورت میں سنگسار کیا جائے گا۔ تاہم اسلامی قانون زنا اور بدکاری کے سلسلے میں زبردستی اور جبر کو سزا میں استثنا کے لیے تسلیم کرتا ہے۔ اس طرح حدِ قذف یعنی جھوٹی تہمت لگانے والے کو اسی ۸۰ دروں کی سزا کا اعلان کیا گیا ہے۔ اس سے کسی کی عصمت وعفت کے خلاف غیر ذمہ دارانہ الزام تراشی کی روک تھام ہوگی اور معاشرہ میں صالحیت کو فروغ ہوگا۔

شراب نوشی جس میں الکوحل کو کسی طرح بھی دخل ہو، ضابطہ تعزیرات پاکستان کے تحت قطعاً جرم نہیں لیکن قانون امتناع شراب ۱۹۷۷ء کے تحت شراب نوشی اور شراب فروشی کی پاکستان میں ممانعت ہے اور نئے قانون میں اس کے لیے قید یا جرمانہ یا دونوں سزائیں مقرر کی گئی ہیں۔ مگر اب قانون کی جگہ حد کی سزا ۸۰ کوڑے مقرر کی جائے گی۔ جس پر صحابہ کرام کا حضرت عمرؓ کے زمانے سے اجماع ہے۔ تاہم اتنا واضح کر دینا ضروری ہے کہ عدالت کی سزا پر اس وقت تک کارروائی یا عملدرآمد نہیں ہوگا جب تک ہائی کورٹ اس کی تصدیق نہ کر دے۔

مسلم فقہا کے بموجب جن جرائم کا معاشرہ پر دور رس اثر ہو، ان میں فرد کا حق حقوق اللہ یعنی معاشرہ اور مملکت کے حقوق کے تحت آجاتا ہے۔ اس لیے ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ کس حد تک وہ حدود جو اللہ تعالےٰ نے انسانی معاشرہ کے تحفظ اور بہبودی کے لیے قائم کی ہیں۔ پامال ہوتی ہیں یا اُن سے تجاوز ہوا ہے۔ اسلام میں حد کی سزائیں انسانی معاشرہ کی حرمت کو برقرار رکھنے کے لیے عائد کی جاتی ہیں۔ اسلامی قانون کے مطابق سزائے موت معاشرہ کے خلاف فاسد جرائم کے انسداد کے لیے سالہا سال تک موثر ثابت ہوتی ہے۔

علاوہ بریں یہ بات بالخصوص اہم ہے کہ اسلامی سزاؤں کا مقصد تزکیہ نفس اور کفارۂ آخرت ادا کرنا ہے۔ جو دنیا کے دوسرے نظاموں میں مفقود ہے۔

اقتصادی میدان میں کوششیں کی جا رہی ہیں کہ ایک اسلامی اقتصادی نظام کا قابل عمل ڈھانچہ تیار کیا جائے۔ حکومت سرگرمی سے اسلامی احکام پر مبنی اقتصادی نظام تیار کرنے میں کوشاں ہے جس میں بلا سود بینکاری بھی شامل ہے یہی کیفیت ٹیکسوں کی ہے۔ اس سلسلے میں زکواۃ اور عشر پر بنیادی کام پایۂ تکمیل کو پہنچ چکا ہے۔ اور صدر پاکستان نے موجودہ اقتصادی نظام میں تبدیلی کے ابتدائی اقدام کے طور پر زکواۃ اور عشر کے اجرا کا آرڈیننس جاری کر دیا ہے جو دولت ٹیکس اور محاصل اراضی سے متعلق مروجہ قانون کی جگہ لے لیگا۔ چنانچہ یکم جولائی ۱۹۷۹ء سے ڈھائی فیصد کے حساب سے سالانہ بچت پر زکواۃ وصول کی جائے گی۔ اسی طرح آئندہ فصل خریف یعنی اکتوبر ۱۹۷۹ء سے

نہری، چاہی اور بارانی زمین کی پیداوار کا پانچ فیصد بطور عشر حکومت وصول کرے گی اور بارانی زمین کی پیداوار کا مزید پانچ فیصد حصہ مالکان خود خیرات کریں گے۔ عشر و زکوٰۃ کا قانون ابھی بطور مسودہ شائع ہوا ہے۔ اور عوام سے اس سلسلے میں تجاویز طلب کی گئی ہیں

انکم ٹیکس کے قانون کو سر دست ختم نہیں کیا گیا ہے لیکن یہ صراحت کر دی گئی ہے کہ جو رقم زکوٰۃ کے طور پر دی جائے گی وہ کم از کم ٹیکس سے مستثنیٰ ہوگی۔

باور کیا جاتا ہے کہ معاشرہ کے غریب اور حاجت مند طبقوں کے لیے یہ انقلابی اقدام ہوگا۔

صدر پاکستان نے قائد اعظم یونیورسٹی اسلام آباد میں شعبہ شریعت کے قیام کا اعلان بھی کیا ہے۔ جہاں منتخب پاکستانی و بیرونی طلبہ کو قرآن مجید تفسیر، حدیث اور فقہ کی تعلیم کے لیے خصوصی انتظامات کیے جائیں گے۔ اور عربی زبان پر بہت زور دیا جائیگا یہ تعلیم پوسٹ گریجویٹ سطح پر دی جائیگی۔

جناب صدر نے چیف جسٹس پاکستان کی زیر صدارت چاروں عدالت ہائے عالیہ

اسلام میں حد کی سزائیں انسانی معاشرے کی صحت کو برقرار رکھنے کیلئے عائد کی جاتی ہیں

کے چیف جسٹس اور اٹارنی جنرل پاکستان پر مشتمل ایک مستقل قانونی کمیشن بھی قائم کیا ہے تاکہ پاکستانی شہریوں کے لیے جلد عادلانہ انصاف کرنے کے لائحہ عمل کو سہل بنانے کے طریقے اور ذرائع تجویز کیے جائیں۔

واضح رہے کہ ان دیوانی مقدمات پر کورٹ فیس پہلے ہی منسوخ کی جا چکی ہے جن کی مالیت ۲۵ ہزار روپے سے زائد نہ ہو۔

ان تمام اقدامات سے بجا طور پر یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ جو اقدامات کیے جا چکے ہیں یا آئندہ کیے جانے والے ہیں، وہ پاکستان میں برطانوی کامن لا انتظام قانون سے اسلامی قانون اور فقہ کی طرف رجوع کے آئینہ دار ہیں ۔ یہ اقدامات جزوی ہونے کے باوجود یقیناً ملک میں اسلامی قانون کے نفاذ میں بڑی حد تک معاون ہوں گے۔

صدر پاکستان جنرل ضیاء الحق نے ۱۲ ربیع الاوّل ۱۳۹۹ھ کو یوم میلاد النبی کی ایک سرکاری تقریب میں بعض اسلامی قوانین نافذ کرنے کا اعلان کیا۔ اس اعلان کا پورے پاکستان میں خیر مقدم کیا گیا۔ یہ اعلان نظام مصطفیٰ کے نفاذ کے سلسلے کی تمہید ہے۔ یہ اعلان ان ان گنت نعتوں اور مدحیہ تقریروں سے بہتر ہے جو سارے پاکستان میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں پڑھی اور کی گئی ہیں۔

اس اعلان سے ساری دُنیا کے مسلمانوں کو خوشی ہوتی۔ کیوں کہ مسلمان کیسا ہی ہو، کہیں بھی ہو، اسلام کا عاشق ہے۔ اُسے اسلام کے نام سے محبت اور اُس کے لانے والے سے والہانہ پیار ہے۔ مگر اکثر حالات میں یہ پیار اندھا پیار ہے۔ مسلمانوں کی اکثریت نہیں جانتی کہ اسلام زندگی کا کیا نقشہ پیش کرتا ہے۔ اور نظام مصطفیٰ دراصل کیا ہوگا۔

اس لیے سب سے پہلے پاکستان اور اس کے بعد عالم اسلام اور سب کے بعد ساری دُنیا کو اس نظام کے خدوخال سے متعارف کرانا ضروری ہے جس کی تمہید صدر پاکستان کے اعلان سے ہوتی ہے۔ ورنہ اب تک کے ردّعمل کو دیکھ کر یہ خیال کرنا بے جا نہ ہوگا کہ جو ذہن اسلامی زندگی سے متعارف نہیں ہیں۔ وہ اسلام کو تعزیرات کا دین سمجھنے لگیں گے۔ مغربی پروپیگنڈے کے اثر سے اب تک کچھ ایسا ہی دیکھنے میں آیا ہے کہ جہاں نظام اسلام کا ذکر آیا لوگوں کی بھنویں تن گئیں۔ اور لوگوں نے اسلامی

خونریزی نظام پر گرفت شروع کی اور اس طرح کا تصور دینا شروع کیا کہ ادھر اسلامی نظام آیا ادھر لوگوں کے ہاتھ کٹنے ہوں گے جگہ جگہ ٹکٹکیاں لگ جائیں گی جہاں لوگ کو سنگسار کیا جاتے گا۔ پھر چوراہے پر جلاد متعین ہوں گے جو لوگوں کے کوڑے مار مار کر ادھ مرا کیے دے رہے ہوں گے۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے لوگوں سے یہ بدگمانی دور کرنے کی ضرورت ہے کہ اسلام کچھ عقائد اور عبادت کے کچھ طریقوں پر عمل کرنے کا ہی نام نہیں ہے بلکہ اس نظام کے قیام کا نام بھی ہے جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے عملاً قائم کیا تھا اور جس کی نہج پر خلافت راشدہ چلی اور اس کے قیام کے لیے اسی طرح جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ جس طرح آج انسانی حقوق کی بحالی اور استعماری پھرے آزادی کے لیے افریقہ اور مشرق بعید میں کشمکش جاری ہے۔

حال ہی میں ایران میں شاہی کے خاتمے اور اسلامی جمہوریت کی بنا ڈالنے کے لیے جو خونی آویزش ہوتی ہے وہ جدوجہد آزادی کی ہی ایک مثال نہیں بلکہ نظام اسلامی کے برپا کرنے کی ایک کوشش بھی ہے۔ یہ اقامت دین کی ایک سعی ہے۔ قرآن میں اس کا حکم ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اس جدوجہد کی تاریخ ہے جو بالآخر مدینے کی اسلامی ریاست کے قیام پر منتج ہوئی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اسلامی نظام حیات کے مکمل قیام کی کوششوں اور حال کی پاکستانی کوشش میں ذرا سا فرق ہے۔ حضورؐ نے لوگوں کی آخرت سنوارنے کے لیے اسلام کے اجتماعی زندگی کے نقشہ کو ذریعہ قرار دے کر ایک جماعت بنائی۔ اس جماعت نے اقامت دین کو اپنا مقصد زندگی بنایا۔ اس کے لیے قربانیاں دیں، مصائب سہے۔ وطن سے بے وطن ہوتے۔ جنگ و جدل کی اور بالآخر اس تصور کو قائم و غالب کرنے میں کامیاب ہوتے جسے حکومتِ الٰہیہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے جسکو قائم کرنے کے بعد انسان اللہ کی بندگی کے تقاضوں کو پورا کر کے عذابِ جہنم سے بچ سکتا ہے۔

لیکن پاکستان میں ایسا نہیں ہوا۔ وہاں ایک اُمت موجود ہے جسے اسلام سے پیار ہے مگر اس میں سے ایک حصّہ ایسا ہے جو دین کو ایک نیکی و عبادت کا ترتیبی نظام سمجھتا ہے۔ اسی میں ایک حصّہ وہ ہے جو حکومتِ الٰہیہ کے قیام کے لیے

> پاکستان کی تاریخ پر نظر رکھنے والے جانتے ہیں کہ اس کے قیام کی تحریک اسی لیے ہوئی تھی کہ اس خطۂ زمین کے مسلمانوں کو ایک ایسا ملک میسر آجائے جہاں وہ نظام مصطفیٰ قائم کر سکیں۔"

کوشاں رہا ہے۔

پاکستان کی تاریخ پر نظر رکھنے والے جانتے ہیں کہ اس کے قیام کی تحریک اسی لیے ہوئی تھی کہ اس خطۂ زمین کے مسلمانوں کو ایک ایسا ملک میسر آجائے جہاں وہ نظامِ مصطفیٰ قائم کر سکیں۔ اور اپنے دین پر عمل کرنے کے لیے پوری طرح آزاد ہوں۔ پاکستانی لوگ علامہ اقبال کو "مصورِ پاکستان" سمجھتے ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ علامہ اقبال نہ صرف محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے عاشق تھے بلکہ وہ اس بات کے بھی آرزومند تھے کہ نظامِ مصطفیٰ عملاً نافذ ہو۔ ان کی تمنا تھی کہ وہ اپنی آنکھوں سے اس نظام کے قیام کا مشاہدہ کر سکیں۔ کہتے ہیں ؎

نغمۂ نوبہار اگر میرے نصیب میں نہیں
اس دمِ نیم سوز کو طائرکِ بہار کر

گویا وہ چاہتے تھے کہ اگر یہ منظر میں اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ سکوں تو پھر اللہ مجھے طائرِ بہار ہی بنا دے۔ میں اس نظام کا نقیب ہی بن جاؤں اس نقطۂ نظر سے خوش نصیب ہیں وہ لوگ جنھوں نے اس نظام کے قیام کے لیے جدوجہد کی اور اس کے قیام کے ابتدائی اقدامات کو دیکھ لیا۔ حکومت الٰہیہ کا قیام اگرچہ نظریۂ پاکستان میں مضمر تھا ہی مگر جنرل ضیاء الحق اس معنیٰ کر مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے جرأت کر کے مسلمانوں کے مزاج کے موافق یہ اعلان کر دیا۔ ورنہ قیام پاکستان کے فوراً بعد ہی اسلامی دستور کے مطالبے شروع ہو گئے تھے۔ اسلامی دستور کا مطالبہ کرنے والوں میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی تھے اور قرار دادِ مقاصد کو مرتب کرنے والے مولانا شبیر احمد عثمانی مرحوم تھے ان دونوں بزرگوں میں اوّل الذکر کی خوش نصیبی ہے کہ انھوں نے نظام مصطفیٰ کے قیام کی تمہید کے طور پر جنرل ضیاء کے اس اعلان کو خود سن لیا اور پاکستان

کی خوش قسمتی ہے کہ اپنے جس مقصدِ وجود سے وہ
۳۲ سال سے محروم رہا۔ اب اللہ کے کرم سے
اس راہ پر چل پڑا ہے۔

بادی النظر میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ نظامِ
مصطفیٰ کی سمت میں یہ قدم اوپر سے اٹھایا گیا ہے
اور اسلامی دستور کے یہ دفعات اوپر سے عوام
پر تھوپے گئے ہیں۔ بعض خبروں اور اخباری تبصروں
سے بھی یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ ماہرین سیاست
اس تجربے کی کامیابی کے بارے میں اسی لیے
شبہ میں پڑے ہیں کہ یہ مارشل لا کے چیف ایڈمنسٹریٹر
کی طرف سے نافذ کیا گیا ہے۔ مگر یہ اعتراض اس
لیے وزنی نہیں ہے کہ قرآن میں بعض ایسے انبیاء کا
ذکر ہے جنھوں نے اقامتِ دین کے لیے اقتدار
کا سہارا لیا اور طاقت کے ذریعے دین قائم کیا
گو ان انبیاء کا تعلق بنی اسرائیل سے ہے۔ مگر وہ
سب کے سب قیامِ دین کے لیے ہی کام کر رہے
تھے۔ ان نبیوں میں حضرت داؤدؑ، سلیمانؑ،
یوسفؑ اور طالوتؑ کا ذکر ہے۔ ان سب
کو اقتدار حاصل تھا یا انھوں نے اقتدار حاصل
کر لیا تھا۔ انھوں نے اپنے اس اقتدار کو اپنے
دینی نظریے کے نفاذ کے لیے اسی طرح استعمال
کیا جس طرح آج برطانیہ اور امریکہ میں جمہوریت
اور چین و روس میں سوشلزم کے قیام کے لیے
استعمال ہوتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ جس طرح سوشلزم میں جبر و
اکراہ کا پہلو ہے کیا اسی طرح اللہ کے دین کے
نظام میں بھی جبر و اکراہ کا یہ ناگوار پہلو موجود ہے؟ جب
یہ سوال اٹھتا ہے تو یہ دیکھنا لازم ہو جاتا ہے کہ
وہ حکومت جسے ہم اسلامی حکومت کہتے ہیں
یا وہ نظام جسے نظامِ مصطفیٰ کا نام دیتے ہیں کس نوعیت
کا نظام ہوگا۔

اس سلسلے میں ایک اصولی بات جو سامنے
آتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ نظام مجرد ایک اصولی
حکومت (Ideological State) ہے
لوگ خاندانی حکومت کے تصور سے آشنا ہیں
نسلی اور قومی حکومتوں کو بھی سمجھتے ہیں۔ مگر اصولی
حکومت کی بات لوگوں کو ہمیشہ ناقابلِ عمل ہی محسوس
ہوتی رہی ہے۔

انقلابِ فرانس اور جمہوری کشمکش کی
مثالیں سامنے رکھئے تو اصولی حکومت کی ایک
دھندلی سی شکل سامنے آتی ہے۔ مگر تاریخ بتاتی
ہے کہ اصولی حکومت کے یہ دھندلے سے نقوش

بھی قومیت کی تنگنائے میں کھو گئے۔ کمیونزم نے اصولی حکومت کے داعی ہونے کا بڑا شور مچایا۔ لیکن شروع میں وہ ایک طبقاتی نظام بنا اور بالآخر وہ بھی نیشنلزم کے بھنور میں پھنس گیا۔

اس لیے یہ بات بلاخوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ اسلامی دعوت ہی وہ واحد اصولی دعوت ہے جو قومیت، نسل، طبقاتی کشمکش اور خاندانی برتری کے تصور سے بالکل ناآشنا ہے اور ان خرابیوں کے شائبوں سے پاک ہے جو قومی اور نسلی حکومتوں میں پائے جاتے ہیں، مگر عملاً ہو یہ رہا ہے کہ خود مسلمان حکومتوں کے سربراہ اس اسلامی تصور سے ناآشنا سے معلوم ہوتے ہیں اور مغرب کے ذہنی استعمار میں مبتلا ہونے کے سبب قوم پرستانہ طرز فکر سے آگے نہیں بڑھ پاتے۔ پاکستان کے قیام کے بعد بھی یہی بات سامنے آئی۔ پاکستان کے قیام کے بعد پاکستانی مسلمان ایک قوم بن گئے۔ اور سیاسی اقتدار کو اسلامی نصب العین کے قیام کے لیے استعمال کرنے کے بجائے قومی مقاصد کے لیے استعمال کرنے لگے۔ وہاں انھوں نے خدا کی حاکمیت قائم کرنے کے بجائے سلطانی جمہور کا صور پھونکا۔

> اس لیے یہ بات بلاخوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ اسلامی دعوت ہی وہ واحد اصولی دعوت ہے جو قومیت، نسل طبقاتی کشمکش اور خاندانی برتری کے تصور سے بالکل ناآشنا ہے۔

اور مسئلے کو قومی نظریے (National Perspective) میں دیکھا۔ حالانکہ اسلامی ریاست کی خصوصیت ہی یہ ہے کہ وہ خدا کی حاکمیت کے تصور سے ابھرتی ہے۔ اس کا بنیادی نظریہ ہی یہ ہے کہ ملک خدا کا ہے۔ حکم دینے اور قانون بنانے کا حق اس کے علاوہ کسی کو نہیں ہے اور نظام اسلام قائم کرنے کے لیے اس کے علاوہ کوئی صورت نہیں کہ حاکم قانون الٰہی کا محافظ (Guardian) بن کر حکومت کرے یہی اس کی حیثیت ہے۔ قرآن اسے خدا کے خلیفہ کا منصب ہی دیتا ہے۔

اس بنیاد پر جو عمارت اٹھے گی وہ دنیوی حکومتوں سے مختلف ہوگی۔ وہاں سیاسی اقتدار جوڑ توڑ کرنے والے سیاست دانوں کو نہیں بلکہ اقامتِ دین کے لیے کام کرنے والے دین دار لوگوں کو سونپا جاتے گا۔ اور یہ سربراہ دولت و اقتدار کے مریض نہ ہوں گے بلکہ ان کی اس خدمت کا مقصود صرف رضائے الٰہی ہوگا۔ وہ خود صاحبِ اخلاق ہوں گے اور اسلامی اخلاق کے نفاذ کے لیے کوشاں رہیں گے اور لگ بھگ ایسا معاشرہ وجود میں لانے کی کوشش کریں گے جیسا کہ حضورؐ کی رہنمائی میں قائم ہوا تھا۔ اس نظام میں لوگوں نے نہ اپنی غرض کے لیے کام کیا نہ خاندانی یا قومی تفوق کے لیے جد و جہد کی بلکہ انھوں نے انسان کی فلاح کے لیے کام کیا۔

بعد کے لوگوں نے اُسے ایک جمہوری نظام کا نام دیا۔ یہ غالباً اس لیے ہوا کہ بعد کے لوگ اپنے نظریات میں دنیا میں رائج مسلکوں کے اصولوں کی جھلک دکھانا مفید سمجھتے تھے۔ اسی ذہنیت کا نتیجہ تھا کہ جب دُنیا میں کیمونزم کا زور شور سے چرچا ہوا تو مسلمانوں میں سے بعض اچھے خاصے علماء نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ اشتراکیت اسلام ہی کا ایک جز ہے اس کے بعد جب آمریت اور تاناشاہی کا دور آیا تو بعض اہلِ علم نے "اطاعتِ امیر" کا نعرہ دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام سیاسی نظریہ ایک معمّہ بن گیا۔ حالانکہ اسلام انسان پر انسان کی خدائی ختم کر کے حاکمیتِ الٰہ کے تصور پر ایک اجتماعی نظم قائم کرنا چاہتا رہا ہے۔

وَمَا اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ
مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ حُنَفَاءَ (البیّنہ)

لوگوں کو کوئی حکم نہیں دیا گیا۔ بجز اس کے اللہ کی بندگی کریں اپنے دین کو اسی کے لیے خالص کر کے یکسو ہو کر۔

تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ
اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ
بِهٖ شَيْئًا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا
اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (آل عمران)

آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے یہ کہ اللہ کے سوا ہم کسی کی بندگی نہ کریں اور خدائی میں کسی کو اس کا شریک نہ قرار دیں۔ اور ہم

میں سے کوئی کسی کو خدا کے سوا اپنا رب نہ بنائے ۔

انبیاء علیہم السلام نے جس نظام کی دعوت دی اس کا مرکز و محور یہی عقیدہ تھا اور یہی عقیدہ اسلامی سیاست کا بنیادی نظریہ ہے۔

ان الحکم الا للہ أمر ان لا تعبدوا الا ایاہ ذلک الدین القیم

(سورۃ یوسف)

حکم اور حکومت سوائے اللہ کے کسی اور کی نہیں ۔ اس کا حکم ہے

حکم اور حکومت سوائے اللہ کے کسی اور کی نہیں اس کا حکم ہے کہ اس کے سوا کسی اور کی بندگی نہ کرو۔ یہی صحیح دین ہے

کہ اس کے سوا کسی اور کی بندگی نہ کرو۔ یہی صحیح دین ہے۔

ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الکافرون (مائدہ)

جو خدا کی نازل کردہ (شریعت) کے مطابق فیصلہ نہ کریں دراصل وہی کافر ہیں۔

گویا اسلام کے نزدیک حاکمیت (صرف اللہ کے لیے مخصوص ہے ۔

وہی قانون ساز ہے اور مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ باری تعالیٰ کی ہدایت پر عمل کریں اور کرائیں اسے جمہوریت تو کسی لقطۂ نظر سے بھی نہیں کہا جا سکتا۔ مولانا مودودی نے اسے الٰہی جمہوری حکومت (Theo Democracy) کا نام دیا ہے۔ اس طرز حکومت میں عاملہ اور مقننہ سب ان لوگوں کی رائے سے بنتی ہے جو اللہ کی حاکمیت پر یقین رکھتے ہوں۔ اس عاملہ یا مقننہ کسی کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ خدا اور اس کے رسول کے قانون میں کوئی ترمیم کریں۔ بلکہ اس نظام کو چلانے والے لوگوں کا کام یہ ہے کہ وہ اس سیاست کو اللہ کے مقرر کیے ہوئے مقصد کے لیے اس طریقے پر حکومت چلائیں گے جس کے اساسی خدوخال قرآن حکیم میں موجود ہیں۔

پاکستانی صدر کی تقریر سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ وہ نظام مصطفیٰ کے نفاذ میں اسی بات کو پیش نظر رکھیں گے۔ اس رسالے میں اُن کی ۱۲ ربیع الاول کی تقریر کا پورا متن شامل ہے۔ اس میں یہ الفاظ قابلِ غور ہیں۔

"یہ ہماری بد قسمتی ہے کہ ہم نے اپنی نئی نسل کو اس نظریے سے روشناس نہ کرایا جو قیام پاکستان کی بنیاد بنا تھا۔ ہماری درسی کتابوں اور نصاب میں ایسا مواد شامل کر دیا گیا تھا جو ہمیں اپنے محور سے دور لے گیا تھا۔ لہٰذا نئی نسل کو اپنے فکری محور پر رکھنے کے لیے نئی پالیسی وضع کرنی ہوگی جس کا بنیادی مقصد نظریۂ پاکستان اور نظریۂ اسلام سے وابستہ نسل تیار کرنا ہے اس مقصد کے حصول کے سلسلے کی پہلی کڑی درسی کتابوں میں ترمیم ہے جو تیار کی جا چکی ہے۔"

اس تقریر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے پاکستان کے عوام کی ذہنی تربیت کے لیے تعلیمی ڈھانچہ بدلا ہے۔ بعض کبائر پر روک لگائی ہے۔ بینکاری کی اصلاح کی ہے اور ابتداءً سرکار کے طور پر نماز اور زکوٰۃ کے نظام کو قائم

"...... پاکستان میں قرآن کریم کے سیاسی اصول کی بنیادوں پر اسلام کی حکومت عادلہ قائم ہوگی، جس میں تمام اقلیتوں کے ساتھ منصفانہ بلکہ فیاضانہ سلوک کیا جائے گا...... یہ اعلیٰ اور پاک نصب العین ممکن ہے بتدریج حاصل ہو تاہم ہر دوسرا قدم خود اُٹھ جائے گا۔ انشاء اللہ پہلے قدم سے زیادہ مسلم قوم کو اس محبوب نصب العین سے قریب تر لا دے گا۔"

مولانا شبیر احمد عثمانی

کرنے کا عزم کیا ہے۔ اس کے بعد بتدریج وہ پورے نظام کو قائم کرنے کی کوشش کریں گے۔ اور یہ مناسب ہی ہے۔

ہماری دعا ہے کہ وہ انہیں اس نظام کے قیام کے لیے سہولتیں مہیا کرے اور پاکستانی عوام کا بھرپور تعاون انہیں حاصل رہے۔

کوثر ندوی

مصطفیٰ نورِ ھدیٰ

مصطفیٰ نورِ ہدیٰ ، نورِ خدا
رحمتِ عالم، حبیبِ کبریا

مصطفیٰ کی ذات رُوحِ کائنات
ہر اُدا ہے حاملِ صد معجزات

ماورائے فہم ہے ذاتِ کریم
شکلِ انسانی میں قرآنِ حکیم

شرحِ قرآں، سیرتِ خیرُ الوریٰ
ہادیٔ اعظم محمّد مصطفیٰ

نورِ حق، نورِ ھدیٰ ، نورِ مُبیں
سیّدِ کونین خَتمُ المرسلینؐ

ذاتِ اقدسؐ ہے سراپا معجزات
معجزہ سے قوم کے اندر ثبات

آپؐ نے اس قوم کی تشکیل کی
رُوح جس میں قوّتِ جبریلؑ کی

آپ کا پیغام اَللّٰہُ الصَّمَد
رُوح اس کی قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَد

لَآ اِلٰہ اس کا حرفِ ابتدا
اور اِلَّا اللّٰہ حرفِ انتہا

سیرتِ اقدس ہے آئینِ حیات
اس سے بنتے اور نکھرتے ہیں صفات

سیرتِ اقدس کا ہے جس پر اثر
وہ ہے یکتا اور معیاری بشر

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

اسلام دنیا میں جو اصلاح چاہتا ہے وہ صرف وعظ و تذکیر سے نہیں ہو سکتی بلکہ اُس کو عمل میں لانے کے لیے سیاسی طاقت درکار ہے۔ چنانچہ قرآن میں ایک دعا ہے کہ :۔

وَقُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّاجْعَلْ لِّیْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِیْرًا

" اور دعا کرو کہ پروردگار مجھ کو جہاں بھی تو لے جا سچائی کے ساتھ لے جا اور جہاں سے بھی نکال سچائی کے ساتھ نکال اور اپنی طرف سے ایک اقتدار کو میرا مددگار بنا دے۔"

اس دعا کی معنویت پر غور کیجئے اس دعا کو اللہ تعالیٰ نے خود اپنے نبی کو سکھایا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اقامت دین اور نفاذ شریعت کے لیے اقتدار چاہنا اور اس کے حصول کی کوشش کرنا نہ صرف جائز بلکہ پسندیدہ ہے۔ یہ دنیا پرستی نہیں بلکہ خدا پرستی کا عین تقاضا ہے۔

اسلام کا تصورِ حاکمیت و خلافت بہت صاف اور واضح ہے۔ اللہ اس دنیا کا خالق اور حاکم ہے اور انسان کی حیثیت اُس کے خلیفہ اور نمائندے کی ہے۔ انسانی سماج میں قائم ہونے والے ہر سیاسی نظام کو اللہ کے قانون کا تابع ہونا چاہیے

جو مقتدر اعلیٰ ہے۔ اسلامی حکومت کے سربراہ یعنی خلیفہ کا کام یہ ہے کہ اللہ کے قانون کو اُس کے اصل منشار کے مطابق نافذ کر دے اور سیاسی نظام کو اس کی ہدایت کے مطابق چلائے۔

توحید اور حاکیت الٰہی پر قرآن کی تقریروں میں سے ایک وہ ہے جو حضرت یوسف نے اپنے جیل کے ساتھیوں کے سامنے کی۔ آپ نے فرمایا:

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ

"فرمانروائی کا اقتدار اللہ کے سوا کسی کے لیے نہیں ہے۔ اس کے سوا تم کسی کی بندگی نہ کرو۔ یہی ٹھیٹھ سیدھا طریقہ زندگی ہے مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔"

سورہ فرقان میں بات کو اور زیادہ صاف کر کے فرمایا گیا ہے۔ ارشادِ باری ہے:۔

اَلَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِيْرًا

"وہ جو زمین و آسمان کی بادشاہی کا مالک ہے، جس نے کسی کو بیٹا نہیں بنایا ہے جس کے ساتھ بادشاہی میں کوئی شریک نہیں ہے۔ جس نے ہر چیز کو پیدا کیا اور پھر اس کی ایک تقدیر مقرر کی۔"

یہاں لفظ ملک استعمال ہوا ہے جو عربی زبان میں بادشاہی، اقتدار اعلیٰ اور حاکمیت (Sovereignty) کے لیے بولا جاتا ہے مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی ساری کائنات کا مختارِ مطلق ہے اور فرمانروائی کے اختیارات میں ذرہ برابر بھی کسی کا کوئی حصہ نہیں ہے۔

اسی طرح سورہ آل عمران میں ہے کہ:۔

وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَلِاُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ حُرِّمَ عَلَيْكُمْ وَجِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ۝ اِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ (آیت: ۵۰، ۵۱)

"اور میں اُس تعلیم و ہدایت کی تصدیق

کرنے والا بن کر آیا ہوں جو توراۃ میں سے اس وقت میرے زمانے میں موجود ہے اور اس لیے آیا ہوں کہ تمہارے لیے بعض اُن چیزوں کو حلال کر دوں جو تم پر حرام کر دی گئی تھیں اور میں تمہارے لیے تمہارے رب کی طرف سے نشانی لے کر آیا ہوں، لہٰذا اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو اللہ میرا رب بھی ہے اور تمہارا رب بھی۔ لہٰذا تم اُسی کی بندگی کرو۔ یہی سیدھا راستہ ہے۔"

اس سے معلوم ہوا کہ تمام انبیاء علیہم السّلام کی دعوت کے بنیادی نکات یہی تین تھے:

۔ ایک یہ کہ اقتدار اعلیٰ جس کے مقابلے میں بندگی کا رویہ اختیار کیا جاتا ہے اور جس کی اطاعت پر اخلاق و تمدّن کا پورا نظام قائم ہوتا ہے صرف اللہ کے لیے مخصوص ہے۔

۔ دوسرے یہ کہ اس مقتدر اعلیٰ کے نمائندے کی حیثیت سے نبی کے حکم کی اطاعت کی جائے۔

تیسرے یہ کہ انسانی زندگی کو حلت اور حرمت اور جواز و عدم جواز کی پابندیوں سے جکڑنے والا والا قانون و ضابطہ صرف اللہ کا ہو اور دوسروں کے عائد کردہ قوانین منسوخ کر دیئے جائیں۔

چنانچہ سورہ مائدہ میں ارشاد ہوتا ہے کہ:

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ
.... هُمُ الظّٰلِمُوْنَ
..... هُمُ الْفٰسِقُوْنَ

"اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی کافر ہیں.... وہی ظالم ہیں..... وہی فاسق ہیں۔"

اس اصول کے مطابق حاکمیت میں انسان کا سرے سے کوئی حصہ ہی نہیں ہو سکتا۔ اسی بنا پر قرآن انسان کو زمین پر خدا کا خلیفہ اور نائب قرار دیتا ہے اور اُس کا اصل مشن یہ بتاتا ہے کہ وہ دنیا میں اپنے مالک کے حکم کے مطابق کام کرے۔ اگر وہ خود کو مالک سمجھ بیٹھے اور اللہ کے دیئے ہوئے اختیارات کو مَن مانے طریقے پر استعمال کرنے لگے یا اصل مالک کے علاوہ کسی اور کو مالک تسلیم کرکے

> وہ جو زمین و آسمان کی بادشاہی کا مالک ہے جس نے کسی کو بیٹا نہیں بنایا ہے جس کے ساتھ بادشاہی میں کوئی شریک نہیں ہے جس نے ہر چیز کو پیدا کیا، پھر اس کی ایک تقدیر مقرر کی۔

اُس کے منشاء کی پیروی اور اُس کے احکام کی تعمیل کرنے لگے تو یہ سب غدّاری اور بغاوت کے افعال ہوں گے۔

حاکمیت اور خلافت کے اس تصوّر کا فطری اور منطقی تقاضا یہ ہے کہ اطاعت اور وفاداری کا مرجع بھی خالق اور اُس کی ہدایات ہوں اور ریاست میں باقی تمام وفاداریاں اسی بنیادی وفاداری کی تابع ہوں۔ اسی اصول کی وضاحت قرآن ان الفاظ میں فرماتا ہے :۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ ۖ فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ۚ ذَٰلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا ۔ (النساء: ۵۹)

" اے ایمان لانے والو! اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور اُن لوگوں کی جو تم میں سے صاحبِ امر ہوں۔ پھر اگر تمہارے درمیان کسی معاملے میں نزاع ہو جائے تو اُسے اللہ اور رسول کی طرف پھیر دو، اگر تم واقعی اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہو، یہی ایک صحیح طریق کار ہے اور انجام کے لحاظ سے بھی بہتر ہے۔"

یہ آیت اسلام کے پورے مذہبی، تمدّنی اور سیاسی نظام کی بنیاد اور اسلامی ریاست کے دستور کی اوّلین دفعہ ہے۔ اس میں حسبِ ذیل اصول مستقل طور پر قائم کر دیئے گئے ہیں۔

۱۔ اسلامی نظام میں اصل مطاع اللہ تعالیٰ ہے۔ مسلمان کی انفرادی زندگی اور مسلمانوں کے اجتماعی نظام دونوں کا محور خدا کی فرماں برداری اور وفاداری پر ہے۔ دوسری اطاعتیں اور وفاداریاں صرف اُس صورت میں قبول کی جائیں گی جب وہ خدا کی اطاعت اور وفاداری کے مدمقابل نہ ہوں بلکہ اُس کے تحت اور اُس کی تابع ہوں۔

۲۔ اسلامی نظام کی دوسری بنیاد رسولؐ کی اطاعت ہے۔ یہ کوئی مستقل بالذات اطاعت نہیں ہے بلکہ خدا کی اطاعت کی واحد عملی صورت ہے کیونکہ رسول ہی وہ مستند ذریعہ ہے جس سے ہم تک خدا کے احکام اور فرامین پہنچتے ہیں۔

۴۔ ان دونوں اطاعتوں کے بعد اور ان کے ماتحت تیسری اطاعت جو اسلامی نظام میں مسلمانوں پر واجب ہے وہ اُن اولی الامر کی اطاعت ہے جو خود مسلمانوں میں سے ہوں، خواہ وہ علماء ہوں یا سیاسی رہنما، حکام ہوں یا جج۔ قبیلوں کے سردار ہوں یا بستیوں کے پنچ — شرط یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کے گروہ میں سے ہوں اور خدا اور رسول کے مطیع ہوں۔ خدا (Final Authority) کی حیثیت رکھتا ہے۔ خود مسلمانوں میں یا حکومت اور رعایا کے درمیان جس مسئلے پر بھی نزاع واقع ہوگی اس میں فیصلے کے لیے قرآن و سنت سے رجوع کیا جائے گا۔ البتہ جن معاملات کے احکام وہاں موجود نہ ہوں اُن کے بارے میں لوگوں کو عمل کی آزادی ہے۔

۵۔ اسی آیت کی رُو سے مسلمان اپنے

اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی کافر ہیں

اور رسول کی نافرمانی میں کوئی اطاعت نہیں ہے جیسا کہ رسول اللہ نے فرمایا ہے کہ :—

لا طاعة في معصية إنما الطاعة في المعروف

"خدا اور رسول کی معصیت میں کوئی اطاعت نہیں ہے۔ اطاعت جو کچھ ہے معروف میں ہے۔"

۴۔ چوتھی بات جو اس آیت میں طے کر دی گئی ہے یہ ہے کہ اسلامی نظام میں خدا کا حکم اور رسول کی سنت بنیادی قانون اور آخری سند اولی الامر سے نزاع کا حق رکھتے ہیں۔ اس حکم کا تقاضا پورا کرنے کے لیے مسلمانوں میں کوئی ایسا ادارہ ہونا چاہیئے جو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کے مطابق ایسے نزاع کا فیصلہ کر سکے۔ یہ شرعی پنچایت بھی ہو سکتی ہے اور مسلمانوں کی سپریم کورٹ بھی۔

اسلامی حکومت کے نصب العین اور اُس کے کارکنوں کی خصوصیات کے بارے میں قرآن کا فیصلہ یہ ہے کہ :—

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ
اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ
وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ
وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ (سورۃ الحج: ۴۱)

• یہ وہ لوگ ہیں جنہیں ہم زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے، معروف کا حکم دیں گے اور منکر سے روکیں گے اور سب کاموں کا انجام خدا ہی کے اختیار میں ہے۔

اسلامی ریاست اور مسلم سماج کی بنیاد جن فکری، اخلاقی، تمدنی، معاشی اور قانونی اصولوں پر رکھی جاتی ہے انہیں قرآن نے سورہ بنی اسرائیل کی آیات ۲۳ - ۳۹ میں بڑے ایجاز سے بیان کر دیا ہے:۔ وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ و.... ذٰلِكَ مِمَّآ اَوْحٰٓى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ۔

تیرے رب نے فیصلہ کر دیا ہے کہ

۱۔ تم لوگ کسی کی عبادت نہ کرو مگر صرف اس کی۔

۲۔ والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو، اگر تمہارے پاس ان میں سے کوئی ایک یا دونوں بوڑھے ہو کر رہیں تو انہیں اف تک نہ کہو، نہ انہیں جھڑک کر جواب دو، بلکہ ان سے احترام کے ساتھ بات کرو اور نرمی و رحم کے ساتھ ان کے سامنے جھک کر رہو اور دعا کیا کرو کہ "اے پروردگار ان پر رحم فرما جس طرح انہوں نے رحمت و شفقت کے ساتھ مجھے بچپن میں پالا تھا۔ تمہارا رب خوب جانتا ہے کہ تمہارے دلوں میں کیا ہے اگر تم صالح بن کر رہو تو وہ ایسے سب لوگوں سے درگزر کرنے والا ہے

تمہارا رب خوب جانتا ہے کہ تمہارے دلوں میں کیا ہے اگر تم صالح بن کر رہو تو ایسے سب لوگوں سے درگزر کرنے والا ہے جو اپنے قصور پر متنبہ ہو کر بندگی کے رویے کی طرف پلٹ آئیں۔

جو اپنے قصور پر متنبہ ہو کر بندگی کے رویے کی طرف پلٹ آئیں۔ اپنے بندوں کے حال سے باخبر ہے اور انہیں دیکھ رہا ہے۔
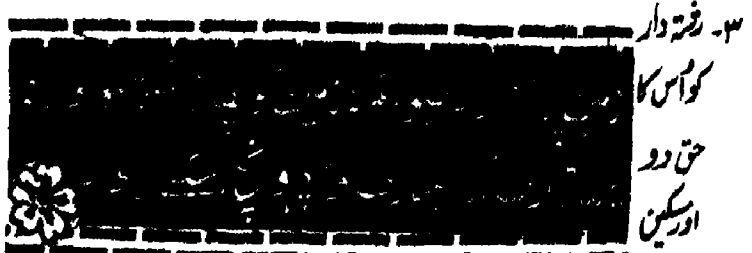
۳۔ رشتہ دار کو اُس کا حق دو اور مسکین اور مسافر کو اُس کا حق دو۔

۴۔ فضول خرچی نہ کرو، فضول خرچ لوگ شیطان کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے رب کا ناشکرا ہے۔

۵۔ اگر ان سے یعنی احاجت مند رشتہ داروں مسکینوں اور مسافروں سے) تمہیں کترانا ہو اس بنا پر کہ ابھی تم اللہ کی اُس رحمت کو جس کے تم امیدوار ہو تلاش کر رہے ہو تو انہیں نرم جواب دے دو۔

۶۔ نہ تو اپنا ہاتھ گردن سے باندھ کر رکھو اور نہ اُسے بالکل ہی کھلا چھوڑ دو کہ ملامت زدہ اور عاجز بن کر رہ جاؤ، تیرا رب جس کے لیے چاہے رزق کشادہ کرتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے وہ

۷۔ اپنی اولاد کو افلاس کے اندیشے سے قتل نہ کرو۔ ہم انہیں بھی رزق دیں گے اور تمہیں بھی درحقیقت اُن کا قتل بڑی خطا ہے۔

۸۔ زنا کے قریب بھی نہ پھٹکو۔ وہ بہت بُرا فعل ہے اور بڑا ہی بُرا راستہ ہے۔

۹۔ قتلِ نفس کا ارتکاب نہ کرو جسے اللہ نے حرام قرار دیا ہے مگر حق کے ساتھ ـــ اور جو شخص مظلومانہ قتل کیا گیا ہو اُس کے ولی کو ہم نے قصاص کے مطالبے کا حق دیا ہے۔ پس چاہیئے کہ وہ قتل میں حد سے نہ گزرے، اُس کی مدد کی جائے گی۔

۱۰۔ یتیم کے مال کے پاس نہ پھٹکو مگر احسن طریقے سے یہاں تک کہ وہ اپنے شباب کو

پہنچ جائے۔

۱۱۔ عہد کی پابندی کرو، بیشک عہد کے بارے میں تم کو جواب دہی کرنی ہوگی۔

۱۲۔ پیمانے سے دو تو پورا بھر کر دو اور تولو تو ٹھیک ترازو سے تولو۔ یہ اچھا طریقہ ہے اور بلحاظ انجام بھی یہی بہتر ہے۔

۱۳۔ کسی ایسی چیز کے پیچھے نہ لگو جس کا تمہیں علم نہ ہو۔ یقیناً آنکھ، کان اور دل سب ہی کی بازپرس ہوتی ہے۔

۱۴۔ زمین میں اکڑ کر نہ چلو، نہ تم زمین کو پھاڑ سکتے ہو اور نہ پہاڑوں کی بلندی کو پہنچ سکتے ہو۔

ان احکامات سے ہر ایک کا برا پہلو تیرے رب کے نزدیک ناپسندیدہ ہے۔ یہ حکمت کی وہ باتیں ہیں جو تیرے رب نے تجھ پر وحی کی ہیں۔

ان آیات میں وہ بڑے بڑے اصول پیش کیے گئے ہیں جن پر اسلام انسانی زندگی کے نظام کی عمارت قائم کرنا چاہتا ہے۔ یہ دراصل نبی کریم کی دعوت کا منشور ہے۔ آیئے اس منشور کے محتویات پر ذرا غور کریں۔

۱۔ تم اللہ کے علاوہ کسی کی عبادت نہ کرو۔ اس کا مطلب صرف یہی نہیں ہے کہ اللہ کے علاوہ کسی کے آگے مراسم عبودیت نہ بجالاؤ بلکہ یہ بھی ہے کہ اس کے علاوہ کسی کا اقتدار اعلیٰ تسلیم نہ کرو۔ وہی خالق ہے، وہی مالک ہے اور وہی حاکم ہے۔ اُسی کی شریعت قانون ہے۔

۲۔ دوسری آیت میں بتایا گیا ہے کہ والدین کی اطاعت کرو اور بڑھاپے میں اُن کی خدمت کرو۔ یہ کوئی اخلاقی سفارش ہی نہیں ہے بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ اسلامی معاشرہ میں خاندان مضبوط ادارہ ہوگا اور رشتوں کا بھرپور احترام کیا جائے گا۔

۳۔۵۔ ان تین دفعات میں ہدایت کی گئی ہے کہ آدمی اپنی کمائی اور دولت کو اعتدال کے ساتھ خرچ کرے اور اپنی آمدنی میں اپنے رشتہ داروں، ہمسایوں اور دوسرے حاجتمند لوگوں کے حقوق بھی ادا کرے تاکہ سماج میں فیاضی، ہمدردی اور تعاون کی روح جاری و ساری رہے۔

۶۔ منشور کی دفعہ ۴ کے ساتھ دفعہ ۶ کو پڑھنے

سے بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام لوگوں میں اعتدال پسندی کو فروغ دینا چاہتا ہے وہ جہاں لوگوں کو کنجوسی سے روکتا ہے وہیں فضول خرچی سے بھی روکتا ہے۔ تاکہ وہ دولت کو مفید کاموں میں خرچ کرنے کے بجائے غلط کاموں میں صرف نہ کرنے لگیں۔ یہی وجہ ہے کہ عیاشی اور فضول خرچی کی بہت سی صورتیں اسلام میں حرام ہیں۔ اس کے بجائے زکوٰۃ اور صدقات پر زور دیا ہے تاکہ لوگوں میں کنجوسی کا جذبہ نہ پیدا ہو اور وہ مفید کاموں میں دولت خرچ کرنے سے نہ کترائیں۔

اس سلسلہ میں یہ بات واضح کردی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے درمیان رزق کی بخشش میں کمی بیشی رکھی ہے۔ اس پے تقسیم رزق کے فطری نظام میں انسان کو اپنی مصنوعی تدبیروں سے دخل انداز نہ ہونا چاہیئے۔

۷۔ فقرہ نمبر سات میں قتل اولاد اور نسل کشی کی ممانعت کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ رزق رسانی کا انتظام اللہ کے ہاتھ میں ہے اور افلاس کے ڈر سے نسل کشی کرنا ایمان کی کمزوری کی دلیل ہے۔

۸۔ اس دفعہ میں زنا اور محرکات زنا نیز اسباب زنا کے سدباب کی ہدایت ہے کیونکہ اس سے معاشرتی زندگی میں بدگمانی اور بے حیائی پھیلتی ہے۔ اسی کے مطابق زنا کو فوجداری جرم قرار دیا گیا۔ حدود مقرر کیے گئے اور فواحش کی اشاعت کو سختی سے روک دیا گیا۔

۹۔ قتل نفس خواہ خودکشی ہو یا کسی دوسرے کا قتل۔ بالکل حرام ہے سوائے ذیل کی پانچ صورتوں کے۔ اور ان صورتوں میں قتل کی اجازت حکومت کو ہے کسی فرد کو نہیں:۔

★ قتل عمد کے مجرم سے قصاص۔

* دینِ حق کے راستے میں مزاحمت کرنے والے سے جنگ۔
* اسلامی حکومت کا تختہ الٹنے کی کوشش کرنے والوں کو سزا۔
* شادی شدہ مرد یا عورت کو زنا کی سزا۔
* ارتداد کی سزا۔

یہ پانچ صورتیں ہیں جن میں انسانی جان کی حرمت اٹھ جاتی ہے اور اُسے قتل کرنا جائز ہو جاتا ہے۔

اُس کے ولی کو ہم نے قصاص کے مطالبے کا حق عطا کیا ہے! اس سے اسلامی قانون کا یہ اصول نکلتا ہے کہ قتل کے مقدمے میں اصل مدعی حکومت نہیں بلکہ مقتول کے وارث ہوتے ہیں اور انہیں حق ہے کہ وہ قاتل سے خون بہا لے کر یا ویسے ہی اُسے معاف کر دیں۔

۱۰۔ یتیموں کے مال کی حفاظت کے حکم میں حضورؐ کے ارشاد کے مطابق ہر اُس شخص کی سرپرستی بھی شامل ہے جس کا کوئی ولی اور سرپرست نہ ہو۔

۱۱۔ عہد کی پابندی انفرادی اخلاقیات سے آگے بڑھ کر پوری مسلم قوم کی داخلی اور خارجی سیاست کا سنگِ بنیاد ہے۔

۱۲۔ ناپ تول کے اس اصول سے تجارت اور معاشی لین دین میں ہر قسم کی بے ایمانی اور حق تلفی کا سدِّباب کرنا شامل ہے

۱۳۔ اس دفعہ کا منشا یہ ہے کہ مسلمان انفرادی اور اجتماعی زندگی میں وہم و گمان سے کام نہ لیں اور جب تک کسی بات کا صحیح علم نہ ہو اُس پر کارروائی نہ کریں۔ اسی حکم کی بنیاد پر اسلامی قانون میں یہ اصول طے کر دیا گیا کہ محض شبہ کی بنیاد پر کسی کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی جائے۔

۱۴۔ اس فقرے میں یہ ہدایت ہے کہ جباروں اور متکبروں کی روش سے بچو۔

آخر میں ارشاد ہوا ہے کہ ہر حکم میں جو چیز منع ہے اُس کا ارتکاب اللہ کو ناپسند ہے۔ اور دوسرے الفاظ میں جس حکم کی بھی نافرمانی کی جائے وہ ناپسندیدہ ہے۔

اس منشور کے نفاذ اور اُس کے فہم کو عام کرنے کے لیے ریاست کو ایک تعلیمی پالیسی اپنانی ہو گی جس کے بارے میں قرآن کی ہدایت یہ ہے کہ:۔

وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُونَ لِيَنْفِرُوا كَافَّةً فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِنْهُمْ طَائِفَةٌ لِيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ وَلِيُنْذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ (التوبہ: ۱۲۲)

"اور یہ کچھ لازم نہ تھا کہ اہلِ ایمان سارے کے سارے ہی نکل کھڑے ہوتے، مگر ایسا کیوں نہ ہوا کہ ان کی آبادی کے ہر حصے میں سے کچھ لوگ نکل کر آتے اور دین کی سمجھ پیدا کرتے پھر واپس جاکر اپنے علاقے کے باشندوں کو خبردار کرتے تاکہ (وہ غیر مسلمانہ روش سے) پرہیز کرتے۔"

اس آیت میں مسلمانوں میں عمومی تعلیم کے انتظام کا حکم دیا گیا ہے اور تعلیم کا یہ مقصد متعین کیا گیا ہے کہ لوگوں میں دین کی سمجھ پیدا ہو اور ان کو اس حد تک ہوشیار و خبردار کر دیا جائے کہ وہ غیر مسلمانہ طریقِ زندگی سے پرہیز کرنے لگیں۔ درحقیقت اسلامی تعلیم کا یہی مقصد ہے جو خود اللہ نے ہمیشہ کے لیے طے فرما دیا ہے۔

اس مختصر سی بحث سے اسلام کے سیاسی نظام کے خدوخال بڑی حد تک ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔ گویا ہر وہ ریاست جو ان اصولوں اور مقاصد کے لیے قائم ہو وہ اسلامی ریاست ہوتی ہے۔

رشوت اور گواہی

سلطان غرناطہ ناصرالدین اللہ کے عہد میں اسلم ابن عبدالعزیز بن ہشام قاضی کی عدالت میں ایک شخص گواہی دینے کے لیے حاضر ہوا۔ اس گواہ کے بارے میں قاضی صاحب کو اطلاع مل چکی تھی کہ اس شخص نے گواہی دینے کے لیے ایک قالین رشوت میں لیا ہے۔ وہ شخص جب قاضی اسلم کی عدالت میں گواہی دینے کے لیے گیا عدالت کے قالین کے قریب پہنچ کر جوتے اتارنے لگا تو قاضی اسلم نے اُسے مخاطب کرتے ہوئے کہا: اے شخص یہ قالین ہے اللہ اللہ۔" اور اس خیال سے کہ رشوت ستانی کی اطلاع قاضی صاحب کو ہو چکی ہے، گھبرا اور بغیر گواہی دیئے کمرۂ عدالت سے باہر نکل گیا۔

(ابن الخطیب اخبار غرناطہ)

اسلامی آئیڈیالوجی

خورشید احمد

پاکستان محض ایک جغرافیائی وجود کا نام نہیں ہے۔ یہ اسلامی آئیڈیالوجی کی تجربہ گاہ ہے۔۔ اس ملک کے قیام کا حقیقی محرک اسلامی نظریہ ہی تھا اور آج اس کے وجود کا محافظ اور اس کے استحکام و ترقی کا ضامن بھی یہی نظریہ ہے لیکن سوال یہ ہے کہ اسلامی آئیڈیولوجی ہے کیا؟ اس مضمون میں ہم مختصراً اسی سوال کا جواب دینگے۔

آئیڈیولوجی سے کسی بھی تحریک یا نظامِ تمدن کا تہذیبی سیاسی و معاشرتی پروگرام و لائحہ عمل مراد ہے اور جب ہم اسلامی آئیڈیولوجی کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں تو اس سے وہ سیاسی اور تمدنی لائحہ عمل مراد ہوتا ہے جو اسلام نے پیش کیا ہے۔ آئیڈیولوجی کی اصل حقیقت ہی یہ ہے کہ وہ اپنے خاص نظامِ فکر کی روشنی میں زندگی کے مختلف شعبوں کے متعلق رہنمائی کرتی ہے اور جس طرح ہار کے موتیوں کو ایک رشتہ باہم منسلک کر دیتا ہے اسی طرح ہر آئیڈیالوجی کی ایک مشترک اپروچ زندگی کے تمام شعبوں کے پروگراموں کو جوڑ کر ایک وحدت بنا دیتی ہے۔ ہر شعبہ میں ایک ہی روح اور ایک ہی فکر کارفرما ہوتی ہے اور اس طرح ایک مکمل ضابطۂ فکر و عمل رونما ہوتا ہے جس میں زندگی کی حقیقی وحدت جلوہ گر ہوتی ہے۔ اس کے نتیجہ میں حیات کے تمام پہلوؤں میں یک رنگی اور ہم آہنگی رونما ہوتی ہے۔ اور اس یک رنگی سے زندگی میں حسن پیدا ہوتا ہے۔

اب پوری دنیا ایک شہر اور پوری انسانیت ایک خاندان بنتی جا رہی ہے اور وحدت

کی طرف اُس کی پیش قدمی کے زمانے میں "کثرت" اور "تقسیم" کے وہ تمام فلسفے بیکار اور ازکار رفتہ ہوگئے ہیں جو آج تک اُس کا سرمایۂ حیات رہے ہیں۔ نیا زمانہ مغرب کے تمام جزوی فلسفوں کو مخاطب کرکے کہہ رہا ہے؛

سچ کہہ دوں اے برہمن! اگر تو بُرا نہ مانے
ترے صنم کدوں کے بُت ہوگئے پُرانے

اب دنیا کو ایک ایسے نظریہ، ایک ایسی آئیڈیولوجی کی ضرورت ہے جو کثرت کو وحدت میں بدل دے اور ان نئے حالات میں انسان کو رہنے کا سلیقہ سکھائے تاکہ وہ اپنی حاصل کی ہوئی نئی قوتوں کو تعمیر و تشکیل کے لیے استعمال کرسکے، ورنہ اس بات کا قوی اندیشہ ہے کہ آج تک انسان نے جو کچھ حاصل کیا ہے وہ نفرت تقسیم پسندی اور جزو پرستی کے نسخوں کے ہاتھوں تباہ ہوجائے۔

وہ فکر گستاخ جس نے عریاں کیا ہے فطرت کی طاقتوں کو
اُسی کی بیتاب بجلیوں سے خطر میں ہے اُس کا آشیانہ

ہمیں اس بات کا یقین ہے کہ اسلامی آئیڈیولوجی وہ نظامِ عمل پیش کرتی ہے جو دورِ جدید کی تمام ضرورتوں کو پورا کرسکتا ہے۔

اسلامی آئیڈیولوجی کے معاشرتی اور تمدنی پروگرام کا مطالعہ کرنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اُن بنیادوں کا مطالعہ کر لیا جائے جو اس آئیڈیولوجی کے مخصوص مزاج کو متعین کرتی ہیں، اُسے ایک خاص اندازِ کار دیتی ہیں اور اُس کے دیئے ہوئے لائحہ عمل کو دوسرے تمام نظام ہائے فکر و عمل پر فوقیت عطا کرتی ہیں۔

اسلامی آئیڈیولوجی کے متعلق سب سے اہم اور بنیادی بات یہ ہے کہ الہامی ہدایت پر مبنی ہے۔ اسے کسی انسان کے ذہن نے تخلیق نہیں کیا۔ یہ اُسی خالق کی طرف سے ہے جس نے زمین و آسمان کو اور خود انسان کو پیدا کیا ہے۔ اسلامی آئیڈیولوجی کے اولیں ماخذ قرآن اور سنت رسول اللہ ہیں۔ ہر وہ چیز جس کی سند قرآن و سنت میں ہے آئیڈیولوجی کا جزو ہے۔ اور جس کی سند ان میں نہیں ہے وہ اس آئیڈیولوجی کا کوئی مستقل حصہ نہیں۔

قرآن اپنی اصلی شکل میں ہمارے پاس موجود ہے اور یہ اسلامی نظریہ کا اولین ماخذ ہے

اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکُمْ مِّنْ رَّبِّکُمْ
وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِہٖٓ اَوْلِیَآءَ ط (الاعراف: ۳)

لوگو! جو (کتاب) تم پر تمہارے

پروردگار کی طرف سے نازل ہوئی
ہے۔ اس کی پیروی کرو اور اس
کے سوا اور رفیقوں کی پیروی نہ کرو۔

قرآن کے ساتھ ہمیں رسولؐ کی اطاعت
کا حکم ہے۔ رسولؐ کی زندگی کو انسانیت کے لیے
اسوۂ حسنہ بنایا گیا ہے۔ اور اس کی اطاعت کو خدا
کی اطاعت قرار دیا گیا ہے۔

مَن یُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ
اللّٰہَ (سورۃ النساء - ۸۰)

جس نے رسولؐ کی اطاعت کی اس
نے یقیناً خدا کی اطاعت کی۔

خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلامی
آئیڈیولوجی کی انہی دو بنیادوں کا ذکر اپنے آخری
خطبے میں فرمایا تھا۔

"میں تم میں دو چیزیں چھوڑتا ہوں
جن کے بعد پھر تم گمراہ نہیں ہو سکتے
ایک اللہ کی کتاب اور دوسری میری
سنت۔" (متفق علیہ)

اسلامی آئیڈیولوجی کی یہی الہامی نوعیت
ہے کہ جس کی بنا پر بدعت کو گمراہی کہا گیا ہے۔
یعنی دین میں ایسے مستقل اضافے کرنے کہ جن کی اصل
ماخذ میں کوئی سند نہیں۔

اسلامی آئیڈیولوجی کی یہ خصوصیت اسے باقی
تمام نظریات سے مختلف کر دیتی ہے۔ اس
نظام میں کسی کے لیے بھی خدا اپنی طرف سے کسی
بات کے بڑھانے کا امکان نہیں ہے۔ اسلامی
آئیڈیولوجی کی دوسری بنیاد ایمان ہے۔ ایمان
خدا پر اس کے رسولوں پر اور زندگی بعد موت
پر۔ یہی ایمان اس کی فکری اور فلسفیانہ بنیاد
ہے اور اسی ایمان کے سہارے وہ زندگی کی
تعمیر کے پورے پروگرام پر عمل کراتی ہے۔

خدا اس کے رسول اور زندگی بعد موت پر
ایمان، انسان کی زندگی میں ایک انقلابی تبدیلی
کا محرک ہوتا ہے۔ چونکہ اسلامی آئیڈیولوجی کا
تعلق اسلام کی پوری زندگی سے ہے، اور چونکہ
زندگی کے ہر شعبے میں یہ ایک ہی رنگ — یعنی
صبغۃ اللہ — کو غالب کرنا چاہتی ہے۔ اس
لیے اس کا نکتۂ آغاز ایمان پیدا کرنا ہے جس کے
معنیٰ انسان کے فکر و نظر کی تبدیلی ہے۔ یہ سماجی
معاشی اور معاشرتی اصلاحات سے پہلے انسان
کے دل کو بدلتی ہے۔ اس کی نگاہ کو متاثر کرتی
ہے۔ اس کے زاویۂ نظر اور سوچنے کے انداز کو تبدیل

کرتی ہے؛ اُسے ایک نیا نکتۂ خیال عطا کرتی ہے۔ تاکہ ہر انسان خود اپنی پوری زندگی کو خدا کی اطاعت کے سانچوں میں ڈھالنے کے لیے سرگرم عمل ہو جاتے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایمان سب سے بڑی انقلابی قوت ہے۔ خود تاریخ بھی اس حقیقت کی نشان دہی کرتی ہے کہ تاریخ کا سب سے بڑا انقلاب جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں برپا ہوا تھا۔ یہ ایمان ہی کی انقلابی قوت تھی کہ اُس نے زندگی کے ہر شعبے کی قلب ماہیت کر دی یہ ایمان ہی کا کرشمہ تھا کہ ہمیں ایک نوجوان ایسا بھی نظر آتا ہے جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں خود آتا ہے اور کہتا ہے کہ "یارسول اللہ! میں زنا کا مرتکب ہوا ہوں مجھ پر حد جاری کر دیجیے۔" یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ ایک خاتون نبی بزرگ و برتر صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار میں آتی ہے اور خود کہتی ہے "اے خدا کے فرستادہ! مجھ سے گناہ ہو گیا ہے، مجھے پاک کر دیجیے۔" یہ ایمان ہی کا ثمرہ ہے کہ ایک شخص کو کسریٰ کا تاج ملتا ہے اور وہ اُسے اپنی گدڑی میں چھپا کر لاتا ہے اور بیت المال میں جمع کر دیتا ہے اور لوگ پوچھتے ہیں کہ تمہارا کیا نام ہے تو کہتا ہے کہ "میں اس لیے نہیں بتاتا کہ تم تعریف کرو گے۔ سب تعریف اللہ کے لیے ہے اور میں اس کے ثواب پر راضی ہوں"، یہ اسی ایمان کا ثمرہ ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم خود ایک جاہل اعرابی کو مالِ غنیمت میں سے اُس کا حصہ دیتے ہیں تو وہ کہتا ہے۔ "یارسول اللہ! یہ کیا ہے؟ میں اس لیے آپ کے ساتھ نہیں ہوا تھا۔ میں نے تو آپ کی رفاقت اس لیے اختیار کی تھی کہ اس جگہ (گلے کی طرف اشارہ کر کے) تیر لگے تاکہ میں جنت میں جا سکوں۔" یہ اسی ایمان کا نتیجہ تھا کہ جب غزوۂ بدر کے موقع پر خدا کا پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم جہاد میں شرکت کی ترغیب دیتے ہوئے کہتا ہے کہ "بڑھو جنت کی طرف جس کی وسعت زمین و آسمان ہے۔" تو ایک شخص جو کھجور کے دانے کھا رہا تھا اُن کو پھینک دیتا ہے اور کہتا ہے۔ "اگر ان کھجوروں کو کھا لینے کا انتظار کروں گا تو بہت سا وقت لگے گا۔" اور میدان میں کود کر شہادت پاتا ہے۔ یہ اسی ایمان کا معجزہ ہے کہ جب امتناع شراب کا حکم آتا ہے تو اس سپردگی کے ساتھ اس کی اطاعت ہوتی ہے کہ جب کانوں تک خدا کا حکم پہنچتا ہے

تو جو شراب پیالوں میں تھی وہ پھینک دی جاتی ہے اور جو قطرے ہونٹوں پر تھے وہ تھوک دیتے جاتے ہیں اور مدینے کی نالیوں میں شراب بہادی جاتی ہے۔ یہ اسی ایمان کا اثر ہے کہ ایک ناخواندہ بھی جب اس کا اعلان کر دیتا ہے تو پھر فسق و فجور سے اس طرح بھاگتا ہے جس طرح روشنی سے تاریکی اور جب وہ خدا کے رسول سے بیعت کر کے اپنے گھر کی طرف لوٹتا ہے اور راستے میں وہ عورت ملتی ہے جس سے وہ دل لگی کیا کرتا تھا اور وہ اسے مل بیٹھنے کی دعوت دیتی ہے تو وہ بے اختیار پکار اٹھتا ہے " اللہ کی اطاعت اور اسلام کے بعد اب اس کا کوئی امکان نہیں۔

اسلامی آئیڈیولوجی کی تیسری بنیاد دین و دنیا کی وحدت ہے۔ اسلام نہ ترکِ دنیا کی تعلیم دیتا ہے اور نہ غلو فی الدنیا کی۔ وہ دین و دنیا کی تفریق کو ایک شیطانی نظریہ قرار دیتا ہے خواہ یہ دنیا کے نام پر پیش کیا جائے اور خواہ مذہب کے نام پر۔ نہ اسلام میں سیکولرزم کے لیے گنجائش ہے اور نہ رہبانیت کے لیے یہ آئیڈیالوجی دنیا اور آخرت دونوں کو سنوارنا چاہتی ہے اور خود آخرت کے سنوار کا ذریعہ بھی دنیا کے سدھار ہی کو قرار دیتی ہے۔ اگر انسان اس کی بنیادی زندگی کو صحیح طریقے پر منظم کرتا ہے تو یہی آخرت میں کامیابی کا راستہ ہے۔ یہ دین کو دنیا کے تابع نہیں کرتی بلکہ دنیا کو دین کے تابع کرتی ہے،

اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب
بادشاہوں کی نہیں اللہ کی ہے یہ زمین

اسلامی آئیڈیولوجی محض ایک نظریہ ہی پیش نہیں کرتی ہے بلکہ اس کو قائم کرنے، چلانے اور زمین پر وسعت دینے کے لیے ایک تحریک بھی برپا کرتی ہے۔" تحریک " اس اجتماعی جدوجہد کا نام ہے جو کسی نصب العین کے حصول کے لیے منظم طور پر کی جائے۔ مسلمانوں کی اس اجتماعی تنظیم اور اس جماعت بندی کا نام اسلامی تحریک ہے۔ حضور کا ارشاد ہے:

الاسلام احوج الی الجماعة

اسلام میں جماعتی نظام کا قیام نہایت ضروری ہے۔

اس تحریک کا اصل کام خدا کے دین کو پھیلانا اور قائم کرنا ہے، اللہ تعالیٰ اپنے انبیاء کو بھی یہی حکم دیتا ہے کہ:

یٰۤاَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْكَ
مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَ اِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا
بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ؕ (المائدہ ۶۷)

اے رسول! جو (دین) تم پر تمہارے
رب کی طرف سے اُتارا گیا ہے اُس
کی تبلیغ کرو۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو
تم نے خدا کے فرض رسالت کو ادا
نہیں کیا۔

اور پوری اُمت مسلمہ کا مشن بھی یہی قرار دیا گیا کہ:

کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ
تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ
عَنِ الْمُنْكَرِ وَ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ؕ

تم بہترین اُمت ہو جو لوگوں کے
لیے برپا کیے گئے ہو۔ نیکی کا حکم
دیتے ہو۔ برائی سے روکتے ہو،
اور اللہ پر ایمان لاتے ہو۔

اسلامی تحریک اصلاً ایک مشنری اور تعلیمی
ادارہ ہے اور جو ریاست اور اجتماعی نظم یہ قائم
کرتی ہے وہ بھی اصلاً معلم اور داعی الی الحق کے
فرائض انجام دیتا ہے۔

اسلامی آئیڈیولوجی کی ایک اور خصوصیت یہ
ہے کہ اس میں ثبات و تغیر کے درمیان کامل توازن
قائم کیا گیا ہے۔ قرآن اور سنت کے دیے ہوئے
اصول ابدی ہیں اور اگر پوری انسانیت متفقہ طور
پر بھی ان میں کوئی تبدیلی کرنا چاہے تو اسے اس
کا حق نہیں۔ یہ ہدایت خالق کائنات کی طرف سے
ہے، انسانی فطرت کے مطابق ہے اور اس میں
کسی تبدیلی کی نہ ضرورت ہے اور نہ گنجائش۔

لَا تَبْدِیْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ
هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ (یونس۔ ۶۴)

خدا کی باتیں بدلتی نہیں یہی تو بڑی کامیابی
ہے۔

لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ
الدِّیْنُ الْقَیِّمُ ۙ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ
لَا یَعْلَمُوْنَ ۔ (الروم۔ ۳۰)

خدا کی بنائی ہوئی چیز میں تغیر نہیں
ہو سکتا یہی سیدھا دین ہے لیکن
اکثر لوگ جانتے نہیں۔

وَ لَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَحْوِیْلًا (۴۳)

اور تم خدا کے طریقے میں تبدیلی
نہ پاؤ گے۔

یہی وجہ ہے کہ اسلامی آئیڈیولوجی ابدی صداقت

کی حامل ہے اور اس میں کسی تبدیلی کی ضرورت
نہیں لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ زندگی کی بدلتی
ہوئی ضرورتوں کا یہ کیسے ساتھ دے گی۔ اس کا
جواب مختصراً یہ ہے:

بنیادی اصول اور اساسی ادارے قائم کرنے
کے بعد شریعت مسلمانوں کو آزاد چھوڑتی ہے
کہ پیش آمدہ معاملات کو اسلام کی مجموعی ہدایت کی
روشنی میں اور ان حدود کو قائم رکھتے ہوئے جو
خدا اور اس کے رسول نے مقرر کیے ہیں اپنے
اجتہاد سے حل کریں۔ اس طرح ثبات کے ساتھ
ساتھ تغیر کے تقاضوں کو پورا کرنے کا بھی انتظام
کر دیا گیا اور زندگی کے تسلسل کو بھی متاثر نہیں
ہونے دیا گیا۔ اسلامی آئیڈیولوجی کی اصل دلچسپی
انسان کی انفرادی و اجتماعی زندگی ہے
قرآن انسان کی ہدایت کے لیے آیا ہے۔ سائنس
یا جغرافیہ کے مسائل بیان کرنے کے لیے نہیں اسی
لیے اسلامی آئیڈیولوجی علوم طبعی کے مسائل سے
تعرض نہیں کرتی ہے۔ اسلامی آئیڈیولوجی زندگی
کے ان مسائل سے تعرض کرتی ہے جو ہدایت و ضلالت
سے متعلق ہیں۔ اسلامی آئیڈیولوجی کے اس اپروچ
نے مذہب اور سائنس کے درمیان اس قسم کے
تصادم کے امکانات ہمیشہ کے لیے ختم کر دیئے
ہیں جو یورپ میں رونما ہوا تھا۔ ان علوم میں تغیر و
تبدل کے پورے امکانات موجود ہیں اور اسلام
نے ان میں ارتقا کے مواقع فراہم کر دیئے ہیں اور
کوئی پابندی ان پر نہیں لگاتی۔

اس سلسلے کی آخری چیز یہ ہے کہ اسلامی آئیڈیو-
لوجی کا طریقہ کار غیر حقیقت پسندانہ نہیں ہے
وہ ہر کام کو مناسب اور معقول طریقے سے انجام دینا
چاہتی ہے۔ وہ خدا کی ابدی ہدایت کو حرف بحرف
قائم کرنا چاہتی ہے۔ لیکن چونکہ اس کا اصل مقصد
انسانوں کے لیے مشکلات پیدا کرنا نہیں، ان کے
لیے آسانیاں فراہم کرنا ہے۔ اس لیے وہ ایک
مناسب تدریج کے ساتھ اپنے پورے لائحہ
عمل کی تنفیذ کرتی ہے۔

نبی کا اصل کام لوگوں کو ان مشکلات اور
مصائب سے نکالنا ہے جن میں وہ خود اتباع
نفس یا ترک دنیا کی وجہ سے گرفتار ہو گئے
ہیں۔ دین کے اوامر و نواہی کا یہی مقصد ہے۔

يَأْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ
عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ
وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ

وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَ
الْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۔ (اعراف ۱۵۷)
محمد رسول صلی اللہ علیہ وسلم اُن کو نیکی
کا حکم دیتے ہیں ، برائی سے روکتے
ہیں ۔ پسندیدہ چیزیں حلال کرتے
ہیں ۔ بُری چیزیں حرام ٹھہراتے ہیں ۔
اس بوجھ سے نجات دلاتے
ہیں جس کے تلے وہ دبے ہوتے
ہیں اور اُن پھندوں سے نکالتے
ہیں جو اُن پر پڑے ہوتے ہیں ۔

چنانچہ جب ہم اسلامی انقلاب کی تاریخ کا مطالعہ
کرتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے نماز'
زکوٰۃ' حرمت شراب ' حرمت سود وغیرہ بے شمار
احکام کی تنفیذ میں تدریج کا اہتمام فرمایا تاکہ اُس
کے بندے اُس کے احکام کی اطاعت کے
خوگر ہو سکیں ، اور آہستہ آہستہ اس نظام عدل کو
پوری طرح اپنے اوپر نافذ کرلیں جو اُن کے
رب نے اُن کی طرف نازل کیا ہے ۔

اسلامی آئیڈیولوجی کے نفاذ میں ہر دور
میں اسی تدریج کا خیال رکھا جائے گا ۔ جو قرنِ
اوّل میں رکھا گیا تھا ۔ تدریج اس آئیڈیولوجی کا
ایک مستقل اصول ہے اور اس کے ذریعہ اس
کا نفاذ زیادہ مکمل اور دیرپا ہو سکے گا ۔

اسلام ہر فرد کی جداگانہ شخصیت کا قائل ہے
وہ انسان کو محض نظام اجتماعی کا ایک بے جان
پُرزہ یا ماحول کا ایک پَرتو نہیں سمجھتا ۔ بلکہ اسے
اصل تاریخ ساز ' قرار دیتا ہے ۔ اس میں انفرادی
ذمہ داری کا احساس بیدار کرتا ہے اور اس
کی اصلاح کے لیے اہم خطوط متعین کرتا ہے ۔ فرد
کی اصلاح کے لیے اسلام کا جو پروگرام ہے اُس
کی چند نمایاں چیزیں ہم یہاں درج کرتے ہیں ۔

اسلامی آئیڈیولوجی سب سے پہلے ہر فرد
میں یہ احساس پیدا کرنا چاہتی ہے کہ وہ اپنے
اعمال کا ذمہ دار اور اپنی پوری زندگی کے لیے
خدا کے سامنے جواب دہ ہے ۔ خدا کے سامنے
ہر فرد کی ذمہ داری انفرادی ہے اور اس طرح
معاشرہ میں بھی ہر فرد کی شخصیت کے تحفظ اور
نشوو ارتقا کا پورا پورا موقع ہونا چاہیے ۔ قرآن
انسان سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ سب سے پہلے
خود اپنی اصلاح کی کوشش کرے کوئی دوسری
نیکی اپنی ذات کی اصلاح کو نظر انداز کرنے کا بدل
نہیں ہو سکتی ۔

اَتَأْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ
اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ
اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۔ (البقرہ۔۴۴)

کیا تم لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہو مگر
خود اپنی خبر نہیں لیتے؛ حالانکہ خدا
کی کتاب برابر تلاوت کرتے ہو۔
(افسوس) کیا اتنی موٹی بات بھی
تمہاری سمجھ میں نہیں آتی؟

فرد کی اصلاح کے لیے دوسری صورت
اس امر کی ہے کہ اس کا ایمان خدا، رسول اور
آخرت پر برابر تازہ کیا جاتا رہے اور اس بات
کی ہر ممکن کوشش کی جائے کہ ایمان کے نقش
نمایاں گہرے تر ہوتے جائیں۔ اس مقصد کے حصول
کے لیے علم دین کی فراہمی سب سے اہم ہے
اسلام حصولِ علم کو بڑی اہمیت دیتا ہے اور
جیسا کہ امام غزالیؒ نے فرمایا ہے کہ دین کا اتنا علم
کہ اسلام کیا ہے اور اس کے بنیادی مطالبات
کیا ہیں فرض عین کا درجہ رکھتا ہے۔ پھر علم دین
کے ساتھ ساتھ اس علم کا حصول بھی واجب
ہے جو زندگی کے قیام اور تمدن کے فروغ
کے لیے ضروری ہے۔

قرآن علم کو خدا کا فضل قرار دیتا ہے اور انسان
کو تعلیم دیتا ہے کہ وہ زیادتیِ علم کی دعا مانگا کرے۔

وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا (طٰہٰ۔۱۱۴)

اور آپ دعا کیجیے: پروردگار!
میرا علم اور زیادہ کر۔

علم دین کا اصل مقصد عملی زندگی کی اصلاح ہے۔
اس لیے اسلام ہر فرد میں جذبۂ عمل پیدا کرتا ہے

وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى
وَاَنَّ سَعْيَهٗ سَوْفَ يُرٰى (النجم۔۳۹،۴۰)

یہ کہ انسان کو وہی ملتا ہے جس کی وہ
کوشش کرتا ہے اور یہ کہ اس کی
کوشش دیکھی جاتی ہے۔

جذبۂ عمل کو بیدار کر کے اسلام فرد میں یہ احساس
بھی پیدا کرتا ہے کہ ایمان کا لازمی تقاضا ہے
کہ وہ اچھے اعمال کرے۔ چنانچہ اسلامی آئیڈیالوجی
اس امر کی پوری کوشش کرتی ہے کہ انسان کو
عملِ صالح کی ترغیب دے اور اس طرح ہر
فرد کو خیر کا چلتا پھرتا نمونہ بنائے۔ اس لیے کہ
دنیا اور آخرت کی کامیابی کا انحصار عمل صالح ہی
پر ہے:-

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا

الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ
كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ
(النور - ۵۵)

تم میں جو لوگ ایمان لائیں اور نیک عمل کریں ان سے اللہ تعالیٰ وعدہ فرماتا ہے کہ ان کو زمین میں حکومت عطا فرمائے گا۔ جیسا کہ ان سے پہلے لوگوں کو حکومت دی تھی۔

فرد کی اصلاح کا ایک موثر ترین ذریعہ اور اس کی تربیت کا ایک مستقل نظام اسلامی عبادات ہیں۔ ان کی اتنی اہمیت ہے کہ قرآن کہتا ہے کہ:

الَّذِينَ إِن مَّكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ
أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ (الحج - ۴۱)

مسلمان وہ ہے کہ جب انہیں زمین میں اقتدار عطا کیا جاتا ہے تو وہ نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں۔

اسلامی آئیڈیولوجی فرد میں یہ احساس بھی پیدا کرتی ہے کہ وہ افراط و تفریط سے بچے نہ صرف دنیا کا ہو کر رہ جائے اور نہ صرف مذہب کا۔ غلو فی الدنیا اور غلو فی الدین دونوں سے روکا گیا ہے۔ اور اعتدال کی راہ اختیار کرنے کی تعلیم دی گئی ہے۔ نیز اسلامی آئیڈیولوجی کا یہ بھی ایک جزو ہے کہ وہ ہر فرد میں اقامت دین کی جد و جہد کا جذبہ پیدا کرے۔ اسلام مسلمانوں کو "امت وسطی" قرار دیتا ہے اور اس امت کی تخلیق کا مقصد ہی یہ قرار دیتا ہے کہ وہ انسان کی مصلح بنے۔ نیکیوں کا حکم دے اور برائیوں سے روکے تاکہ خدا کی زمین خدا کے لیے خالص ہو جائے۔

كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ
تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ
عَنِ الْمُنكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ
(آل عمران - ۱۱۰)

تم بہترین امت ہو جو لوگوں کے لیے برپا کیے گئے ہو، نیکی کا حکم دیتے ہو، برائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

انفرادی اصلاح کے ساتھ اسلامی آئیڈیولوجی اجتماعی زندگی کی تعمیر و تشکیل کے لیے بھی واضح ہدایت اور ایک سوچا سمجھا منصوبہ پیش کرتی ہے۔

اس سلسلے میں چند بنیادی اصول ہیں۔ جن پر اسلام نے اپنے معاشرتی پروگرام کو مرتب کرتا ہے۔ اور پھر چند اساسی ادارے ہیں جن کے ذریعہ وہ اس پروگرام کی تنفیذ کرتا ہے۔

اسلام کے معاشرتی نظریہ کی بنیادیں یہ ہیں

۱۔ تمام مسلمان بھائی بھائی ہیں۔ دین کا رشتہ تمام مسلمانوں کو ایک وحدت میں جوڑ دیتا ہے۔ اور یہ رشتہ اتنا قوی ہے کہ اسے دوسرے تمام تعصبات اور عصبیتوں کو مغلوب کر لینا چاہیے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ (الحجرات ۱۰)

وہ لوگ جو اللہ پر ایمان رکھتے ہیں بھائی بھائی ہیں۔

وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا (آل عمران ۱۰۳)

سب مل جل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رہو اور جدا جدا نہ ہو جاؤ۔

۲۔ تمام انسان خدا کی مخلوق ہیں، رنگ زبان، نسل، قبیلہ برادری ملک و قوم کی کوئی تفریق ایسی نہیں ہے جو انسانوں میں اونچ نیچ قائم کرے۔ قرآن کا ارشاد ہے

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ (الحجرات-۱۳)

اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا۔ پھر مختلف قومیں اور مختلف خاندان بنائے تاکہ ایک دوسرے کو شناخت کر سکو۔ اللہ کے نزدیک تم میں سب سے شریف وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہو، اور اللہ خوب جانتا ہے اور خبر والا ہے۔

۳۔ عورت اور مرد معاشرت کے دو ستون ہیں۔ دونوں کی اپنی اپنی شخصیت ہے اور دونوں سماج کے معمار ہیں۔ عورتوں اور مردوں میں قانونی مساوات ہے اور دونوں کے ایک دوسرے پر کچھ حقوق ہیں علاوہ اور مرد کا عام رشتہ بہن بھائی کا رشتہ ہے اور وہ ایک دوسرے کے لیے اس طرح حرام ہیں جس طرح سگے بھائی بہن۔ نکاح وہ طریقہ ہے جس سے یہ ایک دوسرے کے شریک زندگی ہوتے ہیں اور یہی وہ جائز اور

صحت مند رشتہ ہے جس کے ذریعہ ایک دوسرے
کے لیے حلال ہو سکتے ہیں۔ اس رشتے سے خاندان
کی بنیاد پڑتی ہے اور خاندان کے نظام میں دونوں
کو ایک دوسرے پر حقوق حاصل ہیں۔ لیکن شوہر
خاندان کا قوام ہے۔

۴۔ معاشرہ کی عام فضا خیرخواہی، تعاون
اشتراک عمل اور بھائی چارہ کی ہونی چاہیئے۔ لوگ
جب آپس میں ملیں تو ایک دوسرے پر سلامتی
بھیجیں۔ ہر شخص اپنے بھائی کے لیے وہی چاہے
جو وہ اپنے لیے چاہتا ہے۔ غیبت، چغل خوری
کینہ پروری، سوءظن، بے جا حرف گیری سے
سب پرہیز کریں۔ نیکیوں میں ایک دوسرے
سے تعاون کریں۔ بلکہ سبقت لے جانے کی
کوشش کریں۔ اور برائیوں سے ایک دوسرے
کو روکیں۔

وَاَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ
وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْاَرْضِ ۭ اِنَّ
اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ۔ (القصص ۷۷)

اور لوگوں کے ساتھ بھلائی کر جس
طرح اللہ تعالی نے تجھ پر احسان
کیا ہے۔ اور زمین میں فساد کا خواہشمند
نہ بن۔ اللہ تعالی مفسدوں کو پسند نہیں
فرماتا۔

۲۔ اسلامی آئیڈیولوجی ہر فرد میں اجتماعی
ذمہ داری کا تصور پیدا کرتی ہے اور پورے
معاشرہ میں یہ احساس بیدار کرتی ہے کہ وہ نیکیوں
کو قائم کرنے والا۔ برائیوں کو روکنے والا اور
ایک دوسرے کی مدد کرنے والا ہے۔ ایسی
انفرادیت کے لیے جس میں دوسروں کے
حقوق کا خیال نہ رکھا جاتے اور جو اجتماعی تصور
سے ناآشنا بھی ہو، اسلام میں کوئی گنجائش نہیں۔

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں

ان عمومی ہدایات کے بعد اسلام نے انسانوں کے
باہم حقوق و فرائض کا ایک مکمل نظام بھی دیا ہے
جس میں بھائی بھائی کے حقوق اہل خانہ کے
حقوق، رشتہ داروں کے حقوق، اہل محلہ کے
حقوق، غیر مسلمانوں کے حقوق عام انسانوں
کے حقوق حتیٰ کہ جانوروں اور درختوں کے
حقوق تک کو متعین کر دیا ہے تاکہ انسان محض
جذبات کی رو میں بہہ کر ناانصافی کا مرتکب نہ ہو۔
اور معاشرہ صحت مند بنیادوں پر قائم رہے۔

اور برابر ارتقا کرتا ہے۔

معاشرتی اصولوں کو بروئے کار لانے کے لیے اسلام نے کچھ مستقل ادارے بھی قائم کیے ہیں اور ان میں اہم ترین ادارے خاندان، قرابت مثلاً مسجد، معاشرہ عام، مسلم معاشرہ کی روایات، نظامِ تعلیم، نظام حدود و تعزیرات ہیں۔

اسلامی آئیڈیولوجی خود اپنی ایک معاشی پالیسی بھی پیش کرتی ہے۔ قرآن میں معاش کو فضل اللہ کہا گیا اور اس سے ذہن میں یہ بات ڈالی گئی کہ یہ سب خدا کی عنایت سے ہے۔ اسی طرح معاہدہ لکھنے اور سچی گواہی دینے کو تقویٰ قرار دیا گیا اور ناپ تول میں کمی کو ایسا عظیم گناہ کہ اس کی وجہ سے ایک پوری قوم کا تختہ الٹ دیا گیا۔ اس طرح معاشیات اور اخلاق کا گہرا تعلق قائم کیا گیا۔ خدا کی ساری زمین کو انسان کے لیے میدانِ عمل قرار دیا گیا اور انسان کو ترغیب دی گئی کہ وہ زیادہ سے زیادہ جدوجہد اپنی معاش کے حصول کے لیے کرے۔ معاشیات کی اصطلاح میں اسے پیداوار کو بڑھانے کی پالیسی کہہ سکتے ہیں۔

وَلَقَدْ مَكَّنَّاكُمْ فِي الْأَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ (الاعراف - ۱۰)

اور بے شک ہم ہی نے تم کو زمین پر رہنے کی جگہ دی اور اس میں تمہارے لیے سامان معاش پیدا کیے۔

اس بنیادی حقیقت کے اظہار کے بعد اسلام نے انسانوں کو مختلف طریقوں سے محنت، معاشی جدوجہد اور حصول فراخی کی کوشش پر اکسایا ہے اور اس طرح ہر شخص کو فروغ پیداوار کے لیے سرگرم عمل کر دیا ہے۔ اسلامی آئیڈیولوجی کے مثبت معاشی مقاصد ہیں۔ غربت کا انسداد اور تمام انسانوں کو معاشی جدوجہد کے مساوی موقع فراہم کرنا بھی شامل ہے۔ اسلامی آئیڈیلوجی اس بات کی کوشش کرتی ہے کہ سب کو حصولِ رزق کے مواقع دے اور پھر مثبت طور پر ایسی پالیسیاں بنائے جن سے ملک میں غربت و افلاس ختم ہو اور تمام انسانوں کو ان کی بنیادی ضرورتیں لازماً حاصل ہوں۔ اسلام تنگی کو دور کرنے کا طریقہ حصولِ رزق کی کوشش اور پیداوار بڑھانے کے ذرائع کی طرف رجوع کو فرض قرار دیتا ہے۔ اور محض غربت افلاس معیار زندگی کے گرنے کے خطرے اور غلط وسائل کے واویلے سے انسان کشی

ور زندگی کو تلف کرنے کی پالیسی کی اجازت نہیں دیتا۔ معاشی مسئلہ کا حل انسانوں کو کم کرنا نہیں معیشت کو فروغ دینا ہے قرآن کا ارشاد ہے :

وَلَا تَقْتُلُوٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ ۚ اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا (بنی اسرائیل ۳۱)

اور تم اپنی اولاد کو افلاس کے ڈر سے قتل نہ کرو۔ ہم ہی ان کو رزق دیتے ہیں اور تم کو بھی، ان کو مار ڈالنا بڑی خطا ہے

۵۔ اسلام پیداوار کے اضافہ اور معیشت کے ہمہ جہتی پروگرام کی پالیسی اختیار کرتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس بات کی شرط بھی لگاتا ہے کہ آمدنی جائز ذرائع سے حاصل کی جائے گی

يَآ اَيُّهَا النَّاسُ كُلُوا مِمَّا فِي الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا (بقرۃ ۱۶۸)

اے لوگو! جو چیزیں زمین میں موجود ہیں۔ ان میں سے حلال اور پاک چیز کھاؤ۔

طلب حلال اور حرام سے اجتناب کی ہدایت کے ساتھ ساتھ ان چیزوں کی نشاندہی کر دی گئی ہے جو حرام ہیں۔ ان میں سب سے بڑھ کر سود ہے خواہ اس کی کوئی بھی شکل ہو۔ طلب حلال کے ساتھ ساتھ اسلام انسان کو جائز مصارف پر دولت خرچ کرنے کی ترغیب بھی دیتا ہے اور اسراف سے روکتا ہے۔ جس کی وجہ سے دولت کا بے جا استعمال اور اس کا ضیاع ترک ہو جاتا ہے اور وہ تعمیری مقاصد کے لیے استعمال ہونے لگتی ہے۔

كُلُوا وَاشْرَبُوا وَلَا تُسْرِفُوا (الاعراف ۳۱)

کھاؤ پیو مگر اسراف نہ کرو۔

پھر اسلام نے دولت کے احتکار کو بھی پسند نہیں کیا ہے اور اس بات کا انتظام کیا ہے کہ مختلف قانونی اور اخلاقی تدابیر سے دولت کی تقسیم زیادہ سے زیادہ منصفانہ ہو اور پورے معاشرے میں گردش کرے۔

دولت کی تقسیم کے لیے مندرجہ ذیل صورتیں تجویز کی گئی ہیں:۔

۱۔ زکوٰۃ جو ہر صاحب نصاب مسلمان مرد و عورت پر فرض ہے۔

۲۔ صدقہ واجب : جیسے صدقہ فطر وغیرہ

۳۔ انفاق ۴۔ وراثت۔

اس طرح اسلامی آئیڈیولوجی پورے معاشرے

میں دولت کی تقسیم کی کوشش کرتی ہے۔ اسلامی آئیڈیولوجی زمین اور وسائل فطرت کو اصلاً خدا کی دین اور اُس کی ملکیت قرار دیتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ تمام معاشی معاملات میں انسان کو اس عظیم تر ملکیت کے تصور کے تحت انفرادی ملکیت وتصرف کا حق دیتی ہے۔ اور یہی وہ شکل ہے۔ جس میں انسان کی معاشی آزادی محفوظ رہ سکتی ہے لیکن یہ حق غیر محدود نہیں ہے یعنی اگر ملکیت آلۂ ظلم بن جائے یا دوسروں کے حقوق پر اُس کا غلط اثر پڑ رہا ہو تو ریاست کو مداخلت کا حق حاصل ہے اسلام ریاست کے معاشی وظائف کا بھی ایک مثبت تصور پیش کرتا ہے اور سماجی فلاح اور معاشی انصاف کے قیام کو اُس کی اوّلین ذمہ داری قرار دیتا ہے۔ زکوٰۃ ایک سماجی فلاح کی اسکیم ہے جس کا کوئی وارث نہیں اُس کی ریاست وارث ہے۔

السلطان ولی من لا ولی لہ (بخاری)

حکومت ہر شخص کی ولی (دست وگیر ومددگار) ہے جس کا کوئی ولی نہ ہو۔

اسلامی نظریہ سیاست و دین میں کسی دوئی کا قائل نہیں۔ وہ سیاست کے سدھار اور ریاست کے بنیادوں پر قیام کو خود دین کا بنیادی تقاضا سمجھتا ہے خود اللہ تعالیٰ نے قرآن میں نبیؐ کی زبان سے یہ دُعا کرائی ہے کہ واجعل لی من لدنک سلطانا نصیرا... اور اپنی طرف سے ایک اقتدار کو میرا مددگار بنا دے یعنی یا تو مجھے خود اقتدار عطا کر یا کسی کو میرا اور دین کا مددگار بنا دے۔ تاکہ اس کی قوت اور وسائل کے ذریعے زندگی کے حقیقی بگاڑ کو دور کیا جاسکے ہا ریاست خدا اور اس کے رسول کے دیے ہوئے قانون کی پابند ہے۔ اور اس کا اوّلین کام شریعت کو قائم کرنا ہے۔ اسلامی ریاست ہر حیثیت سے خود مختار اور آزاد ریاست نہیں ہے بلکہ وہ شریعت کی پابند ہے اسی لیے اُس کے لیئے خلافت کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے۔

قرآن کا ارشاد ہے:

فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ عَمَّا جَاءَكَ مِنَ الْحَقِّ (المائدہ)

پس تم لوگوں کے درمیان اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ کرو اور اس قانون حق کو چھوڑ کر جو تمہارے پاس آیا ہے لوگوں کے خواہشات کی پیروی نہ کرو۔

اسلامی آئیڈیولوجی اس نقطۂ نظر کو بھی پیش کرتی ہے کہ خلافت کسی خاص فرد، خاندان، گروہ، قبیلہ یا برادری کا حق نہیں بلکہ یہ خلافت تمام مسلمانوں کو حاصل ہے:

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ آمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِی الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ (النور-۵۵)

اللہ نے تم میں سے ان لوگوں کے ساتھ جو ایمان لائے اور اچھے عمل کرتے ہیں وعدہ کیا ہے کہ وہ انہیں زمین میں خلیفہ بنائے گا (یعنی حکومت دے گا) جیسا اس نے اُنہیں خلیفہ بنایا تھا جو اُن سے پہلے تھے۔

خلافت کے اس عمومی نظریہ کا منطقی اور لازمی تقاضا یہ ہے کہ نظام حکومت کو قائم کرنے اور امیر مقرر کرنے کا اختیار عام مسلمانوں (یعنی خلفا) کو ہو صرف وہ حکومت قائم ہے جس کو اُن کا اعتماد حاصل ہو۔ اور اگر وہ ان کا اعتماد کھودے تو اُسے قائم رہنے کا کوئی حق نہ ہو۔

حکومت کے فیصلے ان کے مشورے سے ہوں، کسی شخص یا ادارہ کو ایسے اختیار نہ ہوں جو اس بنیادی خلافت کو ہی بے معنی کر دے، عام مسلمانوں کو آزادی حاصل ہو کہ اپنی مرضی اور اپنے ضمیر کے مطابق اپنی رائے کا اظہار کریں۔ اسلامی آئیڈیولوجی کا تیسرا اصول شورائیت ہے یہ منطقی تقاضا ہے۔ تمام مسلمانوں کے خلیفۃ اللہ ہونے کا اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَیْنَهُمْ

(الشوریٰ ۳۸)

اور ان کے معاملات باہم مشورے سے طے ہوتے ہیں۔

خلافت راشدہ کا نظام اس مشاورت کی بنیاد پر قائم تھا۔ اسلامی آئیڈیولوجی جس ریاست کا تصور پیش کرتی ہے، وہ ایک فلاحی اور خادم خلق ریاست ہے۔ ریاست کا مقصد امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے۔

یہ ریاست بنیادی انسانی حقوق کی ضمانت دیتی ہے اور خدا اور اس رسول کی ضمانت پر اُن کو قائم کرتی ہے۔ ان بنیادی حقوق میں یہ بھی شامل ہیں۔

- جان و مال کی حفاظت اور شریعت کی حدود میں انفرادی ملکیت کا حق۔
- سعی و جہد پیشہ اور کاروبار کی آزادی

- سکونت و نقل و حرکت کی آزادی۔
- اجتماع بندی اور تنظیم بندی کی آزادی۔
- عقیدہ، فکر و خیال اور مذہب کی آزادی۔
- تنقید و محاسبہ کا حق۔

یہ اور دوسرے حقوق فرد کی آزادی کے محافظ ہیں اور اسے دوسرے افراد یا ریاست کی دست درازیوں سے محفوظ رکھتے ہیں۔ ریاست کی حیثیت معلّم کی ہے اور تعلیم کا فروغ اس کی اوّلین ذمہ داری ہے۔ نبی کا اوّلین منصب معلّم کا ہے۔ اس کے جانشین کی حیثیت سے اسلامی ریاست پوری آبادی کے لیے معلّم اور مربّی کا مقام رکھتی ہے۔ خلافت راشدہ کا پورا دور اس پر شاہد ہے۔ اسلامی ریاست کا ایک اور بنیادی مقصد قیام انصاف ہے۔

اسلامی آئیڈیولوجی اطاعت کا بھی ایک واضح اصول دیتی ہے اور وہ یہ ہے:۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ
وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ
مِنْكُمْ فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ
فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ (نساء۔۵۹)

اے لوگو! جو ایمان لاتے ہو اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو اللہ کے رسول کی اور ان اصحاب امر کی جو تم میں سے ہوں اور اگر کسی معاملہ میں تمہارے اور اصحاب امر کے درمیان اختلاف ہو تو لوٹو خدا اور اس کے رسول کی طرف۔

آخری چیز یہ ہے کہ اسلامی آئیڈیولوجی صرف دستور مملکت اور ریاست کی پالیسی کے بنیادی اصول ہی نہیں دیتی، بلکہ یہ ہدایت بھی دیتی ہے کہ قیادت صالحین کی ہونی چاہیے تاکہ وہ اسلام کے اصولوں پر ان کی صحیح اسپرٹ میں عمل کر سکیں۔ اور نظام زندگی کو اس کی برکات سے مالامال کر سکیں۔

اسلامی آئیڈیولوجی صرف سیاست اور اس کے اندرونی مسائل ہی کے متعلق ایک واضح پالیسی نہیں دیتی، بلکہ یہ بھی واضح کر دیتی ہے کہ ملت اور ریاست کے تعلقات دوسرے ممالک اور اقوام سے کن بنیادوں پر استوار ہوں اور اس کا لائحہ عمل کیا ہو۔ یہ آئیڈیولوجی بین الاقوامی تعلقات کے لیے بھی ایک واضح لائحہ عمل دیتی ہے جسے ہم سیاست خارجہ کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

اس سلسلے کا سب سے پہلا اصول یہ ہے:
ملت اسلامیہ اور اسلامی ریاست کی حیثیت پوری دنیا کے سامنے خدا کی شریعت کے علمبردار اور اس کے پیغام کے داعی کی ہے

وطن کی محبت اور اس کے مفاد کا تحفظ اس کی دوسری بنیاد ہے، وطن کی محبت سے مراد یہ ہے کہ ملک اور اس کے بسنے والوں کی حقیقی خیرخواہی، ان کے مفاد کا تحفظ، ان کے حقوق کے لیے جدوجہد اس کے اوّلین فرائض میں سے ہوں گے۔ اسلام کی سیاست خارجہ کا یہ بھی ایک اہم پہلو ہے کہ وہ پوری اُمت مسلمہ کی وحدت کا داعی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ مسلمانوں کی بہت سی ریاستیں ہوں لیکن ان کو اپنی "ایسی دولت مشترکہ" بنانی چاہیے جو ہر حیثیت سے ان کو ایک دوسرے کا معاون و مددگار بنا دے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ (المؤمنون-۵۲)

اور دیکھو! یہ تمہاری اُمت فی الحقیقت ایک ہی اُمت ہے اور میں تم سب کا پروردگار ہوں پس تقویٰ اختیار کرو۔

اسلام فتنہ اور فساد کو ختم کرنے اور امن قائم کرنے کے لیے آیا ہے اور اس کی خارجہ پالیسی کا مقصد امن عالم کا قیام ہوگا۔

وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ (انفال-۶۱)

اگر وہ صلح کی طرف جھکیں تو تو بھی ان کی طرف جھک جا اور اللہ پر بھروسہ رکھو۔

اسلام جغرافیائی حدود کو انسانیت کو مستقل طور پر بانٹنے والی حدود نہیں مانتا۔ وہ ایک عالمی انسانی برادری قائم کرنا چاہتا ہے جو ایک قانون کے تابع اور ایک مرکز سے وابستہ ہو۔

اَلْخَلْقُ عَيَالُ اللّٰهِ فَاَحَبُّ الْخَلْقِ اِلَى اللّٰهِ مَنْ اَحْسَنَ اِلٰى عَيَالِهٖ (بیہقی)

ساری مخلوق عیال اللہ ہے اور اللہ سب سے زیادہ محبت اس سے کرتا ہے اور عیال اللہ کو سب سے زیادہ محبوب رکھتا ہے۔

عہد و پیمان کی پابندی بھی اسلام کی بین الاقوامی پالیسی کا ایک اصول ہے

يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا اَوْفُوْا

باز پرس

امیر المومنین حضرت علیؓ نے اپنے ایک غلام کو آواز دی۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ کئی بار پکارنے پر بھی اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ ایک ملاقاتی اندر آیا اور بتایا کہ جسے آپ پکار رہے ہیں وہ باہر کھڑا ہے آپ کی آواز سن رہا ہے مگر بولتا نہیں جب وہ غلام آیا تو آپ نے پوچھا تو نے میری آواز سنی؟

وہ بولا "سنی تھی"

فرمایا "تو جواب کیوں نہیں دیا"

بولا "مجھے یقین تھا کہ آپ کوئی باز پرس نہیں کریں گے۔ آپؓ نے فرمایا "شکر ہے اس خدا کا جس نے مجھے ایسا پیدا کیا جس سے اس کی مخلوق امن میں ہے (العفو)

بالعقود (المائدہ۔)

اے ایمان والو! اپنے وعدے پورے کرو۔

وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا (بنی اسرائیل ۳۴)

اور دیکھو! عہد کو پورا کرو۔ عہد کے بارے میں تم سے باز پرس کی جائیگی

بین الاقوامی تعلقات میں اسلام بدلہ لینے کو جائز قرار دیتا ہے لیکن یہ لازم کر دیتا ہے کہ بدلہ اتنا ہی لیا جائے جتنا حق ہے اور ذرا بھی زیادتی نہ کی جائے۔

وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا

(شوریٰ۔ ۴)

برائی کا بدلہ اس کے برابر برائی ہو سکتا ہے۔

مندرجہ بالا سطروں میں ہم نے اسلامی آیڈیولوجی کی خصوصیات اور مختلف شعبہائے زندگی کے لیے اس کا لائحہ عمل بیان کیا ہے۔ ان کے مطالعے سے اسلام کی پوری سماجی اور عمرانی سکیم ہمارے سامنے آجاتی ہے اور اس سے ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ اسلام کس قسم کا انسان تیار کرنا چاہتا ہے۔ اور کیسا معاشرہ بنانا چاہتا ہے۔ یہ تعلیمات انسان کے فائدہ کے لیے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ اگر اس آیڈیولوجی پر ٹھیک ٹھیک عمل ہو تو اس کے نتیجہ طور پر اعلیٰ ترین صفات کے انسان پیدا ہوں گے اور دنیا میں بہترین معاشرہ قائم ہوگا

سالم القادری مرحوم
لا الٰہ الا اللہ
دعائے شام و سحر لَا اِلٰہ اِلَّا اللہ
یہی ہے زادِ سفر لا الٰہ الّا اللہ
سکونِ قلب و جگر لَا اِلٰہ اِلَّا اللہ
کمالِ فکر و نظر لَا اِلٰہ اِلَّا اللہ
نہ کہکشاں نہ قمر لَا اِلٰہ اِلَّا اللہ
نہ کچھ اِدھر نہ اُدھر لَا اِلٰہ اِلَّا اللہ
تمام ملتیں باطل ہیں صرف اِک اسلام
یہی ہے راہ گذر لَا اِلٰہ اِلَّا اللہ
اسی میں دولتِ دنیا اسی میں دولتِ دیں
متاعِ اہلِ خبر لَا اِلٰہ اِلَّا اللہ
ملا رہا ہوں نگاہیں میں کج کلاہوں سے
نہ خوف ہے نہ خطر لَا اِلٰہ اِلَّا اللہ
بُتوں کو توڑ تخیّل کے ہوں کہ پتھّر کے
ذرا بھی دیر نہ کر لَا اِلٰہ اِلَّا اللہ

ڈاکٹر عبدالکریم زیدان

اسلامی شریعت میں ریاست کا مقام

تمہید

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اسلامی شریعت محض ایک دینی دعوت ہے جس کا موضوع اخلاق ہے اور اس کی غایت یہ ہے کہ انسان کے تعلق کو اس کے رب کے ساتھ استوار کیا جائے اور بس اس کے علاوہ اسے کسی چیز سے یا حیاتِ انسانی سے جس کا ایک پہلو مملکت اور حکومت بھی ہے کوئی غرض نہیں.... مگر شریعتِ اسلامی کے متعلق یہ خیال صحیح نہیں ہے وہ اسے تسلیم نہیں کرتی اور نہ اس قسم کے کسی تصور کے لیے اس کے اندر کوئی گنجائش ہے۔

شریعتِ اسلامی کے نزدیک ریاست کا قیام مطلوب ہے،

اسلامی شریعت کی ایک اہم خصوصیت اس کی جامعیت ہے۔ زندگی کا کوئی معاملہ ایسا نہیں ہے جس کے بارے میں شریعت انسان کی رہنمائی کرتی ہو، اس میں ہمیں عبادات اخلاق اور عقائد کے پہلو بہ پہلو افراد اور جماعتوں کے باہمی تعلقات کی درستی اور اصلاح کے لیے بھی احکام ملتے ہیں جن کو دیکھ کر انسان پکار اٹھتا ہے کہ بے شک خدائے بزرگ و برتر نے سچ فرمایا ہے کہ:-

• مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتَابِ مِنْ

شَیْئٍ (الانعام: ۳۸)

"ہم نے اُن کی تقدیر کے نوشتہ میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔"

شریعتِ اسلامی کی اس وسعت و ہمہ گیری کی موجودگی میں ناممکن تھا کہ یہ مملکت اور حکومت کے بارے میں خاموش رہتی۔ حکومت اور نظامِ حکومت کے بارے میں کسی طرح کی کوئی رہنمائی نہ دیتی! اسلامی شریعت میں شورائیت کے اصول، حکام کی ذمہ داری، نیکی کے کاموں (معروف) میں اُن کی اطاعت، صلح و جنگ اور بین الاقوامی معاہدات اور اسی طرح حکومت کے بہت سے دوسرے اعمال کے متعلق جو اصول اور قوانین ملتے ہیں وہ یہ بتانے کے لیے کافی ہیں کہ شریعتِ اسلامی اُن سب کی جامع ہے۔

اسی طرح احادیثِ نبویؐ میں ہمیں امیر، امام اور سلطان وغیرہ الفاظ عام ملتے ہیں۔ یہ سب الفاظ اس مرکزِ اختیارات کے لیے آتے ہیں جو فرمانروائی اور غلبے کی صفات سے متصف ہو یعنی اس سے مراد حکومت ہے اور ظاہر ہے کہ حکومت مملکت کے اجزائے ترکیبی میں سے ایک بڑا جز ہے۔ ہم نے اوپر قرآن و حدیث کے جن احکام کی طرف اشارہ کیا ہے وہ ہم سب کے لیے واجب تعمیل ہیں، اور ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنی زندگیوں کو اُن کے مطابق ڈھالیں کیونکہ خدا نے اپنے رسولؐ پر وحی کے ذریعے احکام اس لیے نہیں بھیجے کہ اُن کی محض تلاوت کر لی جائے۔ وحی الٰہی کا منشا یہ ہے کہ اُسے سمجھ کر پڑھا جائے اور اُسے عملی زندگی میں جاری و ساری کیا جائے، اور یہ کام اسی طرح ممکن ہے کہ شریعت کی رہنمائی میں اُس کی مطلوب ریاست کا قیام عمل میں لایا جائے!

احکامِ اسلامی کی تنفیذ کے لیے ریاست کا وجود ناگزیر ہے

شریعتِ اسلامی میں یہ جو تعزیرات کے احکام ہیں خدا کی نازل کردہ ہدایت کی روشنی میں انسانوں کے معاملات طے کرنے پر زور ہے، خدا کے راستے میں جہاد کی تلقین ہے اور اسی طرح کے اور بہت سے احکام ملتے ہیں وہ سب کے سب ایسے ہیں جن کے عملی نفاذ کے لیے ایک ایسی ریاست کا ہونا ضروری ہے جس کا افراد پر اقتدار اور غلبہ ہو۔ ان احکام کو اگر لوگ انفرادی طور پر نافذ کرنا چاہیں تو بھی نہیں کر سکتے۔ امام ابن تیمیہؒ نے اپنے اس قول میں اسی حقیقت کی طرف توجہ دلائی ہے۔

"انسانوں کے معاملات کی تنظیم دین کے سب سے بڑے واجبات میں سے ہے بلکہ خود دین کا قیام بھی اسی طرح ممکن ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اور مظلوم کی امداد کا جو حکم دیا ہے اور وہ تمام احکام جو جہاد، عدل اور حدود اللہ کے قیام سے متعلق ہیں اُن پر قوت اور امارت کے بغیر عمل کرنا ممکن نہیں ہے[1]۔"

اس سے معلوم ہوا کہ شریعت کے احکام کے نفاذ کے لیے اسلامی ریاست کا قیام ضروری ہے۔

اسلامی ریاست۔ بندگیٔ رب کا تقاضا!

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے۔ چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:۔

• وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ (الذاریات: ۵۶)

" میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے۔"

اس آیت میں عبادت کا لفظ بہت جامع مفہوم کا حامل ہے۔ اور اس میں انسان کے وہ تمام ظاہری و باطنی اقوال وافعال شامل ہیں جو خدا کے ہاں مقبول و محبوب ہیں[2]۔

عبادت کے اس وسیع مفہوم کی روشنی میں انسان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی زندگی، اپنے اقوال، افعال، اختیارات اور انسانی تعلقات کو شریعت اسلامی کی منشاء کے مطابق بنائے مگر ایسا کرنا کسی فردِ واحد کے دائرہ قدرت سے باہر ہے۔ وہ اگر چاہے تب بھی انفرادی طور پر شریعت کا یہ منشاء پورا نہیں کر سکتا۔ اس کے لیے ایک منظم معاشرے کا ہونا ضروری ہے جو اسلامی رنگ میں رنگا ہوا ہو اور جس کے اندر رہ کر انسان کے لیے اپنی زندگی کو اسلامی شریعت کے تقاضوں کے مطابق ڈھالنا آسان ہو۔ کیونکہ انسان ماحول کی مخلوق ہے اور وہ اپنے ماحول سے لازماً متاثر ہوتا ہے۔ ماحول کے اس خارجی تاثر کے نتیجے میں وہ نیکی اور خیر کو بھی اختیار کر سکتا ہے اور گمراہی اور شر کی پگڈنڈیوں میں بھی گم ہو سکتا ہے۔ ہماری اس بات کی تائید اس حدیث نبویؐ سے بھی ہوتی ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ:۔

---

[1] ملاحظہ ہو "السیاسۃ الشرعیۃ" امام ابن تیمیہ ص ۱۶۲، ۱۶۳

[2] ملاحظہ ہو "فتاویٰ ابن تیمیہؒ" ج ۱ ص ۴۰۴ اور اس کے بعد کا حصہ۔

"ہر پیدا ہونے والا بچہ نیکی کی فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔ اس کے بعد اس کے ماں باپ اسے یہودی بنا دیتے ہیں یا نصرانی یا مجوسی۔"

اس کی مثال ویسی ہے جیسے کہ مویشی جو بچہ دیتے ہیں وہ صحیح سالم ہوتا ہے۔ ان میں کوئی نکٹا یا کنکٹا نہیں ملتا۔ پھر تم لوگ اُن کے ناک کان کاٹتے ہو۔[1] بچے کے لیے پہلے چھوٹا سا معاشرہ اُس کے والدین ہوتے ہیں جو اگر خود گُم کردہ راہ ہوں تو اُس بچے کو بھی گمراہی اور ضلالت کے اندھیروں میں بھٹکا دیتے ہیں اور اُسے اُس کی فطری روش سے منحرف کر دیتے ہیں جس کا شعور وہ خدا کے ہاں سے لے کر آتا ہے، لیکن اگر دوسری صورت ہو اور اُس کے والدین صالح اور نیک ہوں تو بچہ اپنی اصل فطرت کے مطابق پھلتا پھولتا ہے اور خیر اور نیکی کی منازل طے کر جاتا ہے۔ قرآنِ کریم بھی اس حقیقت کی طرف توجہ دلاتا ہے کہ بگڑے ہوئے معاشرے میں اسلام کے احکام بجا لانا اور اسلام کے مطابق زندگی گزارنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ چنانچہ مسلمان کا فرض ہے کہ وہ ایسے معاشرے کو چھوڑ کر ہجرت کر جائے۔

إِنَّ الَّذِينَ تَوَفَّاهُمُ الْمَلَائِكَةُ ظَالِمِي أَنفُسِهِمْ قَالُوا فِيمَ كُنتُمْ قَالُوا كُنَّا مُسْتَضْعَفِينَ فِي الْأَرْضِ قَالُوا أَلَمْ تَكُنْ أَرْضُ اللَّهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوا فِيهَا فَأُولَئِكَ مَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ وَسَاءَتْ مَصِيرًا

(النساء: ۹۷)

"جو لوگ اپنے نفس پر ظلم کر رہے تھے اُن کی روحیں جب فرشتوں نے قبض کیں تو اُن سے پوچھا کہ یہ تم کس حال میں مبتلا تھے؟ انہوں نے جواب دیا کہ ہم زمین میں کمزور و مجبور تھے۔ فرشتوں نے کہا کیا خدا کی زمین وسیع نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کرتے؟ یہ وہ لوگ ہیں جن کا ٹھکانا جہنم ہے اور بڑا ہی بُرا ٹھکانا ہے۔"

اس آیت کی تفسیر بیان کرتے ہوئے علامہ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں: "یہ عمومی آیت ان تمام لوگوں کے بارے میں ہے جو ہجرت کر جانے کی قدرت رکھنے کے باوجود مشرکین کے درمیان قیام پذیر ہے درآنحالیکہ وہ وہاں دین کی اقامت سے عاجز تھے

---

[1] المنتخب من السنۃ ص ۲۹۱۔

ایسے سب لوگ اپنے نفوس پر ظلم ڈھاتے رہے اور اس بات پر اجماع ہے کہ انہوں نے حرام کا ارتکاب کیا۔ؔ

اس سے ظاہر ہے کہ اگر بنیادی طور پر معاشرہ اسلامی نہ ہو جس میں افراد کے لیے اسلامی طرز زندگی کو اپنانا سہل ہو اور مختلف عبادات کی صورت میں اُن کی تکمیل ذات کے لیے ایک صالح ماحول موجود ہو تو انسان اسلام کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق زندگی بسر کر سکتا ہے اور نہ شریعت کے وضع

لوگوں کو اسلام کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق زندگی بسر کرنے کی سہولتیں فراہم کرنا اور اپنے زیر اثر تمام شعبوں میں اسلامی احکام کو نافذ کرنا بھی اسلامی ریاست کی ذمہ داری ہے۔

کردہ اصولوں کی روشنی میں دوسرے انسانوں سے اپنے تعلقات قائم رکھ سکتا ہے۔

اس قسم کے اسلامی معاشرے کو محض وعظ و تلقین سے وجود میں نہیں لایا جا سکتا۔ اس کا قیام ایک ریاست کے ذریعے ہی ممکن ہے جو کسی معاشرے کو جس رنگ میں چاہے ڈھالنے کی قدرت رکھتی ہے۔ اور پھر اس کی سلامتی و تحفظ کی ضامن بنتی ہے اور اسے تخریب و فساد سے بچاتی ہے۔ یہ کام ریاست

اور صرف ریاست ہی کر سکتی ہے۔ مقتدر اور باقوت ریاست! اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ وَأَنْزَلْنَا الْحَدِيدَ فِيهِ بَأْسٌ شَدِيدٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللَّهُ مَنْ يَنْصُرُهُ وَرُسُلَهُ بِالْغَيْبِ۔ (الحدید:- ۲۵)

"ہم نے اپنے پیغمبروں کو کھلے کھلے احکام دے کر بھیجا اور ہم نے اُن کے ساتھ کتاب اور میزان کو اتارا تاکہ لوگ عدل پر قائم رہیں اور ہم نے لوہے کو پیدا کیا جس میں شدید ہیبت ہے اور لوگوں کے اور فائدے ہیں تاکہ اللہ جان لے کہ بے دیکھے اُس کی اور اُس کے رسولوں کی کون مدد کرتا ہے۔"

ؔ تفسیر ابن کثیر ج ۱ ص ۵۴۲

جن لوگوں کو کتاب کی ہدایت سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا انہیں لوہا، یعنی سیاسی قوت۔ خرابی پیدا کرنے اور گمراہی پھیلانے سے باز رکھتی ہے۔ کیونکہ کسی شخص کو یہ حق نہیں دیا جاسکتا کہ وہ کشتی میں چھید کر کے اس میں سوار سب لوگوں کو تباہی کے حوالے کر دے۔ معاشرت کو تخریب اور انحراف کی تباہ کاریوں سے تحفظ دینے والی فعال قوت صرف ریاست کی قوت ہے۔ حضرت عثمانؓ کا قول ہے:۔

"اللہ تعالیٰ جن باتوں کا سد باب قرآن سے نہیں کرتا اُن کا انسداد وہ قوت سے کرتا ہے۔"

رسول کریمؐ نے اسلامی ریاست کا نقشہ پیش کیا ہے

اسلامی شریعت صرف ایک ریاست کے قیام کی متقاضی ہے بلکہ اس کے قیام کا حکم دیتی ہے۔ چنانچہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے کام کا آغاز اسلامی ریاست کے قیام کے لیے ضروری منصوبہ بندی اور تیاری سے کیا۔ بیعت عقبہ ثانی، جو آپؐ کے مکہ سے مدینے کو ہجرت سے قبل ہوئی۔ اس کا سرِ آغاز ہے۔ سیرت کے مصنفین نے اس عظیم الشان بیعت کی جو تفصیلات بیان کی ہیں ان کے مطابق مدینے کے مسلمانوں کا وفد، جن میں تہتر مرد اور دو عورتیں شامل تھیں، مکہ کے پاس ایک مقام پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملا اور آپ کا ساتھ دینے کا وعدہ کیا۔ اس تاریخی ملاقات کے خاتمے پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے خطاب کیا اور انہیں اطاعتِ خداوندی کی تلقین کی۔ اس کے بعد وفد کے اراکین میں سے بعض حضرات نے اظہار خیال کیا اور ایک بات یہ کہی کہ "اے اللہ کے رسول! ہم آپ سے کن باتوں کی بیعت کریں؟" آپ نے فرمایا: "تم مجھ سے اس بات پر بیعت کرو کہ اچھے اور بُرے ہر حال میں تم میری بات سنو گے اور اطاعت کرو گے اور نیکی کا حکم دو گے اور برائی سے روکو گے اللہ کے مقابلے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پروا نہیں کرو گے اور اس بات پر کہ تم میری مدد کرو گے اور جب میں تمہارے پاس چلا جاؤں تو تم میری حفاظت اسی طرح کرو گے جس طرح تم اپنی جانوں کی اور بیوی بچوں کی حفاظت کرتے ہو اس کے بدلے میں تمہیں جنت ملے گی۔" اس پر وہ اُٹھ کھڑے ہوئے اور جو باتیں آپؐ نے بتائی تھیں ان سب پر آپؐ سے بیعت کر لی۔[1]

حاشیہ اگلے صفحہ پر

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مدینے کے مسلمانوں کی یہ بیعتِ اولیں اسلامی ریاست کے قیام کی تمہید تھی اور اس بات کا واضح اعلان کہ ان مسلمانوں نے جس ریاست کے قیام کا وعدہ کیا ہے اس میں بالادستی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہوگی اور وہ سب ان کی اطاعت کے پابند ہوں گے۔ سمع و طاعت کا عہد کر کے انہوں نے یہ اقرار کیا کہ نئی ریاست کے چلانے میں وہ رسول اکرمؐ کی مرضی پر چلیں گے اور اگر اس نئے معاشرے یعنی ریاست کی سلامتی کو کوئی خطرہ لاحق ہوا تو اس کا دفاع کریں گے اور اگر اس نظام نو یا بالفاظِ دیگر قانونِ اسلامی کی بالادستی کو چیلنج کیا گیا تو اس کی حفاظت کے لیے لڑیں گے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قول "وعلی الامر بالمعروف والنھی عن المنکر" یعنی نیکی کے حکم اور بدی سے روکنے پر بیعت کا مفہوم یہی ہے۔!

دنیا کی پہلی اسلامی ریاست

مدینے کو ہجرت سے پہلے آنحضورؐ نے اپنے صحابہؓ کو ہجرت کا حکم دیا اور فرمایا: "خدائے بزرگ و برتر نے تمہیں لیے بھائی دیئے اور ایک ایسا گھر دیا ہے جہاں تم امن سے رہ سکو گے۔"[1] پھر جب آپؐ مکہ سے مدینہ تشریف لے گئے اور وہاں آپؐ کو ذرا سکون نصیب ہوا اور آپؐ اپنی مسجد تعمیر کر چکے تو آپؐ نے مہاجرین اور انصار کو ایک عہد نامے کا پابند بنایا جس میں اہلِ یہود کو بھی صلح و آشتی کی پیش کش کی گئی تھی اور ان کو اپنے دین پر قائم رہنے اور اپنے اموال کی ملکیت قائم رکھنے کا حق دیا گیا تھا۔ اس میں اگر ایک طرف انہیں بعض سہولتیں دی گئی تھیں تو دوسری طرف انھیں بعض باتوں کا پابند بھی بنایا گیا تھا۔[2] یوں دنیا کی پہلی اسلامی ریاست وجود میں آئی۔

اس ریاستِ اسلامی کے پہلے سربراہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم خود تھے اور یہودیوں سے آپؐ نے جو معاہدہ کیا اس میں آپؐ کی یہی سیاسی حیثیت کارفرما تھی جو مدینے کی نئی اسلامی ریاست کے سربراہ کے طور پر آپؐ کو حاصل تھی۔ اس کے بعد آپؐ اسلامی ریاست کے داخلی معاملات کی اصلاح کی جانب متوجہ ہوئے اور آپؐ نے مہاجرین اور انصار کے مابین اخوت کا رشتہ استوار کیا، جس کے نتیجے میں وہ ایک دوسرے کے مال و جائیداد کے وارث قرار

---

[1] البدایہ والنہایہ: امام ابن کثیر جلد ۱، صفحہ ۱۵۹۔ سیرت ابن ہشام جلد ۲ صفحہ ۴ اور امتاع الاسماع مصنفہ مقریزی کی صفحہ ۳۵۔

[2] سیرۃ ابن ہشام جلد ۲ صفحہ ۱۱۸

پہلے۔ یہاں تک کہ شریعت کے قانونِ وراثت نے اس کو منسوخ کر دیا[1]۔

ریاست کے اجزائے ترکیبی

جدید قانون کی زبان میں ریاست کی تعریف یہ کی جاتی ہے کہ: "یہ افراد کے اس منظم اجتماع کا نام ہے جو ایک خاص قطعۂ زمین پر آباد ہو اقتدار کا حامل ہو اور اپنی ایک معنوی شخصیت رکھتا ہو[2]۔"

اس تعریف سے ریاست کے مندرجہ ذیل عناصر ترکیبی سامنے آتے ہیں:

۱۔ انسانوں کا اجتماع
۲۔ ایک مخصوص نظامِ غالب
۳۔ ایک مقررہ خطۂ زمین
۴۔ اقتدارِ اعلیٰ
۵۔ معنوی شخصیت یا انفرادیت

ریاست کی اس تعریف کی روشنی میں جب ہم مدینہ کی اسلامی ریاست پر نظر ڈالتے ہیں تو اس میں یہ سب عناصر مل جاتے ہیں وہاں انسانوں کا ایک اجتماع موجود تھا جو کہ اولین مہاجرین و انصار کے اشتراک سے وجود میں آیا تھا۔ شریعت اسلامی کی صورت میں وہ نظام غالب بھی موجود تھا جو اس اجماع کے اصول و قواعد کے بارے میں رہنمائی دیتا تھا اور مدینہ منورہ وہ خطۂ زمین تھا جسے یہ شرف حاصل ہوا کہ وہاں پر اولین اسلامی ریاست قائم ہوئی۔ اللہ کا رسولؐ خود اس اولین اسلامی ریاست کا سربراہ تھا اور اس نے اپنی اس حیثیت میں ریاست کے تمام معاملات اور مصالح کی نگرانی و رہنمائی کی۔ رہ گئی اس اولین اسلامی ریاست کی معنوی شخصیت تو اس کی موجودگی سے کون انکار کر سکتا ہے۔ سربراہِ مملکت کی حیثیت سے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو متعدد معاہدات کیے اس میں آپؐ محض اپنی شخصی حیثیت میں ایک فریق نہیں تھے بلکہ بحیثیت مجموعی پوری ریاست کی شخصیت (معنوی) کی علامت تھے۔ اسی لیے آپؐ کے کیے ہوئے معاہدوں کی پابندی اسلامی ریاست پر واجب ٹھہری۔

رسول اللہؐ کی دو حیثیتیں

مدینے میں اسلامی ریاست کے قیام کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بیک وقت دو حیثیتیں حاصل ہو گئیں۔ آپؐ کی ایک حیثیت یہ تھی کہ آپؐ خدا کے

---

[1] البدایۃ النہایۃ ابن کثیر جلد ۳۔ صفحہ ۲۲۴۔
[2] ملاحظہ ہو ڈاکٹر مصطفیٰ کامل کی عربی کتاب شرح القانون الدستوری صفحہ ۲۵۔

فرستادہ نبی تھے۔ چنانچہ آپ نے اپنی اس حیثیت میں خدا کا پیغام انسانوں تک پہنچایا۔ دوسری طرف آپ اسلامی ریاست کے رئیسِ اعلیٰ اور عدالتِ اعلیٰ بھی تھے۔ قوتِ نافذہ اور قوتِ قضائیہ دونوں کا مرکز آپ کی ذات تھی۔ آپ انتظامیہ کے نگراں تھے اور عدلیہ کے سربراہ بھی، منصبِ نبوت کی ذمہ داریاں اُن پر مستزاد تھیں۔

فقہاء کے نزدیک آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں اُن مختلف حیثیات کا اجتماع ایک متفق علیہ مسئلہ ہے۔ چنانچہ ان فقہاء نے آپ کی ان مختلف حیثیتوں کے پیشِ نظر آپ کے احکام و فرامین میں فرق کو جس طرح بیان کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بہ حیثیت نبی کے آپ نے انسانوں کو جو باتیں بتائی ہیں اُن کی پابندی سب پر لازم ہے مگر اسلامی ریاست کے سربراہ کی حیثیت میں آپ نے وقتاً فوقتاً جو احکام دیئے ہیں اُن پر عملدرآمد موجود الوقت اسلامی ریاست کے سربراہ کی اجازت کے بغیر جائز نہیں ہے اسی طرح قاضی کی حیثیت سے آپ نے مختلف اوقات میں جو مختلف فیصلے دیے اُن پر بدون وقت کی اسلامی عدالت کی اجازت کے عمل جائز نہیں۔ اسلامی احکام کی یہ مختلف حیثیات ہی فقہ میں اجتہادی اختلافات کا سبب بنی ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی حکم نبی کی حیثیت سے دیا ہے یا محض قاضی اور اسلامی ریاست کے سربراہ کی حیثیت سے کوئی فیصلہ صادر کیا ہے؟ فقہاء نے اس سوال کے مختلف جوابات دیئے ہیں اسی لیے اُن کے استنباط کے نتائج بھی مختلف نظر آتے ہیں۔ مثال کے طور پر بنجر زمین کو آباد کر کے اُس کی ملکیت کا سوال ہے۔ اس کے متعلق سبھی اپنے استدلال کی بنیاد اس حدیث پر پر رکھتے ہیں۔

مَنْ اَحْیَا اَرْضًا مَیِّتَۃً فَھِیَ لَہٗ —
"جس کسی نے کوئی بنجر زمین آباد کی وہ اُسی کی ہے۔"

لیکن اس کے باوجود اُن کے استنباطی نتائج مختلف ہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ایک فتوے اور عام حکم کی حیثیت رکھتا ہے اور اُس کی رُو سے ہر اُس شخص کو جو کسی بنجر زمین کو آباد کرے اُس پر قبضہ کرنے کی اجازت دی گئی ہے خواہ امام وقت یعنی رئیسِ مملکت اُسے ایسا کرنے کی اجازت دے یا نہ دے۔ یہ امام مالکؒ اور امام شافعی کا قول ہے۔ بعض دوسرے فقہاء کے نزدیک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی پیغمبرانہ حیثیت میں

نہیں بلکہ اسلامی ریاست کے سربراہ کی حیثیت سے بنجر زمین آباد کرنے والوں کو ان پر قبضے کی اجازت دی تھی اس لیے اب کسی شخص کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ اسلامی حکومت کی اجازت کے بغیر کسی ویران زمین کو آباد کر کے اُس پر قبضہ جما کر بیٹھ جائے۔ یہ امام ابوحنیفہؒ کا مسلک ہے! اسی طرح آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک اور قول ہے جس میں آپ نے ابوسفیان کی بیوی سے کہا: اپنی اور اپنے بیٹے کی ضروریات کے لیے ابوسفیان کے مال میں سے معروف طریقے کے مطابق لے لو۔" بعض فقہاء اس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک عمومی حکم قرار دیتے ہیں جس میں آپ نے ہر شخص کو گویا یہ حق عطا فرما دیا ہے کہ اُسے جب موقع ملے دوسروں کے اموال میں سے اپنا حق وصول کر لے۔ خواہ اصل مالکوں کو اس کا علم ہو یا نہ ہو۔ امام شافعیؒ کا مذہب یہی ہے مگر دوسرے فقہاء کو اس سے اختلاف ہے کیونکہ اُن کا خیال ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فیصلہ ایک قاضی کی حیثیت سے دیا تھا اس لیے اب حکومت کے مقرر کردہ قاضی کے فیصلے کے بغیر خود ہی لوگوں کے مالوں میں سے اپنا حق وصول کرتے پھرنا کسی کے لیے بھی جائز نہیں ہے۔[1]

فقہی اصطلاح میں دارالاسلام اسلامی ریاست کا نام ہے

فقہائے اسلام اسلامی ریاست کو دارالاسلام کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ جس میں جدید قانون کے مطابق ریاست کی تمام خصوصیات موجود ہیں۔ فقہاء نے دارالاسلام کی جو مختلف تعریفیں کی ہیں انہیں اس کے ثبوت میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ ان تعریفوں میں سے بعض میں دارالاسلام کے بعض پہلوؤں پر زور ہے اور بعض میں کچھ اور پہلو نمایاں ہیں۔ مثال کے طور پر ایک تعریف یہ کی گئی ہے کہ "دارالاسلام اس مقام کا نام ہے جہاں مسلمانوں کو غلبہ حاصل ہو"[2]

اس تعریف میں اقتدار اور رقبہ کے اجزاء نمایاں ہیں اور ریاست کے باقی عناصر۔ جیسے آبادی اور نظام حکومت ۔ اُن کے اندر مضمر ہے کیونکہ ظاہر ہے

اللہ تعالیٰ کے قانون کی روشنی میں فرد اور معاشرے دونوں کی بہتری کا راز ہے

---

[1] الفروق — للقرافی جلد ۱، صفحہ ۲۰۷، ۲۰۸

[2] شرح السیر الکبیر مصنفہ سرخسی جلد ۱، صفحہ ۱۸

جہاں مسلمان آباد ہوں گے وہ لامحالہ اسلامی قانون پر ہی عمل پیرا ہوں گے۔ بعض فقہاء کے نزدیک دارالاسلام سے وہ علاقہ مراد ہے جہاں مسلمانوں کی قوت اور اقتدار کے نتیجے میں اسلامی شعار نمایاں ہوں۔[1] اس تعریف میں ریاست کے نظامِ حکومت اور اقتدار پر زور ہے اور آبادی اور رقبہ جیسے ریاست کے دوسرے اجزا کو مبہم چھوڑ دیا گیا ہے۔

یہاں پر یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ اسلامی ریاست کے ضمن میں جب آبادی کا ذکر آتا ہے تو اُس سے محض مسلمان آبادی مُراد نہیں ہوتی بلکہ اُس کے اندر غیر مسلم آبادی بھی شامل ہوتی ہے۔ اس کی تصریح میں فقہاء کا یہ قول موجود ہے کہ "ذمی۔ غیر مسلم آبادی۔ بھی دارالاسلام کی آبادی میں شمار ہوتی ہے"[2] یہی نہیں بلکہ دارالاسلام کے قیام کے لیے آبادی کا مسلمان ہونا سرے سے ضروری ہی نہیں ہے اس کے لیے اُس کے حاکم کا مسلمان ہونا اور اُس کا اسلامی نظام پر عامل ہونا کافی ہے۔ چنانچہ امام الرافعی کا قول ہے "دارالاسلام کے لیے اس میں مسلمانوں کا ہونا کوئی شرط نہیں ہے بلکہ اُس کے وجود میں آنے کے لیے یہ بات کافی ہے کہ اس کی زمامِ اختیار ایک امام اور اسلام کے ہاتھ میں ہو"[3]

اسلامی ریاست کا مزاج اور اُس کے مقاصد

اسلامی ریاست ایک نظریاتی مملکت ہے جو اسلامی عقیدے اور اصول و احکام کی اساس پر وجود میں آتی ہے۔ یہ کوئی محدود علاقائی ریاست نہیں ہے جو مخصوص جغرافیائی سرحدوں کی پابند ہو اور نہ یہ محدود معنوں میں کوئی نسلی ریاست ہے کہ جو کسی خاص قوم یا نسل پر مشتمل ہوتی ہے بلکہ جیسا کہ ہم نے پہلے عرض کیا ہے یہ ایک نظریاتی مملکت ہے اور اپنے نظریے کی طرح اس کی حدود بھی وسیع اور لامحدود ہوتی ہیں اور اُس کے ساتھ ساتھ پھیلتی چلی جاتی ہیں اُس کے اندر رنگ، نسل اور علاقے کے امتیازات کے لیے کوئی جگہ نہیں ہو سکتی۔ اسلامی ریاست کا یہی وہ مزاج ہے جو اُسے ایک عالمی ریاست بناتا ہے جس میں مختلف قوموں اور نسلوں کے لوگ مل جل کر رہتے ہیں اُن میں سے جو چاہے وہ کسی وقت بھی اس ریاست کے اساسی نظریے یعنی اسلام کو قبول کر کے اُس کے عقیدے اور نظام کے

---

[1] شرح الازھار۔ جلد ۵۔ ص ۵۷۱، ۵۷۲۔ [2] بدائع الصنائع۔ مصنفہ کاسانی جلد ۵۔ ص ۲۸۱ مصنفہ سرخسی جلد ۱ ۸۱ اور المغنی جلد ۵۔ ص ۵۱۶۔ [3] فتح العزیز جلد ۰ ص ۱۵۔

محافظوں کی صف میں شامل ہو سکتا ہے۔ اگر کسی وجہ سے وہ ایسا کرنے پر تیار نہ ہو تو بھی وہ اسلامی ریاست کے قانون کے تحت آرام سے زندگی گزار سکتا ہے۔ ریاست اس کے مذہب اور عقیدے کی آزادی میں کسی طرح کوئی مداخلت نہیں کرتی۔

جہاں تک اس اسلامی ریاست کے مقاصد کا تعلق ہے وہ اس کے بنیادی مزاج کا منطقی نتیجہ ہیں۔ نظریۂ اسلامی کی اساس پر اس کا قیام مقتضی ہے کہ اس کے مقاصد خود اسلام کے مقاصد کا عکس ہوں۔ اس کا مقصد قیامِ امن اور افرادِ انسانی کے لیے فلاح و اطمینان کا حصول ہی نہیں ہے۔ یہ ان کی جان کی حفاظت اور انہیں ظلم و زیادتی سے بچانے کو ہی کافی نہیں سمجھتی بلکہ ریاست کے تمام اعمال و دوائر میں اسلامی احکام کی تنفیذ اور دنیا بھر میں دعوتِ اسلامی کی تبلیغ بھی لازمی خیال کرتی ہے اور ایسا کرنا اس کے بنیادی مقاصد میں شامل ہے۔ اس کا فرض ہے کہ لوگوں کو اللہ کی عبادت اور اسلام کے سکھائے ہوئے طریقے کے مطابق زندگی گزارنے کے قابل بنائے اور اس سلسلہ میں ان کی راہ میں جو مشکلات حائل ہوں انہیں دور کرے اور اگر افکار و نظریات اور معاشرتی اور اقتصادی نظام میں کوئی خلافِ اسلام چیز پائی جائے تو اسے ختم کرے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :-

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ (الحج، ۴۰)

"یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اگر ہم زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں گے۔ زکوٰۃ دیں گے، معروف کا حکم دیں گے اور منکر سے منع کریں گے اور تمام معاملات کا انجام کار اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

اس آیت میں اقامتِ صلوٰۃ کا ذکر ریاست کے اس فرض کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ لوگوں کو خدا کی عبادت کے قابل بنانا ریاست کا فرض ہے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر یعنی نیکی کا حکم اور بدی سے روکنے کی ہدایت اشارہ کر رہی ہے کہ لوگوں کو اسلام کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق زندگی گزارنے کی سہولتیں فراہم کرنا اور اپنے زیرِ اثر تمام شعبوں میں اسلامی احکام کو نافذ کرنا بھی اسلامی ریاست کی ذمہ داری ہے۔

یہ ہیں ایک اسلامی ریاست کے مقاصد۔ ان کا بنیادی ہدف اللہ تعالیٰ کے قانون کی روشنی میں فرد اور معاشرے دونوں کی بہتری اور فلاح ہے۔ فرد کی دنیاوی اور اُخروی فلاح بھی ریاست کی اسی ذمہ داری کا ایک حصہ ہے۔

شریعت اور انسانی قوانین

سید شفیق الحسن

ساری تعریف اللہ کے لیے ہے جس نے انسان کو قلم کے ذریعہ تعلیم دی اور وہ علم سکھایا جسے وہ جانتا نہ تھا اور درود و سلام نبی کریم پر جنہیں اللہ تعالٰے نے تمام انسانوں کے لیے پیغمبر اور معلم بنایا۔ آپ لوگوں کو اللہ کی طرف بلاتے اور بار بار اللہ تعالٰی کا یہ قول یاد دلاتے تھے کہ

لَقَدْ جَاءَكُم مِّنَ اللهِ نُورٌ وَّ كِتَابٌ مُّبِينٌ يَهْدِي بِهِ اللهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهُ سُبُلَ السَّلَامِ وَيُخْرِجُهُم مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ بِإِذْنِهِ وَيَهْدِيهِمْ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ

"اللہ کی طرف سے تمہارے پاس نور اور روشن کتاب آگئی ہے۔ اللہ اُن لوگوں کو جو اس کی رضا کی پیروی کرنا چاہیں اس کتاب کے ذریعے سلامتی کی راہیں دکھاتا ہے ان کو تاریکیوں سے نکال کر اپنے اذن سے نور کی طرف لاتا ہے اور اُن کو صراطِ مستقیم کی ہدایت کرتا ہے۔"

یہ ہدایت عبارت ہے ان مبادی اور نظریات سے جن کو لے کر قرآن نازل ہوا اور جن کی تعلیم رسول کریمؐ نے ہمیں دی۔ اس کو ہم اسلامی شریعت کہتے ہیں۔ یہ شریعت ایک عالمگیر شریعت ہے

یہ عرب و عجم سب کے لیے ہے۔ یہ مشرق کے لیے بھی ہے اور مغرب کے لیے بھی۔ یہ سماج کے لیے بھی ہے اور ریاست کے لیے بھی۔ یہ ایک عالمگیر بین الاقوامی شریعت ہے جس کا خواب تو مفکرین نے دیکھا ہے لیکن اس کے خدوخال کو حیطۂ تخیل میں نہ لا سکے۔

قل یاایھا الناس انی رسول اللہ الیکم جمیعا (الاعراف ۱۵۸)

"کہیے کہ اے آدم کی اولاد میں تم سب کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں۔"

یہ شریعت مشتمل ہے۔ عقائد و عبادات کے احکام اور اُن احکام پر جن کے ذریعہ معاشرہ اور ریاست کی تنظیم ہوتی ہے۔ یہ احکام معاملات تعزیرات اور دستوری سفارشات اور قوانین پر مشتمل ہیں۔ اس طرح اسلام مسجد و ایوانِ حکومت اور عبادت و قیادت سب کو اپنے دائرے میں لے کر اُن میں امتزاج پیدا کرتا اور دین دنیا تفریق مٹاتا ہے اور اس کی شریعت اللہ تعالیٰ کی طرف سے مکمل اور ہر مسئلہ زندگی پر حاوی ہے اس کا آغاز رسول اللہ کی بعثت سے ہوا اور اس کی تکمیل آپ کی وفات پر ہو گئی۔

الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا۔ (المائدہ: ۳)

"آج میں نے تمہارے لیے تمہارے دین کو پورا کر دیا، تم پر اپنی نعمتوں کا اتمام کر دیا اور میں نے اسلام کو تمہارے دین کی حیثیت سے پسند کر لیا۔"

دین کی تکمیل کی یہی صفت ہے جس نے شریعت کو تغیر اور تبدیلی سے محفوظ کر دیا ہے۔ چنانچہ نصوصِ شریعت نہ بدلتے ہیں نہ متغیر ہوتے ہیں۔ یہ غیر الٰہی اور انسانی قوانین کا خاصہ ہے کہ وہ حالات کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہیں کیونکہ انسانی قانون دراصل سوسائٹی کی ضروریات کا تابع ہے اور اس وقت تک ارتقا نہیں کرتا جب تک سوسائٹی ارتقا نہ کرے۔

مطلب یہ ہے کہ شریعت انسانی قانون سے کوئی مماثلت نہیں رکھتی۔ شریعت اور انسانی قانون میں تین واضح فرق ہیں۔

۱۔ شریعت اللہ کی طرف سے ہے صفت کمال سے متصف ہے اور انسان کی ہر ضرورت کو پورا کرتی ہے۔ جبکہ قانون انسانی دماغ

کی پیداوار ہے اور وقتی ضرورتوں اور سماجی تقاضوں کا ہی لحاظ رکھ سکتا ہے۔

۲۔ شریعت کے اصولوں میں دوام ہے، وہ کسی ترمیم و تبدیلی کو برداشت نہیں کرتے۔ انسانی وضعی قانون وقتی ہوتا ہے اور سماجی ضرورتوں کے ساتھ ادلتا بدلتا رہتا ہے۔ اس میں دوام نہیں ہے اور نہ ہوسکتا ہے۔

۳۔ شریعت کا مقصد صالح افراد پیدا کرنا اور سماج کی اچھی تنظیم کرنا ہے جو مثالی ریاست کے قیام اور مثالی دنیا کی تشکیل پر منتج ہو۔ اس کے برخلاف قانون جماعت اور سماج کی تنظیم کو درست رکھنے میں تو معاون ہوسکتا ہے لیکن خود سماج اور ریاست کی تشکیل کا سبب نہیں بن سکتا۔ گویا شریعت کے قانون میں جو رفعت اور مثالی پن ہے وہ وضعی قانون میں نہیں۔

دراصل اسلام کے یہ احکام اپنے تنوع اور کثرت کے باوجود محض دنیا و آخرت میں انسان کی سعادت و فلاح کے مقصد وحید کے لیے ہیں۔ یہ اس نظریہ پر قائم ہیں کہ یہ دنیا آزمائش کی جگہ ہے اور فنا ہونے والی ہے اور آخرت مکافات عمل کی جگہ ہے اور ہمیشہ رہنے والی ہے۔ انسان اپنے اعمال کے لیے دنیا میں مشغول ہے اور آخرت میں جزا و سزا کا مستحق۔

اس حیثیت سے شریعت انسانی قوانین سے بالکل ممتاز ہے کیونکہ اس نے دین و دنیا کی تفریق کو ختم کرکے دونوں کو ایک کر دیا ہے اور وہ دنیا و آخرت دونوں کے لیے ہے۔ اپنی اسی خوبی کی وجہ سے شریعت اہل ایمان کو اس بات پر آمادہ کرتی ہے کہ وہ اس کی اطاعت علانیہ اور پوشیدہ ہر حال میں کریں۔ مشکلات میں بھی کریں اور سہولت کے ایام میں بھی۔

اس طرح سے شریعت کا مقصد جب دنیا و آخرت کی فلاح ٹھہرا تو وہ ایک ایسی اکائی قرار پائی ہے جو تقسیم قبول نہیں کرتی۔ شریعت ایک سلسلہ ہے جس کا ایک سرا دنیا کو چھوتا ہے اور دوسرا آخرت کو۔ اس لیے اس میں سے کچھ حصہ لے لینا اور کچھ حصہ رد کر دینا ممکن نہیں۔ اس لیے جو کوئی کل پر ایمان نہ لائے تو اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی یہ بازپرس ہے کہ :-

أَفَتُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُونَ
بِبَعْضٍ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَفْعَلُ ذٰلِكَ

مِنْكُمْ إِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ إِلٰى أَشَدِّ الْعَذَابِ ۚ (البقرہ: ۸۵)

"کیا تم کتاب کے کچھ حصے پر ایمان لاتے ہو اور کچھ حصے سے انکار کرتے ہو۔ تم میں سے جو کوئی ایسا کرے اس کی جزا اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ دنیا کی زندگی میں رسوا ہو اور آخرت میں شدید ترین عذاب میں ڈالا جائے۔"

اس آیت میں یہ بات توجہ کے قابل ہے کہ قانونِ شریعت سے سرد مہری یا اس کی مخالفت پر دو قسم کی سزائیں مقرر ہیں۔ ایک سزا دنیوی اور دوسری سزائے اُخروی۔ جو شخص قرآن کی آیاتِ احکام کا مطالعہ کرے گا وہ دیکھے گا کہ شریعت ہر بدعملی پر دنیا اور آخرت دونوں کی سزائیں تجویز کرتی ہے۔ ارشادِ باری ہے:

إِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا أَنْ يُقَتَّلُوْٓا أَوْ يُصَلَّبُوْٓا أَوْ تُقَطَّعَ أَيْدِيْهِمْ وَأَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ أَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْأَرْضِ ۚ ذٰلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝ (المائدہ: ۳۳)

"بہ تحقیق اُن لوگوں کی سزا جو اللہ اور اُس کے رسول سے جنگ کرتے ہیں اور زمین میں فساد برپا کرتے ہیں یہی ہے کہ وہ قتل کیے جائیں یا اُن کو سولی دی جائے یا اُن کے ہاتھ پیر مقابل سے کاٹے جائیں یا ان کو جلاوطن کر دیا جائے یہ تو اُن کے لیے دنیا میں رسوائی ہے اور آخرت میں ان کے لیے سخت ترین عذاب ہے۔"

یہ حقائق اس بات کے متقاضی ہیں کہ اسلامی سماج میں جرائم کم سے کم ہوں، زیادہ سے زیادہ امن ہو اور فساد کے امکانات کم ہوں، نظمِ اجتماعی عادلانہ ہو اور آمریت نہ چل سکے۔ اس کے برخلاف انسان کے بنائے ہوئے قوانین لوگوں کے ضمیر میں کوئی ایسا خوف یا تحریک پیدا نہیں کر سکتے جو انہیں قوانین کی پابندی پر آمادہ کرے۔ وہ صرف اس حد تک پابندِ قانون ہوتے ہیں جہاں تک انہیں ظاہری گرفت کا ڈر ہے۔ کسی میں جرم کے ارتکاب کی طاقت ہو اور اسے موقع مل جائے، نیز قانون کی پکڑ کا خوف نہ رہے یا کم سے کم ہو جائے تو اُسے جرم کرنے سے

کوئی نہیں روک سکتا۔

یہ خصوصیت تو شرعی قانون ہی میں ہے کہ وہ آدمی کو قلب ونظر کا پابند بنا دیتی ہے اور اُس کے ضمیر کو اُس کی پاسبانی کا منصب عطا کر دیتی ہے۔

اس بحث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ شریعت اور انسانی قانون میں کوئی مماثلت نہیں ہے شریعت اپنی جگہ اٹل ہے اور پچھلے ساڑھے تیرہ سو برس میں نکتہ برابر بھی نہیں بدلی جبکہ وضعی قوانین کے اصول ونصوص ہزاروں بار بدل چکے ہیں۔

قانون شریعت کی بنیاد قرآن کریم کی سورہ نساء کی یہ آیت ہے کہ :-

یا ایھا الذین آمنوا اطیعوا اللہ
و اطیعوا الرسول واولی الامر منکم
فان تنازعتم فی شیء فردوہ الی
اللہ والرسول

" اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو، اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرو، رسول کی اطاعت کرو اور ایسے حکم دینے والوں کی اطاعت کرو جو تم میں سے ہی ہوں، اگر تم میں کسی بات پر اختلاف اور تنازعہ ہو جائے تو معاملے کو فیصلے کے لیے اللہ اور رسول کی طرف پھیر دو۔"

اس کا مطلب یہ ہے کہ قانون اللہ کا ہے، اطاعت رسول کی ہے اور نفاذ کا ذمہ اولی الامر کا ہے۔ چنانچہ اس بات پر مسلمانوں کا اتفاق ہے کہ کسی اسلامی حکومت کے ذمہ دار کا کوئی عمل اُس وقت تک ہی درست ہے جب تک کہ وہ اللہ کے قانون اور اس کے رسول کی اطاعت کا حق ادا کرتا رہے۔ جب وہ ان حدود سے نکل جائے تو اس کا عمل باطل ہے۔ شریعت نے اولی الامر کو عاملانہ (Executive) اور تنظیمی (Administ-rative) سہولتیں دینے کے لیے ذیلی قانون سازی (Bye laws) کا اختیار دیا ہے لیکن یہ حق مطلق آزادانہ حق نہیں ہے۔ اس ذیلی قانون سازی میں وہ نصوص شریعت کے پابند رہیں گے۔ اسلامی شریعت کے عام مبادی اور روحِ دین سے مطابقت بنائے رکھیں گے۔

ذرا سا غور کیجئے تو یہ محسوس ہوگا کہ سربراہ حکومت (Chief Executive Body) کی حیثیت سے جو گشتی ہدایات (Circulars) جاری کرتا ہے وہ اصل قانون کے بھلے طریقے سے

نفاذ کے لیے ہی ہوں گی۔ تنظیمی طور پر یہ سرکار ان
امور میں ہدایات دیں گے جن کے بارے میں
نصوص موجود نہیں ہیں یا جن کے بارے میں شریعت
خاموش ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ہدایات قانون شریعت
سے ہم آہنگ ہوں گی اور دین کی اساس اور روح
کا پورا پورا لحاظ رکھتے ہوئے دی جائیں گی۔

واقعہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہو یا
رسول اور اولی الامر کی اطاعت۔ ہوتی سب اللہ
کے حکم اور فرمان ہی سے ہے۔ جہاں یہ شبہ ہو کہ
اولی الامر نے کوئی خودسرانہ باطل اور غیر مسلمانہ
حکم دے دیا ہے وہاں یہ اطاعت واجب نہ رہے گی
جیسا کہ حضورؐ کا ارشاد ہے کہ:۔

لا طاعۃ لمخلوق فی معصیۃ الخالق

"خالق کی نافرمانی میں کسی مخلوق کی اطاعت
لازم نہیں۔"

انّما الطاعۃ فی المعروف

"اطاعت تو صرف معروف میں ہی لازم ہے"

خلافت راشدہ صرف اسی نہج پر چلی پھر بعد
کو اگرچہ اسلام میں بادشاہی آگئی لیکن شرعی قانون بڑی
حد تک نافذ رہے، لیکن گذشتہ دو تین صدیوں میں
مسلمان یورپی استعمار کے اثر میں آ گئے۔ وہ غالب
قوموں کے نظریات سے مرعوب ہو گئے۔
کہ مشہور کہاوت ہے کہ:۔

النّاس علیٰ دینِ ملوکھم

"لوگ اپنے بادشاہوں کے طریقوں پر
چلتے ہیں۔"

اور انہوں نے مغربی قوانین کی نقالی شروع کر دی۔
انہوں نے قانونِ شریعت کو پس پشت ڈال دیا اور
یورپ کے وضعی قانون پر عمل کرنے لگے۔ ظاہر
ہے کہ قوانین وضعیہ کے نفوذ کے بعد شریعت کے
اکثر احکام عملاً معطل ہو گئے، مگر اللہ کا بڑا کرم یہ ہوا
کہ نظری حیثیت سے یہ قوانین شرعی منصوصات پر کوئی
اثر نہ ڈال سکے، یہ ضرور ہوا کہ ہمارے اولی الامر
اپنے حق سے تجاوز کر گئے وہ تشریع کا حق نہیں رکھتے
تھے مگر یہ حق انہوں نے اپنے طور پر حاصل کر لیا۔
لیکن مسلمان عوام اس کڑوی گولی کو اپنے گلے
سے نہ اتار سکے۔ وہ برابر اس فکر میں لگے رہے کہ
کس طرح قانون شریعت پھر سے بحال ہو۔ وہ
ایسے امرا اور حکام کو طاغوت سمجھتے رہے جیسا کہ اللہ
کی کتاب نے انہیں سکھایا تھا کہ:۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ يَزْعُمُونَ
أَنَّهُمْ آمَنُوا بِمَا أُنزِلَ إِلَيْكَ

وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيْدُوْنَ
اَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ
وَقَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ وَيُرِيْدُ
الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّضِلَّهُمْ ضَلٰلًا بَعِيْدًا (النساء: ۶۰)

"کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو دعویٰ تو کرتے ہیں کہ وہ ایمان لائے اس چیز پر جو کہ آپ پر اور آپ سے پہلے دوسرے پیغمبروں پر اتاری گئی ہے مگر یہی لوگ اپنے فیصلے خدا کی اطاعت سے آزاد، ور منحرف طاغوت سے کرانا چاہتے ہیں حالانکہ ان کو حکم دیا گیا تھا کہ اُس کی اس حیثیت کا انکار کریں۔ بات یہ ہے کہ شیطان ان کو بڑی دور کی گمراہی میں ڈالنا چاہتا ہے۔"

چنانچہ مسلمان علماء اور فقہاء اس بات پر متفق ہیں کہ کوئی مسلمان "ما انزل اللہ" کے علاوہ دوسرے احکام ایجاد کرے یا کسی ایسی چیز یا اُس کے جز کے حکم کو ترک کر دے جو اللہ تعالیٰ نے نازل کی ہے اور بغیر کسی شرعی تاویل کے اُسے صحیح سمجھے تو اس پر اللہ تعالیٰ کا یہ فیصلہ صادق آئے گا کہ:

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ
فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ......
هُمُ الظّٰلِمُوْنَ.........
هُمُ الْفٰسِقُوْنَ (المائدہ: ۴۴-۴۷)

"جو کوئی اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کرے وہی کافر ہے۔ وہی ظالم ہے اور وہی فاسق ہے"

مسلمانوں کی تاریخ میں جتنی اجتماعی بے چینی اور بے اطمینانی پیدا ہوئی ہے یا انقلابی تحریکیں اُٹھی ہیں اُن سب کا جذبہ محرکہ اسی تناقض کو دور کرنا تھا جب بھی حاکم وقت نے اس نظریہ کو ترک کیا یا حکومتِ وقت نے اُسے نظر انداز کیا۔ مسلمان عوام میں اضطراب اور بے چینی پیدا ہو گئی اور وہ مروجہ نظاموں سے مایوس ہو گئے

چنانچہ انیسویں صدی میں جب انگریز حکومت نے ہندوستان میں قدم جمائے تو مسلمان اپنی آئیڈیولوجی، اپنی تہذیب، اپنی معاشرت، اپنے نظامِ قانون کی بقا سے مایوس ہو گئے اور انہوں نے بغاوت کر دی۔۔۔ یہ بغاوت دبا دی گئی تو انہوں نے ترک موالات کی پالیسی اپنائی۔ علمائے ہند نے شرعی فتویٰ دیا کہ:-

★ سرکاری کونسلوں میں ممبر ہونا جائز نہیں ہے

* انگریزی عدالتوں میں وکالت کرنا ناجائز ہے۔
* سرکاری یا نیم سرکاری مدرسوں میں پڑھنا ناجائز ہے۔
* گورنمنٹ کی تمام نوکریاں جن سے سرکار کی مدد ہوتی ہو حرام ہے۔ خاص کر پولیس اور فوج کی نوکری کرنا سخت گناہ ہے کیونکہ ان کو اپنے بھائیوں پر گولیاں چلانی پڑتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ :-

مَنْ یَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَاؤُهٗ جَهَنَّمُ خَالِدِیْنَ فِیْهَا

"جو شخص مسلمانوں کا عمداً قتل کرے گا اُسے جہنم میں ہمیشہ عذاب دیا جائے گا[1]"

خلافت کا صور پھونکا گیا اور ہندوستان کی آزادی کی کوششیں تیز کر دی گئیں۔ پھر چند در چند وجوہ سے مسلم لیگ نے پاکستان کی مانگ پیش کر دی اور پھر سیاسی طاقتوں کی لمبی آویزش اور کشمکش کے بعد ہندوستان آزاد ہو گیا اور پاکستان بن گیا تاکہ مسلمان "اپنے ضابطہ حیات، اپنی روایات، اور اسلامی قوانین کے مطابق حکم کر سکیں[2]"

چنانچہ قیام پاکستان کے بعد ہی وہاں نظام اسلامی کا مطالبہ شروع ہو گیا، ۱۹۴۹ء میں پاکستانی دستور ساز اسمبلی نے قرارداد مقاصد بھی منظور کر لی مگر بات ٹلتی رہی اور پاکستانی سیاسی رہنما اس مطالبے کو دباتے رہے کہ قرارداد مقاصد بروئے کار آئے۔ سیاست دانوں کی اس کوشش میں ملک میں آمریت آئی۔ آئی سوشلزم کے نعرے لگے۔ اسلامک سوشلزم کی بات ہوئی مگر اسلام پسندوں کا مطالبہ بڑھتا رہا۔

آخر فوج کی غیرت کام آئی۔ فوج نے سوشلسٹ وزیر اعظم کو بند کر دیا اور فوجی آمر خلوص کے ساتھ اسلامی نظام کے لیے راہ ہموار کرنے میں لگ گئے اور آخر قیام پاکستان کے پورے بتیس سال کے بعد پاکستان کے فوجی آمر صدر ضیاء الحق نے نظام اسلامی کے نفاذ کی ابتدا کا اعلان کر دیا۔ صدر پاکستان چاہتے ہیں کہ ملک کو ایک مثالی اسلامی ریاست میں تبدیل کر دیا جائے لیکن اس سلسلہ میں وہ محتاط تدریج سے کام لے رہے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ تند و تیز قسم کی تبدیلیاں افراتفری پر منتج ہو سکتی ہیں۔ اس لیے انہوں نے عوام کو آزادی دی ہے۔ مارشل لا کی گرفت ختم کر دی ہے۔ مخالفوں کو

---

[1] نوائے آزادی صفحہ ۱۲۴
[2] محمد علی جناح ـــ نومبر ۱۹۴۵ء

آزاد چھوڑ رکھا ہے مگر یہ ایک شعوری عمل ہے اور اس سے فوائد سے انکار ممکن نہیں۔

پاکستان کے لوگ پہلے ہی اپنی راہ کا تعین کر کرچکے ہیں۔ اب اگر کچھ سر پھرے لوگ اس راہ میں کیڑے نکالتے ہیں تو بلا سے۔ سمت سفر پہلے ہی سے طے تھی۔ اب سفر بھی شروع ہو گیا۔ اس سلسلہ میں صدر پاکستان نے نئی نسل کو اسلامی نظریۂ سیاست سے آشنا کرنے کے لیے درسی کتابوں کی اصلاح کرائی اور ایسی نئی تعلیمی پالیسی وضع کی جس کا مقصد پاکستانی قوم کو نظریۂ اسلامی سے وابستہ رکھا جانا ہے۔ انہوں نے انگلش میڈیم اسکولوں میں بھی بتدریج اُردو میڈیم رائج کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔

اسلامی سال کے آغاز پر انہوں نے شریعت بنچوں کا اعلان کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ ایک لاکمیشن بھی بنا دیا ہے جو عدل و انصاف کو سہل الحصول بنانے کی راہ میں سفارشات پیش کریگا۔

اقتصادی میدان میں انہوں نے زکوٰۃ اور عشر کے نظام کو ترجیح دی ہے اور اسی جولائی سے اسے نافذ کر رہے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اسلامی فلاحی ریاست کی تشکیل کو اپنا مقصد بنا کر خدا کے مقرر کردہ قانون اور طریقوں سے امیر و غریب کے فرق کو کم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ساتھ ہی انہوں نے بلاسودی معیشت کو رواج دینے کی ابتدا کی ہے وہ اشتراکی سرمایہ کاری کی ہمت افزائی کر رہے ہیں اور ملکی معیشت کو سود کی لعنت سے پاک کرنا چاہتے ہیں۔

اصلاح معاشرہ کے لیے انہوں نے ریڈیو ٹیلی وژن اور وسائل نشر و اشاعت پر وعظ و نصیحت کا ایک سلسلہ شروع کیا ہے جس میں انفرادی اور اجتماعی

اہلِ دل

اہلِ دل ہیں پاک باطن پاک باز
حق شناس و حق پسند و حق نواز
عشقِ حق ان کا اصولِ زندگی
ذکرِ حق سے عشق میں بالیدگی
اہلِ دل کی بات ہے آبِ حیات
چاہیئے ان کی نگاہِ التفات
اُن کا جو ارشاد ہے اکسیر ہے
آدمی بن جائے وہ تاثیر ہے
بات نکلی نُور دل میں چھن گیا
آدمی گویا فرشتہ بن گیا

حضرت میرزا امجد کرتر

اے انسان

ساری دنیا سب جمادات و نباتات
ساری مخلوقات، ساری کائنات
سب ہیں تیرے واسطے، تیرے لیے
اور تو خلاقِ عالم کے لیے
منصبِ آدم، ترا اصلی مقام
تجھ سے وابستہ ہیں تعمیری نظام
منصبِ آدم ہے نظمِ کائنات
منصبِ آدم ہے تعمیرِ حیات
اس کو سمجھے گی فرشتوں کی جبیں
جانتا ہے سجدۂ روح الامیں

عزیز الحق کوثر

فضائلِ اخلاق کی تلقین ہوتی ہے، رذائلِ اخلاق سے نفرت دلائی جاتی ہے اور ایک سادہ اور مسلمانہ زندگی گزارنے کا شوق ابھارا جاتا ہے۔

انسدادِ جرائم کے لیے انہوں نے بعض تعزیری قوانین کا نفاذ کیا ہے۔ شراب نوشی، چوری، زنا وغیرہ پر حدودِ شرعیہ نافذ کرنے کا اعلان کیا ہے اور پولیس کی تنظیمِ نو کی ہے۔

لیکن یاد رکھنے کی یہ بات ہے کہ اسلام جس غرض کے لیے اپنی حکومت قائم کرتا ہے وہ محض ملکی انتظام ہی نہیں بلکہ نظامِ اسلام کا مثبت غلبہ ہے قرآن کا ارشاد ہے کہ :-

هُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۝

(التوبہ :   )

"وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دینِ حق دے کر بھیجا تاکہ اُسے پوری جنس دین پر غالب کر دے خواہ مشرکوں کو یہ بات کتنی ہی ناگوار کیوں نہ ہو۔"

اس حکم کی رُو سے پیغمبر اور اُس کے واسطے سے مسلمانوں کا مشن یہ ہے کہ وہ نظامِ اسلام کو ہر اُس نظامِ زندگی پر غالب کر دیں جو دین کی نوعیت کا ہو۔ ظاہر ہے کہ اس مقصد کے لیے یہ ضروری ہے کہ نظامِ اسلامی کے دائرہ عمل میں کوئی ایسی دعوت نہ اُٹھ سکے جو کسی بھی درجے میں اُسے چیلنج کر سکے۔ دورِ خلافت میں حکومت کی یہی پالیسی تھی۔ چنانچہ جب مسیلمہ کذاب، اسود عنسی، طلیحہ اسدی، سجاح اور لقیط نے فتنہ اُٹھایا تو انہیں قوت کے ذریعہ دبا دیا گیا۔ حکم خداوندی تھا کہ

وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ لِلَّهِ

(الانفال : ۔ ۵)

"اور ان سے لڑو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین پورے کا پورا اللہ کے لیے خالص ہو جائے۔"

خلافتِ راشدہ کے اسی طرزِ عمل کو سامنے رکھتے ہوئے اُمت نے علی محمد باب، بہاء اللہ اور غلام احمد قادیانی جیسے بہم جو لوگوں کی سختی سے مخالفت کی اور انہیں پنپنے نہ دینے کی جدوجہد کی۔ کیونکہ وہ اسلام کی صفوں میں رخنہ ڈالنے کی کوشش کرتے رہے ہیں اور انہوں نے ارتداد کیا ہے جس کی سزا اسلامی نظام میں قتل کے علاوہ کچھ نہیں۔

اب رہی یہ بات کہ نظامِ اسلامی میں رہنے والے غیر مسلم اپنے دین و مذہب کی تبلیغ کر سکتے ہیں یا نہیں۔ تو اس کے بارے میں صاف سی بات یہ ہے کہ اسلامی حکومت غیر مسلموں کو اپنے دین پر قائم رہنے کی آزادی دیتی ہے۔ اُن کی مذہبی زندگی کا تحفظ دیتی ہے لیکن اگر وہ اس دین و مذہب کو غالب کرنے کی کوشش کریں تو اس کی ہرگز اجازت نہیں دی جا سکتی۔ وہ بڑی خوشی سے اپنی اولاد کو اپنے دین کی تعلیم دیں یا اپنے مذہب عقیدے اور اصول لوگوں کے سامنے تقریر و تحریر کے ذریعے بیان کریں انہیں اسلام پر بھی اعتراض ہوں تو وہ تہذیب کے ساتھ تحریر و تقریر میں پیش کر سکتے ہیں اور اگر دار الاسلام میں رہنے والے دوسرے غیر مسلموں میں سے کوئی اُس کی بات سے متاثر ہوتا ہے تو وہ اُس کا مذہب بھی قبول کر سکتا ہے۔ دراصل منع یہ بات ہے کہ ایسی کوئی منظم تحریک چلائی جائے جو مسلمانوں کے ارتداد کا سبب بن سکے۔
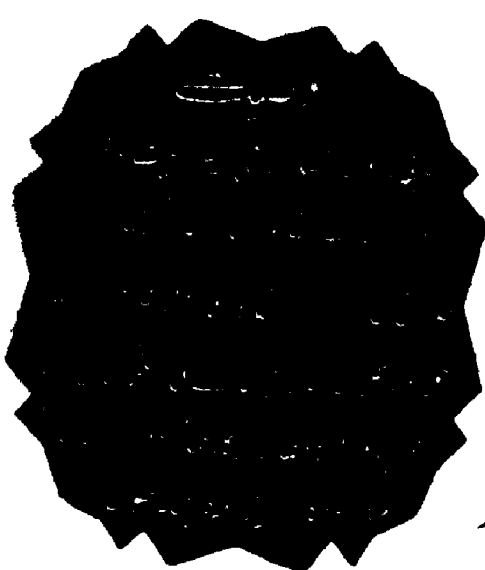
(ماہر القادری کی ایک نظم پر تضمین)

نہ ایٹم بم، نہ جنگی ساز و ساماں کی ضرورت ہے
نہ "یو این او" نہ کچھ مالِ فراواں کی ضرورت ہے
رئیسوں کی نہ کچھ ابنائے دوراں کی ضرورت ہے
"امیروں کی ضرورت ہے نہ سلطاں کی ضرورت ہے
زمانہ کو فقط مردِ مسلماں کی ضرورت ہے"

دل ایمان و یقیں کی آنچ سے گرمائے جائیں گے
ترانے پھر حقیقی زندگی کے گائے جائیں گے
حق آگاہوں پہ پھر تیرِ ستم برسائے جائیں گے
"حنین و بدر کے پھر معرکے دہرائے جائیں گے
زمیں کو سرخیٔ خونِ شہیداں کی ضرورت ہے"

ہنسانا ہے سسکتی تلملاتی آدمیت کو
مٹانا ہے تباہی خیز طاغوتی سیاست کو
بپا کرنا ہے امن افروز، قرآنی حکومت کو
"بدلنا ہے خدا ناآشنا دورِ قیادت کو
علیؓ و خالدؓ و فاروقؓ و سلمان کی ضرورت ہے"

یزیدیت کے قلعے ڈھانے والے جلد آجائیں
فسق و فسق سے ٹکرانے والے جلد آجائیں
خدا کی راہ میں مرجانے والے جلد آجائیں
"حسینی قافلے میں آنے والے جلد آجائیں
کہ پھر اسلام کو خونِ رگِ جاں کی ضرورت ہے"

زمانہ آگیا یک رنگیٔ دین و سیاست کا
زمانہ آگیا پابندیٔ قرآں و سنت کا
زمانہ آگیا اللہ ہی کی حاکمیت کا
"زمانہ آگیا جھوٹے خداؤں سے بغاوت کا
مکمل اتباعِ حکمِ یزداں کی ضرورت ہے"

بھلا وہ فلسفہ دانی ہے کوئی فلسفہ دانی
اگر انسان نے اپنی حقیقت ہی نہ پہچانی!
معاذ اللہ! انسانوں پہ انسانوں کی سلطانی
"وہ مشرق ہو کہ مغرب ہر طرف ہے فتنہ سامانی
نظامِ زیست کو منشورِ قرآں کی ضرورت ہے"

یہی ہیں زندگی کے نکتۂ رنگیں کی تفسیریں
کہ انساں کے بدلنے میں بدل جاتی ہیں تقدیریں
یقین و عزم کی تیغوں سے کٹ جاتی ہیں زنجیریں
"دعا کے ساتھ تدبیریں، عمل کے ساتھ تکبیریں
خدا کی راہ میں بھی ساز و ساماں کی ضرورت ہے"

"نظامِ مصطفیٰ" یا اسلامی نظام" زمین پر خدا کی رضا و رحمت کا نشان ہے اور دنیا میں آباد تمام انسانی معاشرے کے دکھوں کا علاج اس نظام سے وابستہ ہے۔

آج پیچیدہ انسانی مسائل کا جنگل اس نظام کی غیر موجودگی کے سبب ہر طرف اگا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اگر کہیں اسلام اپنی ہمہ گیر صورت میں نافذ ہوتا اور انفرادی عبادت اور تلاوتِ آیات سے آگے بڑھ کر پوری انسانی زندگی پر اپنے سارے اثرات کے ساتھ محیط ہوتا تو مسلمانوں میں سے کسی شخص کا اس کے وجود سے دہشت زدہ ہونا تو درکنار خود غیر مسلم دنیا کے وفود ایسے علاقے کی سیاحت کے لیے آتے تاکہ ایسے مطمئن معاشرے کی نظریاتی بنیادوں کا جائزہ لیں کہ جہاں اب کوئی مجرم نہیں ہوتا۔ ہر شخص مطمئن ہے، کوئی کسی کی حق تلفی نہیں کرتا جہاں روٹی کپڑے اور مکان کے مسائل حل ہو چکے ہیں۔

بعض لوگوں نے چند شرعی ضوابط کے نفاذ اور چند جرائم کی شرعی سزاؤں کے اجرا کو اسلامی نظام کا نام دے رکھا ہے۔ کسی کے نزدیک شراب بندی ہی میں اسلامی نظام پوشیدہ ہے۔ جس طرح جزو کو کل کہنا غلط ہے اور کٹے ہوئے انسانی ہاتھ کو زندہ انسانی جسم کہنا درست نہیں ہے۔ اسی طرح انسانیت کے شاہکار نظامِ زندگی کو چند تعزیری قوانین کا نام دینا بھی درست نہیں ہے۔ اسلامی نظام مالکِ کائنات کا عطا کردہ مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ اپنے مستقبل سے بے خبر اور بے علم انسان کے لیے زمین پر اترنے کے بعد ہر شے سے زیادہ ضروری چیز یہی تھی کہ اسے زمین پر امن و سلامتی اور عدل و انصاف کے ساتھ اجتماعی طور پر رہنے کا طریقہ اور سلیقہ معلوم ہو۔ اُسے باہمی تعلقات اور حقوق العباد

کا علم ہو اور اُسے تصادم کے مقابلے میں تعاون
اور کشمکش کے مقابلے میں موافقت کا راستہ
معلوم ہو۔ یہ بات اسے اس کائنات کا خالق ہی
بتا سکتا تھا۔ چنانچہ اُس نے اپنے خصوصی اہتمام
کے ذریعے انبیاءِ کرام کی معرفت یہ طریقہ انسان کو
بار بار سکھایا۔ جب کبھی انسان اس طریقے پر چلا تو
دنیا میں عدل و انصاف و مساوات و اخوت کی
فضا قائم ہو گئی اور انسان نے دوسرے انسانوں
کے ساتھ بھائیوں کا سا سلوک کیا اور زمین پر امن و
سلامتی کا دور دورہ ہو گیا اور جب انسان اس
طریقے سے ہٹ گیا تو دنیا نے ظلم و زیادتی، حق
ماری، تکبر و نخوت، تشدد و جبریت کا دور دورہ
ہو گیا اور فتنہ و فساد زمین میں جنگلی گھاس کی مانند
ہر طرف پھیل گیا۔ انسان نے اپنی نوعی عمر میں زمین پر
اس کا بار بار تجربہ کیا ہے۔ مالک کی طرف سے اسلامی
نظام اُس کے بندوں کے لیے سب سے بڑی نعمت
ہے جس میں اُس کی انسانیت فرشتوں سے بھی بلند
درجات کی حامل ہو جاتی ہے۔

یہ نظام فکر و عمل کا ایک ایسا صحت مند
ڈھانچہ تیار کرتا ہے جس میں بنی نوع انسان کے
لیے سلامتی ہی سلامتی ہے لیکن یہ نظام بعض مزاجی
خصوصیات کا حامل ہے۔ وہ خصوصیات پیدا نہ
ہوں تو محض ضابطۂ تعزیرات اسلامی نظام کا قائم
مقام نہیں بن سکتا۔ نظامِ مصطفےٰ ایک نظریاتی
اصلاحی، تبلیغی، اقتصادی، روحانی، سیاسی، معاشرتی
اور اقتصادی مسلک کا نام ہے۔ اس نظام کی تین
اعتقادی بنیادیں ہیں:۔

توحید — رسالت — اور آخرت

نظامِ مصطفےٰ کا حاکمِ اعلےٰ — اللہ تعالیٰ

توحید دراصل نظامِ اسلامی کے حاکمِ اعلےٰ
کا حقیقی تعارف ہے اور اسلامی نظام کا بنیادی خلاصہ
اور اعتقادی نعرہ کلمہ طیبہ اس بات کو کھول کر بیان
کر دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا دوسری کوئی ہستی
بھی الوہیت کی حامل نہیں ہے اور ربوبیت میں حاکمیت
(Soveeignty) کے سارے
اختیارات اور صفات موجود ہیں۔

اللہ تعالیٰ ہی ہے جو مسلسل اور پیہم اپنے
بے اندازہ خزانوں سے اپنی مخلوق کو پالتا ہے، اپنے
اختیارات سے اُن پر حکومت کرتا ہے، اپنے ڈیزائن
سے خود مخلوق کی تخلیق کرتا ہے اور انہیں شکل و صورت
رزق اور مقصدِ زندگی مقدر کرتا ہے۔ پھر ایک
مختارِ مطلق، حاکمِ اعلیٰ کی طرح اپنے احکام ان کو دیتا

ہے۔ بعض مخلوقات کو جبلی اور تکوینی صورت میں احکام دیتا ہے اور بعض کو ان کے ساتھ تشریعی احکام بھی دیتا ہے۔ انسان وہ مخلوق ہے جسے وہ تشریعی احکام دیتا ہے۔ یہ احکام وہ اپنے انبیاء کی معرفت دیتا ہے اور آخری ضابطۂ احکام جو اس کی طرف سے انسانوں کو موصول ہوا ہے وہ قرآن ہے۔ اس طرح انسانوں کے حاکم اعلیٰ اللہ تعالےٰ کا مجموعۂ احکام آج قرآن پاک کی صورت میں مسلمانوں کے واسطے سے پوری انسانیت کے پاس موجود ہے۔ اس ضابطۂ احکام کو تسلیم کرنا اور اپنے حقیقی حاکم کی اطاعت کرنا ہی حقیقی اسلام ہے۔

نظامِ مصطفےٰ کا قائدِ مطلق صلی اللہ علیہ وسلم

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نظامِ مصطفےٰ کے قائد، رہنما اور ہادی ہیں۔ یہ اسلامی نظام کی دوسری اعتقادی بنیاد ہے جسے رسالت کہا جاتا ہے۔ رسالت وہ الٰہی قیادت ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسانوں کی رہنمائی کے لیے انہیں ودیعت کی جاتی ہے۔ اب قیامت تک کے لیے قافلۂ انسانیت کے مستقل قائد حضور اکرم ہیں اور آپ کے ارشادات اور سنن آپ کے وہ مستقل نقوشِ قدم ہیں جن کی پیروی کر کے انسان اپنے قائد کی راہنمائی میں اپنے مالک اور حاکم اعلیٰ کی رضا اور خوشنودی کو حاصل کر سکتے ہیں۔

مقامِ مسئولیت۔ آخرت

مسلمانوں میں جواب دہی کا مستقل عقیدہ نظامِ مصطفےٰ کی تیسری ٹھوس بنیاد ہے۔ اس نظام میں کوئی بے لگام، بے مہار، غیر مسئول اور مادر پدر آزاد نہیں ہے۔ زندگی بھر کی کارروائیوں کے ایک ایک لمحے کا حساب زندگی پیدا کرنے والے کے سامنے دینا بھی اتنی ہی بڑی حقیقت ہے جتنی بڑی حقیقت خود زندگی ہے۔ زندگی میں کوئی بھلائی کر کے اس کے اجر سے محروم رہ جانے والا آخرت میں محروم نہیں رہنے دیا جائے گا اور زندگی میں کوئی برائی اور ظلم کر کے بچ نکلنے والا آخرت میں اُس کا خمیازہ بھگتنے سے بچ نہ سکے گا۔ کوئی حق تلفی بلاحساب نہ چھوٹ جائے گی اور کوئی ظلم وستم بلا گرفت نہ بچ سکے گا۔

یہ تینوں بنیادی عقائد اسلامی نظام یا نظامِ مصطفےٰ کی وہ بنیادیں ہیں جو اس کے ہر شہری کے دل و دماغ اور سینے کی گہرائیوں میں گہری جڑوں کے ساتھ پیوست ہوتی ہیں۔ نظامِ مصطفےٰ کا شہری ایک نہایت خدا ترس، عاشقِ رسول اور آخرت میں جوابدہی کا زبردست احساس رکھنے والا انسان ہوتا ہے۔ اور اُس کا کردار دلوں کا فاتح ہوتا ہے۔

اسعد گیلانی

نظامِ مصطفیٰ کی خصوصیات

نظامِ مصطفیٰ گوناگوں خصوصیات کا حامل نظام ہے۔ اسلام ایک مکمل نظامِ زندگی ہے یہ انسانی زندگی کے سارے گوشوں کو اطاعتِ خداوندی میں دینے کا نام ہے۔ جب انسان ہر پہلو سے خدا کی اطاعت کا اہتمام کرتا ہے معیشت، معاشرت، سیاست، اخلاق، تعلقات، معاملات اور اجتماعیات غرض اپنا سب کچھ اطاعتِ خداوندی میں رنگ دیتا ہے تو اطاعت کا یہ رنگ اس معاشرے میں صبغۃ اللہ کی لہر پیدا کر دیتا ہے۔ ایسی صورت میں کجروی۔ ناخداترسی، حق تلفی، استحصال و زیادتی، غلط معیشت اور جبر و تشدد کی سیاست سب کچھ راست روی، خداترسی، حق شناسی، اعتدال و توافق معاشی معاونت اور سیاست میں مساوات و اخوت کے رنگ میں بدل جاتی ہے۔

جامع اور کامل نظام

اسلام اپنے پیروؤں کو کبھی بھی تنہا نہیں چھوڑتا اسلام واحد دین ہے جو جامعیت اور کاملیت کا حامل ہے۔ اس کے علاوہ اور اس سے باہر زندگی کے سارے ہی نظریات نامکمل اور اُدھورے ہیں۔

ساری انسانیت کا نظام

اسلام اپنے مزاج کے لحاظ سے ساری انسانیت کا نظام ہے۔ وہ سارے انسانوں کو ایک برادری ایک ماں باپ کی اولاد۔ یکساں ضروریات و حاجات رکھنے والے اور یکساں جذبات و احساسات کے حامل شمار کرتا ہے۔ وہ پیشہ ورانہ طبقات، علاقائی اور نسلی تفاوت رنگ اور خون کا امتیاز، معاشی درجہ بندیوں اور انسانوں

میں مال، دولت، نسل، علاقہ، زبان اور کلچر کی بنا پر امتیاز کرنے سے انکار کرتا ہے وہ سب انسانوں کو بنیادی انسانی حقوق میں مساوی قرار دیتا ہے اور فرق صرف معیار انسانیت، نیکی، شرافت، تقویٰ اور خداترسی کی بنا پر کرتا ہے اور اس امتیاز کو بھی کسی کے لیے مادی وسائل کم و بیش فراہم کرنے کا ذریعہ نہیں بناتا بلکہ صرف انسانوں کی بھلائی میں مسابقت کرنے کا جذبہ عطا کرتا ہے۔

اس نظام کی قدریں دائمی ہیں، عالمگیر اور پائدار ہیں۔ اس کے بنیادی احکام ناقابل تغیر ہیں لیکن زمانے و رحالات اور انسانوں کی ضروریات کے مطابق اس کے ضوابط و قواعد کے اجراء میں تجدید و تنظیم نو نہ صرف ممکن ہے بلکہ عین مطلوب ہے جس جس طرح انسانیت کے فہم و شعور میں اضافہ و تغیر ہوتا اور اس کی ضروریات میں تبدیلی ہوتی ہے ویسے ویسے دین اسلام بھی مخصوص حدود کتاب و سنت میں رہتے ہوئے تجدید و احیاء دین کے ذریعے قدم قدم پر اس کی رہنمائی کرتا چلا جاتا ہے۔

ترمیم و اضافہ سے محفوظ نظام

دین مصطفیٰ میں پیوندکاری ممکن نہیں ہے۔ اسلامی نظام بھی اپنے تمام اجزا کے ساتھ ایک تودکمیل نظام ہے۔ اس میں سوشلزم کی جبریت و آمریت اور نیشنلائیزیشن اور سرمایہ داری کی لادینیت کو نہیں کھپایا جا سکتا۔ اسلام نئی صالح فکر کو ضرور اپناتا ہے۔ لیکن اپنی قرآن و سنت کی ترازو میں تول کر اور اپنی خداپرستی کی کٹھالی میں ڈھال کر جو شخص مادہ پرست تہذیب کی برتھ کنٹرول، کمیونزم کی کمیون آبادی اور قومی ملکیت سوشلزم کی بے خدا حکمت معیشت سرمایہ داری کی مفاد پرستی، فاشزم کی جبریت، نیشنلزم کی علاقائیت اور قوم پرستی اسلام میں گھسانے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ اسلام کے ساتھ زیادتی کرتا اور الٰہی ہدایت میں انسان کے فطری بگاڑ کو کھپانا چاہتا ہے۔

استحصال سے پاک نظام

نظام مصطفیٰ ہر نوعیت کے [استحصال] سے پاک نظام ہے۔ استحصال دوسروں کا حق مارنے کا نام ہے لیکن اسلام میں حقوق العباد پر جس قدر زور دیا گیا ہے اس کی انتہا یہ ہے کہ مزدور کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے اجرت دینے کا حکم دیتا ہے۔ اس میں کسی نوعیت کے استحصال کی گنجائش کہاں بتائی جا سکتی ہے۔ جہاں اشیاء پر کنٹرول تک

کرنا اس وقت تک ممنوع ہو جب تک کہ کنٹرول
کرنے والی اختیاری اشیا کی مؤثر فراہمی کا انتظام
نہ کرے، جہاں اجارہ داری (Monopoly)
کا نام و نشان نہ ہو وہاں استحصال کا کیا کام
ہو سکتا ہے۔

احترامِ انسانیت پر مبنی نظام

اسلام میں انسان بجائے خود محترم ہے، وہ
مرکزِ کائنات ہے۔ وہ زمین پر خدا کا خلیفہ ہے اور
اس کی جان و مال و آبرو بلا امتیاز مسلک و مذہب
محترم اور محفوظ ہے۔ اس میں غیر مسلم کی آبرو اور جان
بھی اتنی ہی محترم ہے جتنی مسلمان کی ہے۔ اس میں اگر
گورنر کا لڑکا بھی کسی غیر مسلم پر ہاتھ اٹھائے تو اس
گورنر کے لڑکے پر بھی قانون کا ہاتھ اٹھتا ہے۔
اس میں روٹی، کپڑے، مکان جیسے معمولی حقوق انسانیت
کی ضمانت صرف مسلمانوں کو ہی نہیں غیر مسلموں کو بھی دی
جاتی ہے۔ اس میں بوڑھوں کا احترام ہے جوانوں
سے محبت ہے۔ بچوں پر شفقت ہے، عورتوں کی
عزت ہے۔ کمزوروں کی دست گیری ہے، مہمانوں
کی مہمان نوازی ہے یتیموں کی سرپرستی ہے، بیوگان
کی نگہداشت ہے۔ بیماروں کی عیادت تیمارداری
اور علاج ہے۔ اس میں جنازہ دیکھ کر اس کے احترام
میں کھڑے ہو جانا بھی آدابِ آدمیت میں شامل
ہے۔ اسلام سراسر احترامِ انسانیت پر مبنی نظام
ہے جیسے خود حضورِ اکرمؐ کا مزاجِ گرامی تھا ویسا
اسلام ہے۔

عوام کا اپنا نظام

اسلام ایک خالص مشاورتی اور شورائی
نظام ہے۔ نظامِ مصطفےٰ میں خود حضور اکرمؐ بھی
جن پر وحی اترتی تھی۔ اپنے ساتھیوں سے مشورہ
لیتے اور ان کے مشوروں کا احترام فرماتے تھے۔
حضور اکرمؐ نے معرکۂ بدر میں مشورہ لیا۔ حضورؐ
نے معرکۂ اُحد میں اپنے ساتھیوں کے مشورے
سے اپنی رائے بدل کر کھلے میدان کی جنگ کرنا
قبول فرمایا۔ حضورؐ چھوٹی سے چھوٹی باتوں پر
اپنے ساتھیوں سے مشورہ لیتے تھے۔ اسلام نے
مشورے کو لازم ٹھہرایا ہے۔ وشاورھم
فی الامر "آپ ان سے مسائل میں مشورہ لیجیے"۔
یہ حکم حضور اکرمؐ کو خود اللہ تعالیٰ کی طرف سے
تھا۔ وشوریٰ بینھم وہ باہمی مشورے سے
کام کرتے ہیں، یہ صحابہؓ کی صفت بیان کی
گئی۔ غرض اسلام ایک خالص مشاورتی، شورائی
اور جمہوری نظام ہے۔

اسلام میں جو کام مشورے کے بغیر کیا جائے اس میں برکت نہیں ہوتی۔ جو حاکم مشورے کے بغیر کوئی حکم دیتا ہے وہ خدا تعالیٰ کے ہاں اپنی مسئولیت اور ذمہ داری میں اضافہ کر لیتا ہے۔

تبلیغی نظام

اسلام ایک تبلیغی نظام ہے بلکہ اُس کی حکومت کا مقصد یہ ہے کہ وہ اللہ کا کلمہ بلند کرنے اور نظامِ مصطفےٰ کا جھنڈا چار دانگ عالم میں لہرانے کے لیے تمام مفید اور مؤثر کارروائیاں کرے۔ حضورِ اکرم کے نزدیک اسلامی حکومت کی یہ ذمہ داری اتنی اہم تھی کہ صلح حدیبیہ کے بعد ابھی مسلمان اچھی طرح جمے بھی نہیں تھے کہ آپؐ نے دور و نزدیک کے سلاطین اور حکمرانوں کو دعوتی مکاتیب ارسال کرنے شروع کر دیئے۔ اسلامی ریاست ایک تبلیغی ادارہ ہے اور اُس کا وجود محض ٹیکس وصول کرنا ہی نہیں ہے بلکہ اسلام کی تبلیغ کرنا ہے بلکہ حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز کے دورِ خلافت میں جب اُن کے کردار سے متاثر ہو کر غیر مسلموں کی بہت بڑی تعداد نے اسلام قبول کرنا شروع کر دیا جس سے جزیہ کے ٹیکس میں کمی ہو گئی تو حکام نے خلیفہ راشد کے نام خطوط میں اس تشویش کا اظہار کیا کہ غیر مسلموں کے اسلام قبول کرنے سے ریاست کے محصولات میں کمی واقع ہو جائے گی۔ اس پر حضرت عمر بن عبدالعزیز نے جو جواب لکھا اُسے ہماری تاریخ نے درخشاں طور پر محفوظ رکھا ہے۔ آپ نے لکھا:

" ہمیں اس کی فکر نہیں ہے کہ غیر مسلموں کے مسلمان ہونے سے محصولات کم ہو جائیں گے۔ حضورِ اکرمؐ دنیا میں رسول اور ہادی بنا کر بھیجے گئے تھے محصل بنا کر نہیں بھیجے گئے تھے۔"

(بقیہ : نظامِ مصطفےٰ کے اجرا کے اعلان کا متن)

میرے لئے یہی کافی ہے کہ خلقِ خدا راہ راست پا جائے اور اُمّتِ محمدیہ میں اضافہ ہو۔"

اگر مندرجہ بالا اقدامات کو نہایت پختگی، ثابت قدمی، دیانت داری اور خدا ترسی کے ساتھ بروئے کار لایا جائے تو پہلے ہی چھ ماہ میں ملک کا نقشہ بدل جائے گا۔ اور ایک اسلامی ریاست کا رخ زیبا صفحۂ ہستی پر از سرِ نو اس طرح نمودار ہوگا کہ سارا جہان اس کی تجلی سے روشن ہو جائے گا۔ وہ دن ساری دنیا کے لیے ایک نئے دور کے آغاز کا دن ہوگا۔ •

اگرچہ پاکستان میں مختلف فقہی مذاہب کے پیرو اسلامی نظام کے مطالبہ پر متفق ہیں، ان میں سے کسی نے بھی، خواہ وہ اس ملک کے اندر کتنی ہی اقلیت میں کیوں نہ ہو، فرضی اندیشوں کی بنا پر اس کی مخالفت نہیں ہے بلکہ فقہی گروہوں کے سوا بعض دوسرے فرقوں نے بھی اس مطالبہ میں سواد اعظم کا ساتھ دیا ہے۔ تاہم اس بات کا اندیشہ موجود ہے کہ اسلامی نظام کے مخالفین اپنی ریشہ دوانیوں سے ان میں سے بعض کو بدگمان کرنے کی کوشش کریں۔ اس وجہ سے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ فقہی معاملات میں ایک صحیح اسلامی حکومت کا جو مزاج ہوتا ہے اس کو واضح کر دیا جائے تاکہ ناواقفیت کسی کے لئے بدگمانی کا سبب نہ بن سکے۔ نیز اگر کوئی گروہ کسی غلط توقع کی بنا پر اس کی تائید کر رہا ہو تو وہ اپنی اس غلط فہمی کو وقت سے پہلے رفع کر سکے۔

فقہی معاملات سے متعلق ایک صحیح اسلامی حکومت کا رویہ متعین کرنے کے لئے دو بنیادی باتوں کا سامنے رکھنا ضروری ہے۔

۱۔ ایک یہ کہ ایک اسلامی ریاست ایمان کی تمام جزئیات اور عقائد و اعمال کی تمام تفصیلات سے تعرض نہیں کیا کرتی ہے۔ اس کا تعلق صرف اسلام یعنی ان ظاہری اعمال و عقائد تک محدود ہوتا ہے جو اجتماعی و معاشرتی اور سیاسی زندگی سے لگاؤ رکھنے والے ہوتے ہیں۔ اسلام کے بنیادی عقیدہ یعنی توحید و رسالت کا اقرار کرنا، مسلمانوں کے طریقہ پر نماز ادا کرنا، اسلامی بیت المال کو زکواۃ

دیتے رہنا، نکاح وطلاق اور کھانے پینے میں اسلام کے ٹھہرائے ہوئے ضابطہ حلال وحرام کی پابندی کرنا، بس ریاست کا براہ راست تعلق اسی طرح کے امور سے ہے۔ اگر ایک شخص ان چیزوں میں اسلامی طریقوں کا پابند ہے تو ایک اسلامی حکومت اس سے اس امر پر کوئی باز پرس نہیں کرے گی کہ وہ فقہی مسائل میں امام مالکؒ یا امام احمدؒ کا پیرو کیوں ہے، امام ابوحنیفہؒ یا امام شافعیؒ کا پیرو کیوں نہیں ہے؟ یا عقائد میں معتزلہ کا ہمنوا کیوں ہے، اشعری یا ماتریدی کا کیوں نہیں ہے؟ یا خانقاہی رجحانات کیوں رکھتا ہے، نہایت کٹر قسم کا ظاہری اور اہل حدیث کیوں نہیں ہے۔ اس طرح کے امور سے نہ براہ راست ریاست کا تعلق ہوتا ہے نہ ان امور سے اسلام نے ریاست کو تعرض کرنے کی اجازت دی ہے۔ یہ باتیں افراد کے اپنے فیصلہ کرنے کی ہیں۔ اس سلسلہ میں ریاست کا فرض صرف اس قدر ہے کہ افراد کی آزادی رائے اور آزادی انتخاب کی حفاظت کرے، کسی کو اس آزادی پر دست درازی کرنے کا کوئی موقع نہ دے۔ اگر حکومت کسی غلط رجحان کی اصلاح کی ضرورت محسوس کرتی ہے تو اس کے لئے تعلیمی وتبلیغی ذرائع استعمال کر سکتی ہے، قانون کی طاقت نہیں استعمال کر سکتی۔ تاکہ لوگ جو تبدیلی قبول کریں وہ اپنی آزادی رائے کے ساتھ قبول کریں نہ کہ جبر وزور کی وجہ سے۔ حکومت کو ہرگز یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ ان چیزوں کے اندر قانون اور طاقت کے ذریعہ سے کوئی تبدیلی پیدا کرنے کی کوشش کرے اگر وہ ایسا کرے گی تو اپنے جائز حدود سے تجاوز کرنے کی مجرم ہوگی

> اگر حکومت کسی غلط رجحان کی اصلاح کی ضرورت محسوس کرتی ہے تو اس کے لیے تعلیمی وتبلیغی ذرائع استعمال کر سکتی ہے

اور افراد کی شہری آزادی پر حملہ کرے گی جس کی حفاظت کا خدا اور رسول کے نام پر اس نے ذمہ لیا ہے۔

اس میں شبہ نہیں ہے کہ خلافت راشدہ کے بعد مسلمان حکومتوں نے افراد کی اس بنیادی

آزادی کو بسا اوقات سلب کرنے کی کوشش کی
ہے۔ اس کے سبب سے بے شمار مسلمانوں کے
جان و مال مظالم کے شکار ہوتے ہیں۔ بہت سے
ائمہ کرام کو بھی نشانہ ستم بنایا گیا ہے اور حکومتوں کے
مراکز اور بادشاہوں کے دربار مختلف گروہوں کی
سازشوں کے اڈے بنے رہے ہیں لیکن یہ ساری
باتیں اس بات کے سبب سے نہیں تھیں کہ اسلام
نے حکومت کو لوگوں کے اعمال و عقائد کی جزئیات
میں دخل دینے کا حق دیا ہے۔ بلکہ یہ مستبد حکمرانوں
کی اپنی زیادتیاں تھیں کہ انھوں نے فقہ و کلام میں
جو مسلک خود اختیار کیا اس مسلک کو تمام خلق پر
بالجبر مسلط کر دینا چاہا۔ ایک صحیح اسلامی حکومت
جو خلافت راشدہ کے نمونہ پر قائم ہو اس کے لئے
اس امر کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ وہ کلام و فقہ
کے مختلف مسلک لوگوں کے ذہنوں پر بالجبر
ٹھونسنے کی حقدار نہیں ہے۔

۲۔ دوسری اہم حقیقت یہ ہے کہ ایک صحیح
اسلامی ریاست کسی متعین امام کی تقلید اور کسی
متعین فقہ کی پیروی کے اصول پر قائم نہیں ہو سکتی
بلکہ یہ لازم ہے کہ اس کی بنیاد براہ راست کتاب
و سنت اور اجتہاد و شوریٰ پر ہو۔ دوسرے الفاظ
میں اس کے معنی یہ ہیں کہ پوری فقہ اسلامی بلا کسی
استثناء و امتیاز کے اس کا سرمایہ ہو اور وہ تمام
اجتہادی امور میں کسی تخصیص و ترجیح کے بغیر

ایک صحیح اسلامی حکومت جو خلافت راشدہ کے نمونے پر قائم ہو اس کیلئے اس امر کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ وہ کلام و فقہ کے مختلف مسلک لوگوں کے ذہنوں پر بالجبر ٹھونسنے کی حقدار نہیں ہے۔

مختلف ائمہ کے اجتہادات پر نگاہ ڈال کر اپنے
قانون کے لئے ان اقوال اور رایوں کو انتخاب کرے
جو اس کی نظر میں کتاب و سنت اور روح اسلام سے
قریب تر نظر آئیں۔ جن امور سے متعلق اس کو پچھلے
ائمہ کے اجتہادات میں کوئی بات نہ ملے تو کتاب و سنت
کے تقاضوں کو پیش نظر رکھ کر وہ خود ان کا حل معلوم
کرنے کی کوشش کرے پچھلے ائمہ کے جو اقوال انتخاب
کئے جائیں گے ان میں وقتاً فوقتاً تبدیلیاں بھی
ہو سکیں گی۔ یہ عین ممکن ہے کہ آج سابق ائمہ میں

سے کسی کے کسی قول کو قانون کی حیثیت دے دی جائے لیکن کل دلائل کی قوت واضح ہونے کے بعد اس کی جگہ کسی اور کے قول کو اختیار کرلیا جائے ہمارے مختلف فقہی گروہوں میں سے ہر گروہ کا مسلک و مذہب حکومت کی نگاہوں میں یکساں عزت و احترام کا مستحق ہوگا اور ہر گروہ کے لوگوں کو اس بات کا پورا پورا موقع حاصل رہے گا کہ وہ اپنے اپنے مسلک و مذہب کے دلائل اور اس کی خوبیاں برابر پیش کرتے رہیں تاکہ ہمارے ائمہ کے چھوڑے ہوئے ذخیرہ کے اندر جس قدر جواہر موجود ہیں وہ برابر نکھر نکھر کے سامنے آتے رہیں اور قانون کی تدوین کرنے والوں کو ان کے انتخاب میں آسانی ہو۔

اس طریقہ پر حکومت اپنے عمل کے لئے جو قانون بنالے گی ملک کا نظام اسی قانون کے مطابق چلے گا۔ عدالتیں بھی قانون کے مطابق مقدمات کے فیصلے کریں گی اور ہر شہری کو ان فیصلوں کی بے چوں چرا تعمیل کرنی پڑے گی لیکن ایک شخصی رائے کی حیثیت سے ایک شخص کوئی ایسا مسلک اختیار کرسکے گا جو حکومت کے اختیار کردہ مسلک سے الگ ہو اور وہ اپنے اس مسلک کی حمایت میں زبان اور قلم کی قوت بھی استعمال کرسکے گا۔ وہ حکومت کے احکام و قوانین کی اطاعت کرتے ہوئے اس بات کا حق رکھے گا کہ وہ جس مسلک کو زیادہ قوی اور زیادہ مدلل سمجھتا ہے ایک رائے کی حیثیت سے اس کو پیش کرے۔ خلافت راشدہ

نظام اسلام

اخلاقی لحاظ سے:
ایک نظام مساوات ہے

سیاسی لحاظ سے:
نظام حفاظت و عدل ہے

معاشی لحاظ سے:
نظام دستگیری و کفالت ہے

روحانی لحاظ سے:
نظام ذکر و فکر اور للّٰہیت ہے

معاشرتی لحاظ سے:
نظام اخوت ہے

اس کا ہر پہلو اور گوشہ رحمت ہی رحمت ہے۔

کے زمانہ میں ایسے کتنے مسائل پیش آتے تھے جن میں امیر اور شوریٰ کے فیصلوں سے بہت سے لوگوں کو اختلاف ہوتا تھا۔ اگرچہ اختلاف کرنے والے اطاعت بہرصورت امیر کے فیصلوں ہی کی کرتے تھے لیکن وہ رائے کی حد تک بدستور اپنے مسلک پر قائم رہتے اور علانیہ اپنی رائے کی پبلک میں تائید و حمایت حاصل کرتے۔ اس کی ایک عمدہ مثال منیٰ میں حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے نماز قصر نہ کرنے کا واقعہ ہے۔ بہت سے لوگوں نے حضرت عثمانؓ کے اس مسلک سے پوری شدت کے ساتھ اختلاف کیا لیکن جب نماز کا وقت آیا تو اختلاف کرنے والوں نے بحیثیت امیر کے نماز حضرت عثمانؓ ہی کی اقتدا میں انہی کے مسلک کے مطابق ادا کی اس مسئلہ میں لوگوں کو حضرت عثمان غنی کے مسلک سے جو اختلاف تھا وہ ان کے زمانہ میں بھی باقی رہا اور آج بھی باقی ہے۔

یہ اسی پابندی نظام اور آزادی رائے کی برکت ہے کہ خلافت راشدہ کے دور میں ملک کا نظام بھی پورے استحکام کے ساتھ قائم رہا اور فکر و اجتہاد کے لئے وہ سارا مواد بھی اسی زمانہ میں فراہم ہوگیا جس سے بعد میں اسلامی فقہ کی مختلف عمارتیں تیار ہوئیں۔ ایک صحیح اسلامی حکومت کے مزاج کا اصلی تقاضا یہی ہوتا ہے کہ لوگ تقلید کی بندشوں سے آزاد ہوکر فکر و اجتہاد سے کام لیں۔ لیکن کوئی گروہ اگر اپنی خواہش کے خلاف تقلید کی بندشوں ہی میں جکڑا ہوا رہنا پسند کرتا ہے تو حکومت اس کی اس خواہش میں بھی خلل انداز ہونا پسند نہیں کرتی بشرطیکہ وہ گروہ خود حکومت سے یہ مطالبہ نہ کرے کہ وہ بھی اسی کی طرح فکر و اجتہاد سے استعفا دے کر اپنے پاؤں میں تقلید کی بیڑیاں ڈال لے۔ عامۃ الناس کا کوئی گروہ تقلید کی بندشوں میں بندھا ہوا فکر بھی زندگی کے مقررہ دن کسی نہ کسی طرح پورے کر سکتا ہے۔ لیکن ایک حکومت، اور وہ بھی ایک اسلامی حکومت، تقلید کی جکڑ بند کے اندر

وہ دن بھی اپنی ہستی اپنے اصولوں کے مطابق باقی نہیں رکھ سکتی۔

ماضی میں جو حکومتیں کسی متعین فقہ کی تقلید کے اصول پر قائم ہوئیں یا آج جو اس اصول پر قائم ہیں یہ صحیح اسلامی حکومت کا نمونہ نہیں ہیں کسی متعین فقہ کو نہ تو کتاب و سنت کا بدل قرار دیا جاسکتا اور نہ فقہ کے مختلف ائمہ میں سے کسی امام کو رسول اللہ کا درجہ دیا جاسکتا ہے اس لئے اس طرح کی حکومتوں کو اسلامی حکومت کہنا اسلامی نظریہ سلطنت سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔ اسلامی سلطنت کے لئے یہ بنیادی شرط ہے کہ اس کی اساس براہ راست کتاب و سنت اور اجتہاد و شوریٰ پر ہو یہ حکومتیں اس کے بالکل برعکس یا تو اس اصول پر قائم ہوئیں کہ جو فقہی مذہب حکمراں کا ہوا اس نے اسی مذہب کو سارے ملک پر لاد دینا چاہا یا ملک کے باشندوں کی اکثریت جس فقہی مسلک کی پابند تھی اس کو پورے ملک کا مذہب بنا دیا گیا۔ یہ دونوں باتیں اسلامی نظریہ سلطنت کے خلاف ہیں۔ اس مسئلہ پر ہم نے اپنی کتاب "اسلامی ریاست" میں مفصل بحث کی ہے۔ اس وجہ سے یہاں اس کی تفصیل کی ضرورت نہیں ہے۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی کہ ایک اسلامی حکومت اول تو ان جزوی باتوں سے کوئی تعرض نہیں کرتی جن کا تعلق انفرادی زندگی سے ہوتا ہے، وہ اپنا براہ راست تعلق صرف انہی امور سے رکھتی ہے جو اجتماعی اور سیاسی زندگی سے تعلق رکھنے والے ہوتے ہیں۔ ثانیاً وہ ان امور میں بھی معاملات کو کسی خاص زاویہ نگاہ سے دیکھنے کے بجائے براہ راست کتاب و سنت کے ان اصولوں سے رہنمائی حاصل کرتی ہے جن پر تمام مسلمانوں کو اتفاق ہے۔ اس طرح ایک اسلامی ریاست کا ہر شہری اس بات میں بالکل آزاد ہوتا ہے کہ وہ اپنی انفرادی زندگی کے دائرہ میں جس فقہی و کلامی مسلک کو ترجیح دیتا ہے اس کو اختیار کرے بشرطیکہ اصل دین کے اندر اس کے لئے گنجائش موجود ہو۔ رہے اجتماعی مسائل تو ان کے بارہ میں اظہار رائے کی آزادی ہر شخص کو حاصل رہتی ہے البتہ جب حکومت کسی ایک پہلو کو اختیار کر لیتی ہے تو اطاعت ہر شخص کو اسی کی کرنی پڑتی ہے اور اس طرح آزادی رائے کے باوجود کسی اختلاف یا کسی فتنہ کی گنجائش نہیں رہتی

ہماری کچھ نئی کتابیں
درسِ قرآن ۵/۵۰
درسِ حدیث ۶/=
اسلامی آداب
حقوق وفرائض
انجیل برناباس کا خلاصہ ۱/۲۰
دعائیں ہندی (پاکٹ سائز) ۲/=
متفرق کتب
پسپائی ۳/۵۰
قادیانی کیوں مسلمان نہیں؟ ۳/=
کاروانِ مدینہ ۱۲/=
طوفان سے ساحل تک ۷/=
نقوشِ اقبال ۱۴/=
بریلوی فتنے کا نیا روپ ۶/=
ہندوستان کی کہانی ۱/۲۵
کلیاتِ اقبال ۱۲/=
کلیاتِ شبلی ۳/۷۵
مثنوی مولانا روم ۲۲/=
مغربی تہذیب کا آغاز وانجام ۷/=
نیرنگِ خیال ۳/=
بہشتی زیور مکمل مدلل محشی ۴۰/=
قادیانیت کے جیب وگریباں ۳/۲۵
مکتبہ الحسنات رامپور یوپی ۲۴۴۹۰۱

ابوالاعلیٰ مودودی

قیادت اور اہل منصب کے انتخاب کے اصول

اسلامی حکومت میں قیادت کے انتخاب کا اصول بھی دوسری حکومتوں سے بہت مختلف ہے۔ یہاں اصل چیز اہلیت، امانت، دیانت تقویٰ اور حسن سلوک ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ یَامُرُکُمْ اَن تُؤَدُّوا الاَمٰنٰتِ اِلٰی اَھْلِھَا وَاِذَا حَکَمْتُمْ بَیْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْکُمُوْا بِالْعَدْلِ اِنَّ اللّٰہَ نِعِمَّا یَعِظُکُمْ بِہٖ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ سَمِیْعًا بَصِیْرًا ہ

"مسلمانو! اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں اہلِ امانت کے سپرد کرو اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ کرو۔ اللہ تم کو نہایت عمدہ نصیحت کرتا ہے اور یقیناً اللہ سب کچھ سنتا اور دیکھتا ہے۔ ۷۰

یعنی تم اُن برائیوں سے بچے رہنا جن میں بنی اسرائیل مبتلا ہو گئے ہیں بنی اسرائیل کی بنیادی غلطیوں میں سے ایک یہ تھی کہ انھوں نے اپنے انحطاط کے زمانہ میں امانتیں یعنی ذمہ داری کے منصب اور مذہبی پیشوائی اور قومی سرداری کے رُتبے۔ (Position of Trust) ایسے لوگوں کو دینے شروع کر دیئے جو نااہل، کم ظرف بداخلاق، بددیانت اور بدکار تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بُرے لوگوں کی قیادت میں ساری قوم خراب ہوتی چلی گئی۔ مسلمانوں کو ہدایت کی جا رہی ہے کہ تم ایسا نہ کرنا، بلکہ امانتیں اُن لوگوں کے سپرد کر دینا جو اُن کے اہل ہوں، یعنی جن میں بارِ امانت

اٹھانے کی صلاحیت ہو۔ بنی اسرائیل کی دوسری بڑی کمزوری یہ تھی کہ وہ انصاف کی روح سے خالی ہو گئے تھے۔ وہ شخصی اور قومی اغراض کے لیے بے تکلف ایمان نگل جاتے تھے۔ صریح ہٹ دھرمی برت جاتے تھے۔ انصاف کے گلے پر چھری پھیرنے میں انہیں ذرا تامل نہ ہوتا تھا، ان کی بے انصافی کا تلخ ترین تجربہ اس زمانے میں خود مسلمانوں کو ہو رہا تھا ایک طرف ان کے سامنے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان پر ایمان لانے والوں کی پاکیزہ زندگیاں تھیں۔ دوسری طرف وہ لوگ تھے جو بتوں کو پوج رہے تھے۔ بیٹیوں کو زندہ گاڑتے تھے سوتیلی ماؤں تک سے نکاح کر لیتے تھے اور کعبے کے گرد مادر زاد ننگے ہو کر طواف کرتے تھے۔ یہ نام نہاد اہلِ کتاب ان میں سے دوسرے گروہ کو پہلے گروہ پر ترجیح دیتے تھے۔ اور ان کو یہ کہتے ہوئے ذرا شرم نہ آتی تھی کہ پہلے گروہ کے مقابلہ میں یہ دوسرا گروہ زیادہ صحیح راستے پر ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی اس بے انصافی پر تنبیہہ کرنے کے بعد اب مسلمانوں کو ہدایت کرتا ہے کہ تم کہیں ایسے بے انصاف نہ بن جانا، خواہ کسی سے دوستی ہو یا دشمنی، بہرحال بات جب کہو، انصاف کی کہو، اور فیصلہ جب کرو عدل کے ساتھ کرو۔

(تفہیم القرآن جلد اوّل صفحات ۳۶۲۔۳۶۳)

وَلَا تُطِيعُوٓا أَمْرَ الْمُسْرِفِينَ ۙ الَّذِينَ يُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ وَلَا يُصْلِحُونَ ۝ (الشعراء ۱۵۱-۱۵۲)

"اُن بے لگام لوگوں کی اطاعت نہ کرو جو زمین میں فساد برپا کرتے ہیں اور کوئی اصلاح نہیں کرتے۔"

یعنی اپنے اُن امرا و رؤسا اور اُن رہنماؤں اور حاکموں کی اطاعت چھوڑ دو جن کی قیادت میں تمہارا یہ فاسد نظامِ زندگی چل رہا ہے، یہ مسرف لوگ ہیں" اخلاق کی ساری حدیں پھاند کر شترِ بے مہار بن چکے ہیں۔ ان کے ہاتھوں سے کوئی اصلاح نہیں ہو سکتی۔ یہ جس نظام کو چلائیں گے۔ اس میں بگاڑ ہی پھیلے گا۔ تمہارے لیے فلاح کی کوئی صورت اگر ہے تو صرف یہ کہ اپنے اندر خدا ترسی پیدا کرو اور مفسدوں کی اطاعت چھوڑ کر میری اطاعت کرو، کسی ذاتی فائدے کے لیے اصلاح کا یہ کام کرنے نہیں اٹھا ہوں۔

یہ تھا وہ مختصر منشور جو حضرت صالح علیہ السلام نے اپنی قوم کے سامنے پیش کیا۔ اس میں صرف مذہبی تبلیغ ہی نہ تھی، تمدنی، واخلاقی اصلاح اور سیاسی انقلاب کی دعوت بھی ساتھ ساتھ موجود تھی۔

(تفہیم القرآن جلد سوم صفحہ ۵۲۴)

وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا۔ (الکہف: ۲۸)

"کسی ایسے شخص کی اطاعت نہ کرو جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے اور جس نے اپنی خواہش نفس کی پیروی اختیار کر لی ہے اور جس کا طریق کار افراط و تفریط پر مبنی ہے۔"

یعنی اس کی بات نہ مانو، اس کے آگے نہ جھکو، اس کا منشا پورا نہ کرو۔ اور اس کے کہے پر نہ چلو۔ یہاں اطاعت کا لفظ اپنے وسیع مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔

مطلب تو وہ ہے جو ہم نے ترجمے میں اختیار کیا ہے اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ "جو حق کو پیچھے چھوڑ کر اور اخلاقی حدود کو توڑ کر بگ ٹٹ چلنے والا ہو۔" دونوں صورتوں میں حاصل ایک ہی ہے جو شخص خدا کو بھول کر اپنے نفس کا بندہ بن جاتا ہے اس کے ہر کام میں بے اعتدالی پیدا ہو جاتی ہے اور وہ حدود نا آشنا ہو کر رہ جاتا ہے۔ ایسے آدمی کی اطاعت کرنے کے معنی یہ ہیں کہ اطاعت کرنے والا خود بھی حدود نا آشنا ہو جائے اور جس جس وادی میں مطاع بھٹکے اسی میں مطیع بھی بھٹکتا چلا جائے۔ (تفہیم القرآن سے)

"ایک مسلمان ایمان کا تقاضہ صرف یہی نہیں ہے کہ وہ کچھ خاص نظریات اور عقائد میں ایمان رکھے اور ان کے مطابق زندگی گزارے ___ بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ جبر کو استعمال کیے بنا ہر ممکنہ قوت اس امر کے لیے استعمال کرے کہ دوسرے لوگ بھی انہی تصورات کے مطابق زندگی گزاریں۔ قرآن پاک میں اس چیز کو امر بالمعروف سے تعبیر کیا گیا ہے۔"

مولانا محمد علی جوہر

(مقدمہ کراچی میں ایک بیان کا اقتباس)

(شہر جلیل[1] کے قریب سے ایک وادی سے آواز آتی ہے)

یہ آزمائشِ طاقت یہ شوقِ خود نگری
یہ ظلم و جہل کا طوفاں یہ زعم بے خبری

سینا[2] سیاست کے دھوکے یہ مصلحت کے فریب
خرد تراش رہی ہے مسائلِ نظری

ہوس کے ہاتھ میں اب بھی ہے تیغِ خوں آشام
لہو سے کھیل رہی ہے جنوں کی بے جگری

کہاں ہدایتِ درس خروج[3] و استثنا[4]
کہیں کہیں نظر آتے ہیں کتبۂ عبری[5]

مکاشفات[6] کی گرمی نہ سوزِ یوحنا
کمالِ بے بصری و تمام بے اثری

مری نگاہ میں تھی صلح و آشتی کی بہار
مرے نفس نے کھلایا تھا غنچۂ سحری

نہ برگ و بار ہی باقی نہ وہ ہوائے نشاط
مرے نہالِ تمنا کی ہائے بے اثری

مرے ضمیر پہ وہ راز ہو چکے ہیں فاش
نہیں ہوئی ہے زمانہ میں جن کی پردہ دری

---

[1] گلی لی (GALILI) جہاں حضرت مسیح علیہ السلام نے وعظ فرمایا تھا۔ [2] مقدس تورات کی دوسری اور پانچویں کتابیں [3][4] آیات تورات عبرانی زبان میں کہیں کہیں لکھی ہوئی نظر آتی ہیں۔ [5] [6] مکاشفات یوحنا ـ جن کو حضرت مسیح کے مواعظ کا خلاصہ سمجھا جاتا ہے۔

خلافتِ الٰہی

(اس کے بعد فضا میں ارتعاش پیدا ہوتا ہے۔ زمان و مکان کے پردے اٹھتے چلے جاتے ہیں ــــ اتنے میں شخصیتیں نمودار ہونے لگتی ہیں)

نپولین :ــــــــ

سمندِ عزم مرا شوخ و تیز گام بھی تھا | کہ میرے قلب میں اک جوششِ انتقام بھی تھا
مرے خیال میں طوفاں تھے فتح مندی کے | مری نگاہ میں انساں کا احترام بھی تھا
نہ صرف تیغ جہاں گیر میرے ہاتھ میں تھی | مری زبان پہ رُوح القدس کا نام بھی تھا

وہ نسل و رنگ کی کشتی وہ قومیت کا جہاز
اُسی میں آپ کا یہ ناسزا غلام بھی تھا

زارِ رُوس :ــــــــ

خطا شعار بھی تھے اور گناہگار بھی تھے | بہت سے میرے جہاں میں شریک کار بھی تھے
ہے امتیازِ گل و خار عدل کی توہین | چمن میں سرو و صنوبر نہیں چنار بھی تھے
اُس انقلاب سے دل تنگ ہیں جہاں والے | کہ جس کے واسطے کچھ لوگ بیقرار بھی تھے

وہ بھوک جو کہ ہے بنیاد نو صنوبیت کی
تباہیوں کے اُسی بھوک میں شرار بھی تھے

لینن :ــــــــ

عوام تخت حکومت کو توڑ سکتے ہیں | یہ راز دہر پہ کرنا تھا آشکار مجھے
اُفق سے آتش و خوں کے طلوعِ مہر ہوا | خزاں نے آکے دیا مژدۂ بہار مجھے
دیا تھا میں نے ہی شاہنشہی کو بپتسمہ [1] | ملا عوام سے جس وقت اختیار مجھے

مگر ابھی مرے دل میں خلش سی باقی ہے
جو بعدِ مرگ بھی رکھتی ہے بیقرار مجھے

---

[1] انارکزم

خلافتِ الٰہی

(نہایت ہی خاموشی کے ساتھ نیچی نگاہ کیے ہوئے تخت نورانی کے نیچے سے ایک شخصیت نمودار ہوتی ہے، جیسے یہ بن بُلائے یہاں آگئی ہے)

سراج الدین شاہ ظفر:

لہو کا داغ چھپائے سے چھپ نہیں سکتا — ولیل شعلے کو شبنم بنا نہیں سکتی
وہ بدنصیب کہ جس کا ہو بے گناہی جرم — اُسے جہاں کی فضا راس آ نہیں سکتی
مری نگاہ نے دیکھے ہیں وہ مناظر بھی — کہ جن کی چشم فلک تاب لا نہیں سکتی

سلام قصرِ معلّے کے شہ نشینوں کو
یہاں عروسِ سحر مسکرا نہیں سکتی

(فضا میں غیر معمولی حرکت پیدا ہوتی ہے۔ اتنے میں ایک ستارہ ٹوٹ کر گرتا ہے اور اُس سے ایک وجود ظاہر ہوتا ہے)

حافظ شیرازی:

زبانِ حال پہ نغمہ بھی بن گیا فریاد — کہاں گئی وہ مری سرزمینِ رُکنا باد
ہے کس عذاب میں شیرازہ بندی گلگشت — کسی روش پہ ہے گلچیں کسی طرف صیّاد
یہ اقتدار و سیاست کی وادی پُرپیچ — کہ دیکھنے میں ہے گویا غلام بھی آزاد

بچشمِ خود نگرم سطوت و شکوہِ عجم
ز اوجِ بامِ ثریا بہ سطحِ خاک اُفتاد

(بزم میں خاموشی طاری ہوگئی۔ ایک شخصیت نمودار ہوتی ہے)

انور پاشا:

یہ خود فروش سیاست یہ خانہ ساز اصول — اسی کا نام ہے فکر و عمل کی گمراہی
درندگی کی ہیں خوگر مسیح کی بھیڑیں — نہ ذوقِ حق نگری ہے نہ وہ نمود آگاہی
بغیر جذبِ یقیں ہر عمل ہے فتنہ ساز — ہزار توپ اور اک ضربتِ یدُ اللٰہی

خلافتِ الٰہی

فرنگ جلوہ گر داد رسم آذر را

حذر ز اہلِ سیاست اگر خدا خواہی

(سب ایک دوسرے کا منہ تکنے لگتے ہیں)

ولسن سابق صدر ریاستہائے متحدہ امریکہ:

یہی ہیں ڈھونگ زمانہ میں سربلندی کے ۔۔۔ اڑاؤ پرچم رنگین فتحمندی کے

شکست خوردہ جو اقوام اور ممالک ہیں ۔۔۔ بتاؤ اُن کو طریقے نیازمندی کے

مرے اصول کی نہ کوئی پا نہیں سکتا

بہت مہین سے نکلے ہیں خود پسندی کے

(اتنے میں ایک سفینہ نظر آتا ہے جس کے بادبان پر "تہذیبِ حاضر" لکھا ہوا ہے طوفانی موجیں اس اس سفینہ کو بُری طرح ہچکولے دے رہی ہیں۔ سفینہ ڈوب جاتا ہے اور سطحِ آب پر یہ عبارت نورانی حروف میں لکھی ہوئی دکھائی دیتی ہے)

کوئی دماغ بھی اب کام کر نہیں سکتا ۔۔۔ سفینہ ڈوب کے پھر سے اُبھر نہیں سکتا

وہ دیکھو حق و صداقت کا لشکر آ پہنچا ۔۔۔ کہ جس کے سامنے باطل ٹھہر نہیں سکتا

عالمِ برزخ کی جگہ عالم کون و فساد (جہانِ آب وگل) نظر آتا ہے جہاں عدل و انصاف کے چشمے اُبل رہے ہیں اور یقین و صداقت کا آفتاب طلوع ہو رہا ہے اور انسانوں کی بادشاہت کی جگہ "خلافت الٰہی" قائم ہے۔

آخری آواز:

یہ دین اور سیاست کا امتزاجِ لطیف ۔۔۔ اسی کو آخری دستور بن کے رہنا تھا

خدا کا خوف بھی ہے پاسِ آدمیت بھی ۔۔۔ زمیں کو عدل سے معمور بن کے رہنا تھا

یقین و عدل و صداقت کا دور دورہ ہے ۔۔۔ کہ ظلم و جہل کو مجبور بن کے رہنا تھا

یہی نظام ہے فطرت کا حاصل و مقصود ۔۔۔ بہ رُوحِ پاک محمدؐ درودِ نامحدود

نعیم صدیقی

اسلامی اصولِ انتخاب

اسلامی سیاسیات میں انتخاب کے چار بنیادی اصولوں کا سراغ ملتا ہے اور خلافت راشدہ کے انتخابات میں یہ چاروں اصول پوری طرح کار فرما تھے۔ یہاں ہم فرداً فرداً ان کا تذکرہ کرتے ہیں لیکن اصول انتخاب سے قبل نفسِ "انتخاب امارت" کی شرعی حیثیت کا سوال غور طلب ہے۔

انتخاب امارت کی شرعی حیثیت

اس مسئلے کی طرف توجہ کرتے ہی پہلا سوال یہ سامنے آتا ہے۔ کہ قیام امارت (نصب امام) آیا شرعاً کوئی ضروری چیز ہے؟ یعنی اگر مسلمان بلا امارت کے ہوں تو کیا وہ از روئے کتاب و سنت عند اللہ مجرم ہوں گے؟

اس سوال کا جواب کسی تفصیل میں جائے بغیر قرآن کی اس آیت سے ملتا ہے۔ کہ "اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم" یہ آیت خود بتاتی ہے کہ مسلمانوں کو ہمیشہ اپنے اندر سے "اولی الامر" متعین کرنے چاہئیں اور پھر اُن کی اطاعت پر قائم رہنا چاہیئے۔

حدیث میں "علیکم بالجماعۃ" کی جو تاکید ہے اور جماعت سے بچھڑنے یا انتشار میں پڑنے پر جو وعید ہے۔ وہ بھی شہادت دیتی ہے کہ مسلمانوں کے اندر امارت کا قائم رہنا شرعاً مطلوب ہے۔ کیونکہ جماعت بغیر امارت نہیں ہوا کرتی۔

علاوہ بریں جس دین میں نماز کے لئے، سفر کرنے والے قافلوں کے لئے، حج کے لئے، جہاد کے لئے، مجلس کے لئے، تبلیغی وفود کے

لیے اور ہر اجتماعی ہیئت کے لیے امارت کو واجب ٹھہرایا گیا ہو۔ اس میں آخر ہیئت سیاسی در ہیئت معاشری کے لیے وجوب امارت کیوں نہ ہوگا؟ چنانچہ واضح حکم ہے کہ "تلزم جماعۃ المسلمین وامامھم" اپنے لئے جماعت مسلمین اور ان کے امیر کے ساتھ وابستگی کو لازم رکھو! دوسرے لفظوں میں نظام جماعت اور نظام امارت کا موجود رکھنا خود واجب قرار پاتا ہے

پس یہ بات بالکل واضح ہے کہ مسلمانوں کے اندر اگر اسلامی نظام جماعت اور اسلامی نظام امارت معطل ہو اور وہ اس کے لیے ذمہ داری محسوس نہ کریں تو وہ عنداللہ مجرم قرار پاتے ہیں۔

دوسرا سوال اس معاملے میں یہ پیدا ہوتا ہے کہ امام کا تعین وتقرر کس کا کام ہے؟ ــــ خود امت کا یا کسی اور کا؟ اس سوال کے بظاہر دو جواب دیئے گئے ہیں۔ لیکن درحقیقت وہ دونوں ایک ہی نتیجے پر پہنچاتے ہیں۔

تمام علماء کا اجتماع اس بات پر ہے۔ کہ نصب امام یا انتخاب امارت خود مسلمان امت کا فریضہ ہے۔

تاہم اصل سوال یہ ہے کہ امام اگر مامور من اللہ بھی ہو تو بھی ناگزیر ہے کہ امت کے عوام اس کی اطاعت کو قبول کرنے پر آمادہ ہوں۔ تب اس کی امارت نافذالعمل ہوگی۔

اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ پہلے انہیں معلوم کرایا جائے کہ فلاں شخص مامور من اللہ ہے پھر وہ اس دعوے کو تسلیم کریں۔ پھر بیعت طاعت کریں۔ ورنہ اللہ کا مامور کردہ امام الگ پڑا رہ جائے گا۔ اور غیر مامور منتخب ہو جائے گا۔ عملاً شیعی نظریہ بھی انتخاب کی اہمیت اور امت کے عوام کے اجماع کے موثر ہونے کی تردید نہیں کرسکتا۔ پس دونوں نظریوں کا اختلاف درحقیقت "معیار انتخاب" کا اختلاف ہے کہ کون اس قابل ہو سکتا ہے کہ اسے امت خلیفہ یا امیر تسلیم کرے

اب ہم اصول انتخاب پر گفتگو شروع کرتے ہیں

استصواب (اعتماد عمومی)

قرآن نے "وامرھم شوریٰ بینھم" کہہ کر واجب کر دیا کہ زندگی کے جملہ معاملات ــــ خصوصاً سیاست وتمدن کے مسائل میں جماعت مسلمین کے اندر باہمی مشاورت کا اصول کارفرما ہونا چاہیئے۔ خود نبی صلعم کو ہدایت دی

گئی۔ کہ "وشاورھم فی الامر" ـــ کہ سلطنت کے معاملات میں مسلمانوں سے مشورہ کرتے رہیئے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا امارت یا دوسرے مناصب کے لئے موزوں افراد کا انتخاب کرنا اس لفظ "امر" کے مفہوم میں داخل نہیں ہے۔ جس کے لیے مشورہ کو واجب ٹھہرایا گیا ہے؟ ظاہر ہے کہ اس سوال کا جواب نفی میں نہیں دیا جاسکتا۔ واجب ہے کہ مسلمانوں کا مشورہ اہم مناصب کے لیے اشخاص کو چھانٹنے میں کام کرے۔

اس موقع پر جب ہم اسلام کے نیابتی نگرانی کے تصور کو سامنے رکھتے ہیں تو ہماری نگاہ آیت استخلاف پر جاتی ہے۔ جس میں آتا ہے۔ کہ "لیستخلفنکم فی الارض کما استخلف الذین من قبلکم" یہ آیت خلافت کے عوامی ہونے پر صریحاً گواہ ہے۔ یعنی استخلاف فی الارض یا خلافت و نیابت الٰہی کی نعمت جب دی جاتی ہے تو امت مسلمہ کے ہر فرد کو دی جاتی ہے ظاہر بات ہے کہ نیابتی اختیارات کو کسی ایک فرد میں مرتکز کرنا خود ان افراد کا کام ہے جو ان کے امین ٹھہرائے گئے ہیں اور جب تک برضا و رغبت امانت خلافت کو کسی ایک فرد کے حوالے نہ کریں امارت کا قیام شرعاً واقع ہی نہیں ہو سکتا

ایک حدیث جس میں نبی صلعم نے فرمایا ہے کہ خیار ائمتکم الذین یحبونھم و یحبونکم اور دوسری طرف فرمایا شرار ائمتکم الذین یبغضونھم و یبغضونکم بجائے خود یہ واضح کرتی ہے کہ اسلامی نقطہ نگاہ سے صالح امارت وہ ہے جس پر عوام کا اعتماد ہو اور جس سے عوام کو محبت ہو۔ اس اعتماد و محبت کے لئے کوئی صورت بجز اس کے نہیں ہو سکتی کہ رائے عام کو امارت کے انتخاب کا حق دیا جائے۔ یہی حق ہے جو شریعت نے فی الواقع دیا ہے۔ شرعاً امارت اور دوسرے مناصب کے لیے عوام سے استصواب اور مشورہ کرنا واجب ہے۔

امیر کے متعلق "نقض الکتاب الاسلام والحکم" کے مصنف کہتے ہیں کہ یجب ان یکون مکرماً بین الناس ای غیر مھان، لیکون مطاعا یعنی امیر کو عوام میں معزز POPULAR ہونا چاہیئے۔ تاکہ اس کی اطاعت کی جائے۔ اس

کا پیمانہ کہ کون کتنا معزز ہے بجز رائے دہندگی
عوام کے اور کوئی نہیں ہوسکتا۔

یہ تو ہوا اصول! ــــ لیکن سوال کیا جائے
گا کہ آخر خلافت راشدہ میں کب ایسا ہوا کہ ہر
ہر فرد مملکت سے باضابطہ ووٹ لیا گیا ہو؟
اب اس سوال کے جواب میں چند تصریحات پیش
کرنا ضروری ہیں؟

اصول بہ حیثیت اصول اپنی جگہ، اور عملاً
ایک خاص ملک اور زمانے کے حالات اپنی جگہ
آج سے ساڑھے تیرہ سو سال پہلے کا عرب ایسے
ذرائع و وسائل نہیں رکھتا تھا کہ سارے ملک
میں بیک وقت انتخاب واقع ہو۔ اور بغیر اس
کے کہ نظم میں خلل آئے سابق امارت کی جگہ نئی
امارت برسرِ عمل آجائے۔ وہاں اگر ہر شہری کے
حق رائے دہی کے اصول پر باضابطہ انتخاب
لڑے جاتے تو پورے ملک کی رائے لینے میں
چند مہینوں کا صرف ہو جانا ناگزیر تھا ــــ اور اتنی
لمبی مدت میں کسی مستقل امارت کا موجود نہ ہونا
سارے نظم کو برباد کرنے کا موجب ہوسکتا تھا۔

علاوہ بریں اس امر واقعہ کو بھی فراموش
نہیں کیا جاسکتا کہ قبائلی سسٹم کے خوگر عربوں
کے عوام میں عملاً سیاسی معاملات میں
مداخلت کرنے کی مشق و مہارت موجود ہی
نہیں تھی اور وہ اپنے شیوخ نمائندہ کی آراء
سے آگے بڑھ کر کچھ سوچ ہی نہیں سکتے تھے وہ
مدینہ کے مرکز میں مجتمع شدہ نمائندوں پر کامل
اعتماد رکھتے تھے ان حالات میں فرد فرد کی رائے
کے پیچھے پڑنا ممکن نہ تھا۔ پس عملی صورت اور
واقعاتی فضا کو خیالی اصول پسندی کے تحت نظر انداز
کرکے کوئی غیر حکیمانہ طریق انتخاب مدینہ کے اسٹیٹ
کے کارپردازوں نے اختیار نہیں کیا۔

اصول کے پیش نظر یہی کہا جاسکتا ہے کہ
اگر حالات و واقعات موقع دیں تو پورے
شہریوں کے ووٹنگ سے معاملات کا طے
ہونا بہترین طریق کار ہے لیکن حالات و واقعات
تقاضا کرتے ہیں کہ اگر رائے دہندگی کے حق کو محدود
کرنے کی مجبوری درپیش ہو تو اس کو ملحوظ رکھا
جاسکتا ہے۔ یہ بات کچھ عرب ہی سے متعلق نہیں
بلکہ آج بھی دنیا میں ایسے پسماندہ علاقے موجود
ہیں جہاں یہ طریق کار اختیار کرنا ممکن نہیں ہے
کہ ہر شہری جب تک رائے نہ دے کوئی انتخاب
قابل قبول نہ ہو۔ علاوہ بریں مہذب ترین ممالک

میں بھی بعض مناصب کے لیے ELECTORAL COLLEGE کو محدود کرکے انتخاب کرایا جاتا ہے. یعنی کچھ لوگ تمام شہریوں کی طرف سے انتخاب کرتے ہیں۔

سو اسلامی نظام سیاست میں اسی لیے انتخاب امارت کو "فرض کفایہ" قرار دیا گیا ہے فرض کفایہ کے اصطلاحی معنی یہ ہوتے ہیں کہ پوری جماعت پر ایک معاملے کی مجموعی ذمہ داری عائد کی جاتی ہے اس مجموعی ذمہ داری کو ادا کرنے کے لیے اگر جملہ افراد اپنا حصہ ادا کر سکتے ہوں تو یہ بہترین صورت ہوتی ہے، ورنہ اگر جماعت کا ایک حصہ اس فریضے کو سرانجام دے دے تو ساری جماعت فرض سے بری الذمہ ہو جاتی ہے۔

مندرجہ بالا سطور کی روشنی میں ہم استصواب کو دو نوعیتوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ ایک بلا واسطہ (DIRECT) استصواب، دوسرے بالواسطہ (INDIRECT) چنانچہ عرب میں استصواب عام تو بہر حال ہر انتخاب پر ہوا لیکن وہاں کے حالات کے پیش نظر وہ (INDIRECT METHOD) سے ہوا. یعنی مدینہ میں جو انجمن بہ حیثیت نمائندہ عرب کے موجود تھی، اسے عوام الناس کا پورا پورا اعتماد حاصل تھا (تاریخ اس کی گواہ ہے) اور وہی مدینہ کے اسٹیٹ کے منصب امارت کے لیے ELECTORAL COLLEGE کی حیثیت رکھتی تھی۔ فی نفسہٖ اصول استصواب پوری طرح کار فرما رہا۔ البتہ حسب حالات بالواسطہ طور پر رائے عامہ کے رجحانات کا اندازہ کیا جاتا رہا۔

عوام الناس کے معتمد علیہ نمائندگان نے بھی ہمیشہ کسی کی نامزدگی کرتے ہوئے یہ سوال اپنے سامنے رکھا ہے کہ عوام کے رجحانات اسے قبول کرلیں گے یا نہیں اور اختلاف تو پیدا نہ ہوگا؟ چنانچہ سقیفہ بنی ساعدہ میں یہی سوال تھا۔ جو حضرت عمرؓ کی طرف سے اٹھایا گیا کہ انصار میں سے اگر کوئی شخص منصب امارت پر آگیا تو عرب بالخصوص قریش اور ان کے متاثرین اس پر مطمئن نہ ہوسکیں گے یہی سوال حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کے سامنے تھا اور اسی کے لیے وہ گلی گلی گھومے اور مقیمین مدینہ کے علاوہ بیرونی مسافروں تک سے استفسار کرتے پھرے۔

استصواب کی ایک دوسری تقسیم بھی کی جاسکتی ہے یعنی ایک ہوتا ہے استصواب اثباتی ایک ہوتا ہے استصواب منفی، استصواب اثباتی میں یہ سوال سامنے رکھا جاتا ہے کہ تم کسے پسند کرتے ہو؟ اور استصواب منفی اس سوال پر مبنی ہوتا ہے کہ فلاں نامزد شدہ شخص کو قبول کرنے سے تمہیں انکار تو نہیں؟ ـــــ پہلے کا جواب قولی ہوتا ہے، دوسرا بالعموم عملی!

مدینہ کے انتخابات میں ہر استصواب میں بیک وقت یہ دونوں قسمیں کارفرما رہی ہیں۔ ارباب حل وعقد سے تو استصواب کیا جاتا تھا۔ اثباتاً لیکن عوام عرب سے یہ استصواب ہوتا تھا نفیاً اور دونوں ہمیشہ نتیجہ کے لحاظ سے بالکل متفق رہے ہیں۔

حضرت ابوبکر نے جو نامزدگی فرمائی تھی۔ وہ بھی بطور خود نہیں فرمائی بلکہ اصول استصواب کو آپ نے پوری طرح جامۂ عمل پہنایا۔ تجویز کرنے سے پہلے اہل حل وعقد سے رائے طلب کی، اتفاق رائے سے حضرت عمرؓ کو نامزد کیا، پھر نامزد کرنے کے بعد عامۃ المسلمین کی رضامندی حاصل کی۔

> معرکۂ کربلا ہماری تاریخ کو روشن اور تاریک دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے یہ خونی لکیر ایسی جگہ واقع ہے کہ اس کے پرے اسلامی اصول انتخاب پورے کمال کے ساتھ جلوہ آرا نظر آتے ہیں۔

معرکۂ کربلا ہماری تاریخ کو روشن اور تاریک دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے یہ خونی لکیر ایسی جگہ واقع ہے کہ اس کے پرے اسلامی اصول انتخاب پورے کمال کے ساتھ جلوہ آرا نظر آتے ہیں۔ لیکن اس کے ورے ہم ان اصولوں کو ملیامیٹ ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ یہ اسلامی انتخاب ہی تھے جن کو پامال کرنے کے لیے ایک قوت ابھری اور جن کی حرمت کو بچانے کے لیے ایک دوسری قوت نے سر و سینہ پیش کر دیا۔ ورنہ جائداد یا بیٹی کا کوئی جھگڑا تو تھا ہی نہیں۔

جو لوگ اسلامی انتخاب کے لیے کوئی اصول تسلیم نہیں کرتے وہ بتائیں تو سہی کہ آخر خلافتِ راشدہ اور اموی دور کے درمیان

نظام حکمرانی کے لحاظ سے اور کس پہلو سے کوئی اصولی فرق تھا؟

بہر حال کربلا کے بعد سے جو تاریخ نمودار ہوئی وہ اسلامی دستور اور جاہلی دستور کا ایک مرکب ہمارے سامنے لاتی ہے جس کا تناسب بدلتا رہا ہے تاہم اس دور کی تاریکی میں بھی ستارے چمکے ہیں، جگنو اڑے ہیں اور چراغ جھلملائے ہیں۔ چنانچہ دورِ تاریک کی تاریخ کی دو مثالیں ایسی ہمارے سامنے ہیں جو اسلامی نظریۂ انتخاب کی توثیق کرتی ہیں ان کا ذکر فائدے سے خالی نہ ہوگا۔

راقم الحروف کے نزدیک حضرت عمر بن عبدالعزیز بھی ایک "خلیفۂ راشد" تھے اور ان کے نظائر بھی اس قابل ہیں کہ اسلامی اصولوں کی تفسیر کے لیے ان سے استفادہ کیا جائے، بنا بریں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ دورِ بنوامیہ کے اس واحد چمکتے ستارے کے انتخاب کا تذکرہ کر دیا جائے۔

یہ تو معلوم ہے ہی کہ آپ کو سابق حکمران سلیمان بن عبدالملک نے نامزد کر دیا تھا اور آپ کے متعلق سربہ مہر وصیت نامہ اپنے حکام اور پبلک لیڈروں کے سامنے رکھ کر اس پر بیعت لے لی تھی۔ اس طرح اچانک حضرت عمر بن عبدالعزیز کو معلوم ہوا کہ بارِ خلافت ان کی گردن پر ڈال دیا گیا ہے۔

یہ بات بجائے خود قابل لحاظ ہے کہ سلیمانؒ نے آپ کو جن صفات کی بنا پر انتخاب کیا تھا وہ عین شریعت کے تقاضوں کے مطابق تھیں، صرف ان صفات کے گرد بنوامیہ کے شاہی ٹھاٹھ باٹھ کا ایک غبارِ پریشان موجود تھا جسے آپ نے قبول خلافت کے ساتھ صاف کر دیا، اور اصل جوہر نکھر کر سامنے آ گیا۔

لیکن حضرت عمر بن عبدالعزیز کو معلوم تھا کہ نصب امارت کے لیے اسلام کا دستور حکمرانی کس طریق کار کو لازم ٹھہراتا ہے، اور اس طریقہ کو چھوڑ کر کوئی دوسرا طریقہ اختیار کرنا کیسا ہے، چنانچہ آپ نے مسجد میں پہلا اجلاس منعقد کر کے عوام سے یہ خطاب کیا۔

"لوگو! مجھ پر خلافت کا بار بغیر اس کے کہ مجھ سے رائے لی جاتی یا میں اس کا خواستگار ہوتا یا عام مسلمانوں سے مشورہ لیا جاتا، ڈال دیا گیا۔ میری بیعت کا جو قلادہ تمہاری گردنوں

میں ہے، میں اس کو خود نکال لیتا ہوں۔ اب جس کو پسند کرو، اپنا خلیفہ مقرر کرو"

اس طرح آپ نے اپنی نامزدگی پر خطِ تنسیخ کھینچ دیا۔ لیکن حاضرین نے چاروں طرف سے شور کیا کہ ہم آپ کو اپنا خلیفہ منتخب کرتے ہیں۔ تب کہیں جاکر آپ نے خلافت کو قبول کرنے کی حامی بھری۔

اس معاملے میں مزید روشنی یہ واقعہ ڈالتا ہے کہ عبدالعزیز بن ولید کو حضرت عمر بن عبدالعزیز کی خلافت کی اطلاع نہیں ہو سکی تھی۔ چنانچہ اس نے اپنے بعض معتمدین سے اپنے لیے بیعت لی اور پھر دمشق کے لوگوں سے بیعت لینے چلا۔ وہاں جاکر معلوم ہوا کہ انعقادِ خلافت ہو چکا ہے اس پر وہ سیدھا حضرت عمر بن عبدالعزیز کے سامنے حاضر ہوا اور ان کی خدمت میں معذرت کی کہ میں نے فتنہ کے اندیشے سے اپنے لئے بیعتِ طاعت لی، مجھے آپ کے متعلق علم نہ تھا۔ جواباً حضرت عمر بن عبدالعزیز نے فرمایا کہ:۔

"اگر لوگ تمہارے ہاتھ پر بیعت کر لیتے اور تم امورِ خلافت کو سنبھال لیتے تو میں تم سے بالکل اختلاف نہ کرتا اور اپنے گھر بیٹھ رہتا۔

یعنی اصل سوال یہ تھا کہ جمہور مسلمین اور ان کے نمائندے کسے بارِ امانت سونپتے ہیں۔

ایک قابلِ ذکر مثال معاویہ ثانی کی ہے۔ معاویہ ثانی کے دورِ خلافت کا آغاز و انجام ایک ہی تھا دونوں سروں میں کوئی فاصلہ نہیں تھا چونکہ اس شخصیت نے تاریخ خلافت راشدہ پر کوئی اضافہ اپنے عمل سے نہیں کیا ہے، اس لئے "خلیفۂ راشد" کی اصطلاح سے تو مخاطب نہیں کیا جا سکتا تاہم راقم الحروف کے علم میں بعد کی ساری اسلامی تاریخ میں یہ وہ واحد ہستی ہے جس نے اسلام کے دستورِ حکمرانی کا پورا پورا لحاظ کیا۔

معاویہ ثانی یزید کا بیٹا تھا اور والد کی موت کے بعد قانونِ جانشینی کے تحت از خود (AUTO-MATICALLY) حکمراں قرار پا گیا لیکن چالیس روز کے بعد اس نے جمہور کو خطاب کیا کہ انتخاب خلیفہ کا حق صرف تم لوگوں کو حاصل ہے جس کو مناسب سمجھو، اپنا خلیفہ بنا لو۔

میں اس بارِ خلافت کا متحمل نہیں ہو سکتا، مشورہ کر کے کسی دوسرے کو خلیفہ منتخب کر لو"

اس حساس حکمراں نے جو جگہ اسلام کی محبت کی وجہ سے خالی کی تھی، افسوس کہ وہ پھر دنیا پرستی

طاقت کے قبضے میں چلی گئی، لیکن اس نے ایک
رتبہ جذبہ صادق کا پورا پورا مظاہرہ کر کے دکھا
دیا۔

عدم امیدواری

دوسرا بنیادی اصول جو انتخابات کے بارے
میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تصریحات کی روشنی
میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ یہ وہ ہے کہ اسلامی
حکومت کے انتخابات میں امیدواری حرام ہے
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا
"انا واللہ لا نولی علی ھذا العمل من طلبہ
او حرص علیہ" یعنی خدا کی قسم ہم اس حکومت
کے عہدوں پر ایسے کسی آدمی کو نہیں مامور کرتے
جو اس کی خواہش کرے۔ یا اس کا حریص ہو۔
دوسرے موقع پر فرمایا:- "ان اخونکم عندنا
من طلبہ" کہ تم میں سے بدترین خائن وہ
ہے جو عہدہ حکومت کو طلب کرے۔ پھر آپ
نے فرمایا کہ جو مانگ کر عہدہ پائے گا وہ اس کا
حق ادا کرنے میں خدا کی امداد سے محروم ہوگا۔
اب آپ چاروں انتخاباتِ خلافت راشدہ
کا جائزہ لے کر دیکھئے تو صاف معلوم ہوگا کہ

وہاں امیدواری (CANDIDATURE) کا
نام و نشان نہیں ملتا ہے۔ چاروں خلفاء میں
سے کسی میں حرص منصب کی بو نہ تھی اور کسی
نے خود اپنے آپ کو نمایاں طور پر پیش نہیں کیا۔
زیادہ سے زیادہ حضرت علیؓ میں اس قسم کا رجحان
ثابت کیا جا سکتا ہے۔ لیکن وہ بھی ذاتی ہوس
کاری کا نتیجہ نہیں تھا۔ بلکہ آپ کا فہم یہی تھا کہ
نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قرابت داروں کو
چھوڑ کر دوسروں کو امارت دینے سے خلل واقع
ہوگا۔ تاہم جب تک آپ میں یہ رجحان رہا آپ
کا انتخاب نہیں ہوا اور جب یہ رجحان ختم ہوگیا۔
اور آپ خلافت کی ذمہ داری اٹھانے سے
گریز کرتے نظر آئے تو اس وقت یہ بوجھ آپ
پر لد گیا۔
خود حضرت ابوبکرؓ صدیق نے اپنے خطبہ
خلافت میں اس بات کی تصریح کی کہ میں کبھی
اس عہدے کا خواہشمند نہ تھا اور اس کے
لئے کبھی میں نے خدا تعالیٰ سے چھپ کر بھی
دعا نہیں کی۔
پس کسی اسلامی سٹیٹ میں انتخابی
مناصب کے لئے امیدواری کی کوئی گنجائش

نہیں نکالی جا سکتی۔

متعین معیار انتخاب

تیسرا اصول جو اسلامی انتخابات میں کارفرما رہا ہے وہ یہ تھا کہ انتخاب کے لیے ایک مشروع معیار سوسائٹی اور اس کے ارباب حل وعقد کے سامنے رہا ہے۔ معیار کی اہمیت ذیل کی دو آیات سے معلوم ہوتی ہے ایک ہدایت یہ ہے کہ "ان اللہ یامرکم ان تودوا الامانات الی اھلھا" یہ ہدایت جس سلسلۂ کلام میں وارد ہے اس کا موضوع چونکہ نظام حکومت ہے، لہٰذا یہاں امانات مناصب کا مفہوم نمایاں ہے۔ دوسری جگہ بطور نہی وارد ہوتا ہے کہ لاتوتوا السفھآء اموالکم اپنے اموال (خصوصاً قومی مالیات) کو نااہلوں کی تحویل میں نہ دو۔ اب رہا انتخاب تو اس کی بنیاد قرآن کے بعض اہم بیانات پر ہے۔ کچھ باتیں تو وہ ہیں جو انبیاء کے اصطفیٰ سے متعلق رکھنے والی آیات سے اخذ ہوتی ہیں۔ کچھ وہ ہیں جو حضرت داؤد کو خلافت اور حضرت ابراہیم کو امامت سونپنے کے تذکروں سے مستنبط ہوتی ہیں۔ لیکن صریحی حکم جس آیت سے اخذ کیا جا سکتا ہے۔ وہ یہ ہے۔ "ان اکرمکم عند اللہ اتقکم" یعنی تم میں سے اللہ کے نزدیک سب سے اچھا وہ ہے جو زیادہ متقی ہے۔ تقویٰ اس داخلی وصف کو کہتے ہیں جس کے زیر اثر آدمی کی پوری زندگی صالحیت کے سانچے میں ڈھل جاتی ہے۔ یہ بغیر اس کے ممکن نہیں ہے کہ اسلام پر ایمان ہو۔ اس سے وفاداری و فدائی کا تعلق ہو۔ اس کے اوامر نواہی کا علم ہو۔ اس کے حدود و حلال و حرام پر نظر ہو۔ اور پھر عمل سے اسلام کے سارے تقاضوں کو پورا کرنے کا اہتمام ہو۔

اب آپ خلافت راشدہ کے چاروں انتخابات کا جائزہ لیجئے۔ ہر ایک انتخاب میں نامزدگی کرتے ہوئے ایک شخص کی دینی خدمات اس کی اسپرٹ تقویٰ اور اس کی قربانیوں کا تذکرہ کیا گیا۔ سقیفہ بنو ساعدہ میں اگر انصار کے نمائندوں نے انصار میں سے امیر کے انتخاب پر زور دیا تو صرف اس بنا پر کہ انصار کی خدمات اسلام کے لیے یادگار ہیں۔ بخلاف اس کے مہاجرین کے لیڈروں نے مہاجرین میں سے امیر چنے جانے کی اہمیت پر جتنا استدلال کیا۔ وہ

ھزاروں میل کا سفر اسی وقت شروع ہو جاتا ہے جب آپ صحیح سمت میں پہلا قدم اٹھا لیتے ہیں۔ نظامِ اسلامی کے قیام کو بھی بس ایسا ہی ایک قدم سمجھنا چاہیے۔

بھی اسی دعوی کے بل پر تھا کہ مہاجرین کی قربانیاں اور خدماتِ دین کے بارے میں نمایاں ہیں۔

اسی طرح جب خلیفہ اول نے جانشین نامزد کیا تو ان کی خدماتِ اسلام اور ان کے تقویٰ کو پیشِ نظر رکھا اور انہیں صفات سے استدلال کیا۔ یہی صورت بعد کے انتخابات میں پائی جاتی ہے۔

خلافتِ راشدہ کے معیارِ انتخاب یا شروطِ امامت کے سلسلے میں جسٹس امیر علی کا ایک بیان بصیرت افزا ثابت ہوگا۔ اسے ہم ذیل میں درج کرتے ہیں:۔

The consideration attached to the Cable of the companions of the Prophet was as great in the camp as in the city. The powerful influence proceed which the conquests of the Moslems.

The quality of as AS-HAB carried with it a character of sanctity and nobleness. When a person bearing this title was in an action, the crowd flocked to his side and followed his lead.

(THE SPRIT OF ISLAM - PP.278-279)

مدعا یہ کہ کسی کا صحابی رسول اللہ ہونا اس کے اثر کے لیے سب سے بڑی وجہ تھی۔ جو لوگ اس سعادت سے ہم کنار تھے ان کے گرد عوام الناس بڑی آسانی سے سمٹ جاتے۔ ان پر اعتماد کرتے اور ان کی اطاعت میں سرگرم عمل ہو جاتے وابستگیٔ دامانِ رسالت اور اتباعِ رسالت اور فداکاریٔ رسالت ہی وہ وصف QUALIFICATION تھا۔ جسے خلافت راشدہ کے انتخابات میں بہت بڑا دخل رہا ہے۔

معیارِ انتخاب کو اسلامی نظامِ انتخابات میں جو اصولی اہمیت حاصل ہے۔ وہ اسی سے ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے سیاسی فلسفیوں اور جملہ ائمہ و فقہا نے اس اصول پر خاص بحثیں کی ہیں اور "معیار" کی بڑی تفصیلات اور "شرائطِ امارت"

متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہاں سرسری طور پر چند حوالے پیش کئے جارہے۔ ابن خلدون لکھتا ہے :۔

"فاما شروط المنصب فهو اربعة (۱) العلم (۲) العدالة (۳) الکفایة (۴) وسلامة الحواس والاعضاء مما یؤثر فی الرای والعمل"

پھر ان شرائط کی مفصل تشریح کی ہے جسے یہاں درج کرنا ضروری نہیں۔ شرطِ قرشیت کے بارے میں وہ بہت بجا طور پر "اہل ظاہر" سے اختلاف کرتا ہے اور اس پر ہم آگے چل کے مختصراً اظہار رائے کریں گے۔

"النقض کتاب الاسلام والحکم" کا مصنف لکھتا ہے کہ :۔

یقرر جمهور اهل العلم فی شروط الخلیفة (۱) ان یکون بالغاً فی العلم رتبة الاجتهاد (۲) وان یکون ذا رای وخبرة بتدبیر الحرب والسلم (۳) وان یکون شجاعا لا یرهب الموت الزؤام فیما دونه (۴) وان یکون عادلا لا تاخذه فی الحق لومة لائم وان تشهد له سیرته قبل العدل باختیار سیرته فیما کان تبوله من اعمال قبل المنصب الخلافة وتدل علیه التجارب والمشاهدة الطریة من استقامة وشرف همة وانکاره ما یفعلون الظلموت بغیرة وحماسة (صفحہ ۸۲)

یعنی امیر علم میں مرتبہ اجتہاد پر فائز ہو۔ تدبیر صلح و جنگ میں صاحب رائے ہو۔ اقامت جہاد کے لیے شجاعت رکھتا ہو۔ ایسا عادل ہو کہ حق کی حمایت کرنے میں کسی ملامت کی پروا نہ کرے اور منصب خلافت سے قبل کی زندگی اس کے عادل ہونے کی شہادت دیتی ہو اور طویل تجربہ و مشاہدہ اس کے علو ہمت و استقامت اور اہل ظلم کی روش سے پرہیز کا اعتماد دلاتا ہو۔ پنجاب کے موجودہ الیکشن کے لیے جو لوگ وقتی طور پر پاکباز بن رہے ہیں۔ ان کے سامنے ان سطور کا آئینہ رکھ دینا چاہیئے کہ وہ اس میں اپنی صورت دیکھیں۔

صفی الدین محمد بن علی طبا طبا مصنف

کتاب تاریخ الدول کی رائے میں اسلامی حکمران کے لیے حسب ذیل اوصاف کا پایا جانا ضروری ہے:۔

"اس میں حکمت ہو، عدل ہو، اپنے عوام کی خواہشات و ضروریات کا علم ہو اور خوف خدا ہو ـــــ اس آخری وصف کو سب سے اہم قرار دیا ہے ـــــ حکمران کو رحمدل بھی ہونا چاہیئے کہ وہ غلطیوں پر عفو کرے، اس کے اندر اپنے محکوموں کے مفاد کی خدمت کی ایک دائمی خواہش بر سر عمل ہونی چاہیئے اور ان سے برابر مشورہ کرنے کی عادت بھی ہونی چاہیئے۔"

بحوالہ دی اسپرٹ آف اسلام

معیار انتخاب میں اختلافی بحثیں بنیادی طور پر دو ہی پائی جاتی ہیں۔

۱۔ شیعہ اسکول کی رائے یہ ہے کہ امامت ایک تو رسول اللہ صلعم کے خاندان کے لیے مخصوص ہے، بلکہ خاص طور پر اس کا سلسلہ صرف حضرت علیؓ کی اولاد میں جاری رہنا چاہیئے دوسرے یہ کہ امام کو معصوم ہونا چاہیئے، یعنی اللہ نے خاص طور پر اس کو اس منصب کے لیے غلطی سے محفوظ و مامون کر لیا ہو۔ یہ نظریہ انتخاب اور شورائیت کی نفی کرتا ہے۔ اور جماعت و امت کے حقوق سیاسی کا کلیتہً خاتمہ کرتا ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ اس نظریہ کے حق میں نہ صرف یہ کہ کتاب و سنت کوئی استدلال مہیا نہیں کرتے، بلکہ نبی صلعم کی تیار کردہ سوسائٹی کا نظری و عملی اجماع اس کے بالکل خلاف ہے۔

۲۔ آں حضرت کا یہ ارشاد کہ "الائمۃ من القریش" امرا قریش میں سے ہوں گے۔ اسے بعض اصحاب نے "حکم" کی حیثیت دی ہے حالانکہ پورے عرب کے لیے دوامًا اور عرب ہی کے لیے نہیں، آئندہ عالمگیر دور اسلام کے لیے اس قسم کا حکم قابل نفاذ اور قرین حکمت نہیں ہو سکتا لہٰذا ان کی یہ تاویل کہ یہ قول نبویؐ بطور پیشنگوئی تھا۔ صحیح نکلتی ہے سقیفہ بنی ساعدہ میں قریش میں سے امیر چنے جانے کی اہمیت پر جو استدلال کیا گیا وہ اسی حد تک تھا کہ ان کو چھوڑ کر کسی دوسرے کو چنا گیا۔ تو عرب قبول نہ کریں گے۔ اس حقیقت کی وضاحت ابن خلدون

نے بہت خوبی سے کی ہے۔

"قریش عصبیت کے لحاظ سے ممتاز تھے اور ان میں مرکزیت قائم کرنے کی صلاحیت تھی۔ وہ اتنی طاقت رکھتے تھے کہ ظالم سے مظلوم کا حق دلا سکیں اس زمانے میں صاحب عصبیت قبیلہ کا غلبہ آسانی سے لوگوں کی شیرازہ بندی کر سکتا تھا۔ اور اندرونی فتنہ و فساد اور اختلافات دبا دینے میں اسے کوئی دشواری نہیں تھی اور شہریوں کو اس کے زیر حکومت جاہ و جلال کے تحفظ کی توقع تھی۔ اس لیے حکومت کی تنظیم میں وہ سہارا دیتے ۔ قریش مضر کا سب سے با اثر صاحب عصبیت اور طاقتور قبیلہ تھا جزیرۂ عرب کے باشندے اس حقیقت سے واقف تھے اور اسی لئے قریش سے دبتے تھے اور ان کا احترام و ادب کرتے تھے۔ اس ماحول کی وجہ سے آپ نے امامت کے لیے قرشیت کی شرط (سفارش) لگائی تھی اب آپ کی دور بین نگاہ نے دیکھ لیا تھا کہ جزیرۂ عرب میں اگر کوئی خاندان مرکزیت پیدا کر سکتا ہے تو وہ قریش کا خاندان ہے۔ آپؐ ان کی فطری صلاحیتوں، فہم و درایت، جاہ و قوت اور ہمہ گیر عظمت و احترام سے واقف تھے، اس لیے آپ کو اعتماد تھا کہ وہ اس بار کو نہایت آسانی سے سنبھال لیں گے اور امت کا شیرازہ منتشر نہ ہونے دیں گے مستقبل نے ظاہر کر دیا کہ آپؐ کا خیال صحیح تھا۔"

(ابن خلدون ص۱۹۱)

اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر کسی دوسرے وقت میں قریش کے سوا کوئی دوسرا قبیلہ یا طبقہ یا پارٹی ایسی ہو کہ اس کے افراد نظام مملکت کے سنبھالنے میں اہل تر ثابت ہوں تو پھر عین قریش کی سی حیثیت ان کو حاصل ہوگی۔

"قرشیت کا لحاظ صرف واقعاتی احوال کے پیش نظر اور بطور مصلحت تھا۔ لیکن اصول اپنی جگہ ہے کہ امت کا ہر فرد امیر ہو سکتا ہے،

جیسا کہ نبی صلعم نے فرمایا کہ اگر نکٹا حبشی غلام تم پر
امیر مقرر کیا جائے تو سنو اور اطاعت کرو۔ اگر
غیر قریشی کی امامت حرام ہوتی تو اس قول نبویؐ
کا شریعت میں کوئی مقام کہاں تھا۔ اسی کی بنا پر
حضرت عمرؓ نے فرمایا تھا کہ اگر ابوحذیفہ کے غلام
سالم زندہ ہوتے تو میں انہیں اپنا جانشین مقرر کر دیتا
بہرحال "قرشیت" معیار انتخاب کے شرط
میں کسی طرح بھی ساری دنیا اور سارے زمانوں
کے لیے شامل نہیں ہے۔

دور فتنہ میں مرجئہ کا حکومت پرستانہ
رویہ نمودار ہوا جس نے اسلامی معیار انتخاب
کی اہمیت پر خط نسخ پھیرا۔ ان لوگوں کا عقیدہ
یہ تھا کہ خلافت کے لیے آدمی کا زبان سے کلمہ
شہادت پڑھ لینا کافی ہے۔ اس کے ذاتی اعمال
و افعال اور اخلاق کا جائزہ لینا غیر ضروری ہے۔
اس گروہ نے بنو امیہ کی سلطنت کو اس نظریئے
کے بل پر جائز اور برحق قرار دیا آج کل جو حکمران
دورِ بنو امیہ کو نمونہ کا دور قرار دینے کے لیے
کوشاں ہیں، ان کو چاہیئے کہ وہ اپنی تائید کے
لیے ایک گروہ دور حاضر کے جدید مرجئہ کا پیدا کریں
غالباً اس کے ابتدائی آثار محسوس کئے جا رہے ہیں۔

بہرحال خلافت راشدہ کے دور میں "تقوی"
معیار انتخاب تھا۔ اور کتاب و سنت میں مسلمانوں
کے لیے جو صفات مطلوب بیان کی گئی ہیں ان کو
اولین اہمیت حاصل تھی اور ان کے ساتھ ساتھ
صلاحیت حکمرانی اور جسمانی قویٰ اور طبعی لوازم
وغیرہ کا لحاظ بھی کیا جاتا تھا۔ حتی الوسع کوشش
یہ کی جاتی تھی کہ امت کے افضل ترین فرد کو منصب
امارت کے لیے منتخب کیا جائے۔ چنانچہ انتخاب
عثمان کے موقع پر حضرت عبدالرحمٰن بن عوف۔
حضرت عثمان اور حضرت علی میں سے افضل کو
چننے کے لیے فکر و مشورہ میں مصروف رہے۔

اس باب میں قرآن کریم بالفاظ ذیل ناطق ہے

"ان اللہ یامرکم ان تؤدوا الامانات
الی اھلھا"

امانات (خصوصاً مناصب اقتدار)۔
اہل لوگوں کے حوالے کرو۔

نبی صلعم کی احادیث بھی اس بارے میں
رہنمائی کرتی ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ:۔

"امراء یکونون من بعدی فمن دخل
علیھم وصدقھم بکذبھم واعانھم
علی ظلمھم فلیسوا منی ولست منھم

والی یوردعا صاحب الحوض۔

کہ میرے بعد ایسے امراء ہوں گے کہ جو لوگ ان کی مجالس میں شریک ہوں گے' اور ان کے دروغ کی (قول وعمل سے) تصدیق کریں گے اور (کسی صورت میں) ان کے ظلم میں اعانت کریں گے تو وہ مجھ سے نہیں' میں ان سے نہیں' اور وہ قیامت کے دن حوض کوثر پر مجھ سے ملاقات نہیں کر سکیں گے۔

ظاہر بات ہے کہ جن اوصاف کے امراء کے متعلق یہ وعید ہے' ان سے ملنا اور ان کا ساتھ دینا اگر امارت کے بعد منع ہے تو ایسیوں کو امارت کے لئے رائے یا مشورہ دینا کہ وہ ایسی آرا کے بل پر تسلط حاصل کریں خود اسی وعید کی زد پر آتا ہے۔ اسلام میں صالحین کو چھوڑ کر فساق و فجار کو رائے دینے کے معنی ہدم اسلام کے ہیں۔

"معیار انتخاب" کے اصول ہیں درحقیقت کوئی پیچیدگی نہیں اور اس کے لیے کتابوں کو کھنگالنے کی ضرورت نہیں' بلکہ یہ بات صاف ہے کہ جو کام پیش نظر ہوتا ہے' اس کے لیے ہمیشہ موزوں صلاحیتوں کے لوگ تلاش کیے جاتے ہیں۔ علاج کے لیے طبیب اور تعمیرات کے لیے انجینئر تلاش کرنے میں جس طرح ایک معیار خود بخود ذہن نشین ہو جاتا ہے' بالکل اسی طرح مسلم سوسائٹی (عرب) میں از خود ایک معیار انتخاب پرورش پا گیا تھا۔ لوگ جانتے تھے کہ جب حکومت کا مقصد وجود خدا کے دین کا قیام اس کی دعوت' اس کے لئے جہاد فی سبیل اللہ' خدا کے بندوں کی خدمت' ان کی ضروریات کی تکمیل' ان کے اخلاق کی تعمیر' فحشاء و منکر سے پاک ماحول کی استواری وغیرہ امور پر مشتمل ہے تو اس کے لیے لیڈر اور حکمران کیسے ہونے چاہئیں۔ حکومت کی نوعیت خود بتا دیتی تھی کہ معیار انتخاب کیا ہے! چنانچہ مدینہ میں یہ سوال کبھی پیدا نہیں ہوا کہ "صالح نمائندہ" کیا ہوتا ہے؟ بہت سے لوگوں میں سے کیسے معلوم کیا جائے کہ کون صالح ہے؟ وغیرہ!

چاروں انتخابات میں جس قسم کے افراد کو منتخب کیا گیا ان کے اوصاف کو لے کر سامنے رکھئے اور پھر دیکھئے کہ انسانیت کا کیسا نمونہ سامنے آتا ہے بس یہی نمونہ انسانیت ہمیشہ کے لئے معیار انتخاب متعین کر دیتا ہے۔

یہ بات فراموش نہ کرنی چاہیئے۔ کہ معیار انتخاب کے تحت ایک فرد کے جو مختلف داخلی اوصاف ہوتے تھے۔ ان پر ایک ایسی چیز بھی المضاعف تھی۔ جس کا تعلق امت سے تھا۔ یعنی قبولیت عام یا اعتماد عمومی ــــ اور یہی وہ چیز تھی جسے معلوم کرنے کے لیے استصواب کا طریق کار اختیار کیا جاتا تھا۔

بیعت (باہمی مشروط معاہدہ)

بیعت اسلامی انتخاب کا چوتھا اصول تھا۔ یعنی منتخب ہونے والے شخص اور امت کے درمیان ایک عہد وجود میں آتا تھا۔ جس کے ذریعے ایک طرف حکمران کی ذمہ داریوں کا اور دوسری طرف عوام کی ذمہ داریوں کا تعین ہوتا تھا۔ حکمران امت کے سامنے اقرار کرتا تھا۔ کہ وہ کتاب وسنت کی حدود کی پابندی میں چلے گا اور جب تک وہ اس طرح چلے وہ اطاعت کا مطالبہ کرنے کا مستحق ہوگا، لیکن اگر وہ اس عہد سے منحرف ہو جائے تو مطالبہ اطاعت کا وہ مستحق نہیں رہے گا۔ دوسری طرف عوام عہد باندھتے تھے کہ وہ معروف میں اطاعت کریں گے۔ منکر پر اطاعت سے رک جائیں گے اور کفر بواح (اسلام سے علانیہ انحراف) پر وہ خروج یعنی بغاوت کرنے کے مستحق ہوں گے۔

بیعت سے مطلوب یہ ہوتا تھا کہ وہ کسی نامزد شدہ شخص کی امارت کو برضا و رغبت قبول کرنے کا اعلان کرتے ہیں۔ نامزدگی ایجاب کی حیثیت رکھتی تھی۔ اور بیعت عامہ قبول کی۔

جامعہ روما کے پروفیسر نالینو کا ایک قول بیعت کے متعلق ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے نقل فرمایا ہے کہ:-

> کسی شخص کو خلافت کا رتبہ عطا کرنا فقہا کے نزدیک ایک معاہدہ ہوتا ہے جس کا ایک فریق وہ شخص ہوتا ہے جو اس عہدے کو قبول کرتا ہے اور دوسرا فریق جماعت اسلامی ہوتی ہے یہ معاہدہ اس وقت تک مکمل نہیں ہوتا جب تک کہ بیعت یعنی اظہار وفاداری امت کے ارباب حل و

ے اس بارے میں یہ حدیث بہت واضح ہے:-
خیارُ ائمتکم الذین تحبونهم ویحبونکم وتصلون علیهم ویصلون علیکم وشرار ائمتکم الذین تبغضونهم ویبغضونکم وتلعنونهم ویلعنونکم۔ (مشکوٰۃ کتاب الامارۃ)

عقد (نمائندگان جماعت) کی طرف
سے نہ عمل میں آجائے۔

ذیل کا قول بیعت کی ماہیت کو واضح کرتا
ہے۔ لیکن اپنے نوٹس میں اس کا حوالہ درج کرنے
میں سہو ہوا ہے۔

اعلم ان البیعۃ ھی العھد علی
الطاعۃ کان المبایع یعاھد امیرہ
علی انہ یسلم لہ النظر فی امر
نفسہ و امور المسلمین لاینازعہ
فی شیئ من ذالک ویطیعہ
فیما یکلفہ بہ من الامر علی المنشط
المکرہ وکانوا اذا بایعوا الامیر
عقدوا عھدہ جعلوا ایدیھم
فی یدہ تاکیدا للعھد فاشبہ ذالک
فعل البائع والمشتری ولھذا لما
افتی مالک رضی اللہ عنہ بسقوط
یمین المکرہ انکرھا الولاۃ علیہ
وراوھا قادحۃ فی ایمان البیعۃ
ووقع ما وقع من محنۃ الامام؟

یعنی بیعت عہد اطاعت ہے۔ جسے بیعت
کرنے والا اپنے امیر سے استوار کرتا ہے اس بات
پر کہ وہ اپنے اور مسلمانوں کے معاملات میں
اس پر اعتماد کرتا ہے اور اس معاملے میں وہ
کوئی اختلاف نہ کرے گا۔ بلکہ جس بات پر مامور
کیا جائے گا۔ اس کی تعمیل کرے گا ہاتھ میں ہاتھ
دے کر اس معاہدے میں تاکید پیدا کی جاتی
ہے۔ اور یہ فعل بالکل بیع و شرا کی طرح کا ہوتا
ہے۔ اسی حقیقت کے پیش نظر امام مالک نے
فتویٰ دیا تھا۔ کہ جبر سے جو اقرار لیا جائے۔ وہ
باطل ہے۔ چنانچہ حکام نے اسے ناپسند کیا۔ کیونکہ
یہ فتویٰ اس بیعت کی جڑ کاٹنے والا تھا۔ جس پر
ان کی امارت قایم تھی۔ چنانچہ امام موصوف پر خوب
ظلم توڑے گئے۔

بیعت کا عہد "طاعت فی المعروف" کے
لئے ہوتا ہے۔ جہاں حکمراں معروف کی حدود سے
نکل کر منکر کی وادی میں داخل ہوا، عوام الناس
کے لیے نبی صلعم کے حسب فرمان کہ "لا سمع و
طاعۃ" پھر کوئی ذمہ داری اطاعت نہیں ہے
اسی طرح حدیث میں کفر بواح پر قلادۂ بیعت کو
گردن سے نکال دینے کا حق عوام کو دیا گیا ہے
دوسرے لفظوں میں معاہدہ تین باتوں پر مشتمل
ہوتا ہے۔

۱۔ اگر امیر معروف کے لیے حکم دیتا رہے تو بے چوں وچرا اطاعت جاری رکھی جائے گی۔ جس سے انحراف جہنم کی وعید سناتا ہے۔

۲۔ اگر امیر منکر کے لیے حکم دے یا فرائض و واجباتِ شرعیہ سے روکے تو اطاعت کا مطالبہ ختم ہو جائے گا۔

۳۔ اگر امیر اسلام سے صریحاً انحراف کا رویہ اختیار کرے تو جماعت اس سے ترکِ منصب (معزولی) کا مطالبہ کر سکتی ہے۔ ورنہ بصورتِ دیگر اگر شروط واحوال سازگار ہوں تو وہ منظم طریق سے خروج کر سکتی ہے۔ ان ہی تین باتوں کے تحت "نقض کتاب الاسلام والحکم" میں اہل حل وعقد کے سر یہ ذمہ داریاں ڈالی گئی ہیں۔ کہ:۔

أن الاسلام قرر لهم من الحقوق ان تقدم حول الخليفه، امة من الذين اوتوا العلم يقيمون امرهُ فيامرونه بالمعروف ان تهاون وينهونه عن المنكر ان طغا فاذا ركب غارب الاستبداد واعيا هم تقويمه اذ رة خلوه غير ماشوعليه۔

یعنی اہل حل وعقد کا فرض ہے۔ کہ وہ بہ حیثیت نمایندگان امت ان امور کا اہتمام کریں۔ کہ اگر امیر معروف کے پورا کرنے میں غفلت کرے تو وہ اسے آمادہ کریں۔ اگر وہ منکر پر ہو تو اسے روکیں۔ اور اگر وہ استبداد کی روش پر اتر آئے تو اس سے نجات پانے کی فکر کریں۔

آج کل یہ سسٹم جو رائج ہے کہ جسے ایک مرتبہ منتخب کر دیا جائے اسے مدتِ معینہ کے اندر واپس نہیں ہٹایا جا سکتا۔ یہ بالکل باطل ہے۔ اور یہ طریقہ کبھی اسلام میں جگہ نہیں پا سکتا کہ امیر یا پارلیمنٹ جو کچھ بھی قانون سازی اور تنفیذ احکام کرتی چلی جائے اسے خاموشی سے گوارا کر لیا جائے۔ اسلامی انتخاب کا اصول بیعت اس کے بخلاف عوام کو یہ حق دیتا ہے کہ وہ معروف کا حکمرانوں سے مطالبہ کریں۔ منکر کے خلاف احتجاج کریں اور اسے قبول کرنے سے انکار کر دیں۔ اور جو لوگ انتخاب کے بعد کھوٹے نکلیں اور اسلام سے انحراف پر اتر آئیں ان کو ان کے مناصب سے الگ کر دیں۔

رہا بیعت کا ظاہر، سو یہ امر کوئی وجوب شرعی نہیں رکھتا۔ کہ عہد طاعت ہاتھ میں ہاتھ

دے کر ہی کیا جائے' یہ کام کسی مجمع میں ہاتھ اٹھا کر تسلیم کرنے سے بھی ہو سکتا ہے۔ اور کسی مقررہ قسم کے صندوقچے میں پرچیاں ڈالنے سے بھی ہو سکتا ہے۔ اس معاملے میں کوئی امر شرعی مانع نہیں ہے۔

حضرت ابو بکر نے عوام الناس کے ساتھ معاہدہ خلافت بالفاظ ذیل استوار فرمایا تھا۔

"ایھا الناس! فانی قد ولیت علیکم ولست بخیرکم، فان احسنت فاعینونی، وان اسأت فقومونی الصدق امانۃ والکذب خیانۃ والضعیف فیکم قوی عندی حتی اریح علیہ حقہ ان شاء اللہ والقوی فیکم ضعیف عندی حتی آخذ الحق منہ ان شاء اللہ۔ لا یدع قوم الجھاد فی سبیل اللہ الا ضربھم اللہ بالذل، ولا تشیع الفاحشۃ فی قوم الا عمھم اللہ بالبلاء اطیعونی ما اطعت اللہ ورسولہ فان عصیت اللہ ورسولہ فلا طاعۃ لی علیکم ___ قوموا الی صلوٰتکم یرحمکم اللہ۔ (الصدیق۔ ہیکل ص۹۵)

اس تقریر میں وعدہ یہ تھا کہ (۱) تم میں سے جو کمزور ہیں ان کے حقوق دلواؤں گا (۲) تم میں سے جو قوی ہیں ان سے دوسروں کے حقوق وصول کروں گا اور مطالبہ یہ تھا کہ (۱) اگر میں ٹھیک کام کروں تو میرے ساتھ تعاون کرو، غلطی کروں تو میری اصلاح کر دو (۲) جب تک اللہ اور اس کے رسول کی طاعت کروں، تم میری اطاعت کرو اور جب میں اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی پر اتر آؤں تو پھر میری طاعت تم پر لازم نہیں۔

حضرت عمر نے عوام امت سے یہ عہد استوار کیا :۔

"ایھا الناس ما انا الا رجل منکم ولولا انی کرھت ان ارد امر خلیفۃ رسول اللہ ما تقلدت امرکم۔" ثم قال۔ ان اللہ ابتلاکم بی وابتلانی بکم وابقانی فیکم بعد صاحبی فو اللہ لا یحضرنی شیئ من امرکم فیلیہ احد دونی، ولا یتغیب عنی فآلو فیہ عن الجزء والامانۃ ___ ثم انی قد ولیت امورکم ایھا

الناس. فاعلموا ان تلك الشدة
قد اضعفت، ولكنها انما تكون
على اهل الظلم والتعدي على
المسلمين۔ فاما اهل السلامة
والدين والقصد فانا ألين لهم
من بعضهم لبعض. ولست ادع
احداً يظلم احداً او يتعدى عليه
حتى اضع خده على الارض واضع
قدمي على الخد الاخر حتى يذعن
بالحق. واني بعد شدتي تلك اضع
خدي على الارض لاهل العفاف
والكفاف"۔۔۔ ولكم عليّ خصال
اذكرها لكم فخذوني بها:۔
"لكم عليّ ان لا اجتبي شيئاً
من خراجكم ولا ما افاء الله
عليكم الا من وجهه. ولكم عليّ
اذا وقع في يدي الا يخرج مني
الا في حقه۔ ولكم عليّ ان ازيد
عطاياكم وارزاقكم انشاء الله
تعالى۔ واسد ثغوركم۔ ولكم
علي الا القيكم في المهالك، و
لا اجمركم في ثغوركم، واذا
غبتم في البعوث فانا ابو العيال
فاتقوا الله عباد الله! واعينوني
على انفسكم بكفها عني واعينوني
على نفسي بالامر بالمعروف و
النهي عن المنكر، واحضاري النصيحة
فيما ولاني الله من امركم ـــــ
اقول قولي هذا واستغفر الله
لي ولكم اجمعين"

اس منشورِ خلافت میں حضرت عمرؓ نے حسب ذیل ضمانتیں دیں:۔

۱۔ میری شدت وغلظت صرف مسلمانوں پر ظلم کرنے والوں کے لیے ہوگی۔

۲۔ سلیم الطبع اور متوازن مزاج لوگوں کے لیے میں سب سے زیادہ نرم دل ہوں گا

۳۔ جو کوئی ظلم کی روش اختیار کرے گا اس کا ایک گال زمین پر رکھ کر اس کے دوسرے گال پر پاؤں رکھوں گا اور دوسروں کے حقوق جبراً چھین لوں گا۔

۴۔ حقداروں کے سامنے باوجود اپنی ساری شدت کے خود اپنا گال زمین پر رکھ دوں گا۔

۵۔ تمہاری طرف سے مجھ پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ خراج دفئے میں سے کوئی چیز بغیر حق کے نہ لوں۔

۶۔ اور یہ کہ تمہارے خزانے میں سے بغیر حق کے کسی کو کچھ نہ دوں۔

۷۔ اور یہ کہ تمہارے وظائف اور روزینوں میں اضافہ کرتا رہوں۔

۸۔ اور یہ کہ تمہاری سرحدات کو مضبوط رکھوں۔

۹۔ اور یہ کہ تم کو ہلاکت میں نہ ڈالوں۔

۱۰۔ اور یہ کہ تمہیں خواہ مخواہ سرحدات پر گھروں سے دور مبتلائے غربت نہ رکھوں۔

۱۱۔ اور یہ کہ جب تم گھروں سے جہاد کے لیے غیر حاضر ہو جاؤ تو تمہارے اہل و عیال کا سرپرست بنوں۔

اور عوام سے مطالبہ یہ کیا کہ :۔

۱۔ اپنی جانوں کو میری گرفت سے بچائے رکھو

۲۔ اور میری دوسری مدد یہ کرو کہ مجھے "معروف" پر کاربند رہنے اور منکر سے پرہیز کرنے کی تاکید کرتے رہو۔

۳۔ اور تمہارے معاملات کی جو ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے میرے کندھوں پر ڈالی ہے اس میں برابر مجھے مشورہ بہم پہونچاتے رہو۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا خطبۂ خلافت خالص اخلاقی نصائح پر مشتمل تھا اور اس کی سیاسی نوعیت وہ نہیں جو اول الذکر دو خلفاء کے خطبوں کی تھی تاہم حضرت عبد الرحمٰن بن عوف سے مجمع عام میں خلیفۂ ثالث یہ عہد استوار کر چکے تھے کہ کتاب و سنت اور عمل شیخین کی پیروی کروں گا۔ بیعت عام اسی اقرار کے بعد ہوئی تھی۔

حضرت علی کے خطبۂ خلافت میں بھی سیاسی پہلو نمایاں نہیں ہے۔ زیادہ تر نصائح ہیں صرف ایک ٹکڑا ایسا ہے کہ اس سے سیاسی مفہوم اخذ کیا جا سکتا ہے کہ "اذا رأیتم الخیر فخذوا بہ واذا رأیتم الشر فدعوہ" کہ اگر تم بھلائی دیکھو تو اسے قبول کرو اور برائی دیکھو تو اسے چھوڑ دو۔ یہاں خیر کے بجائے معروف اور شر کے بجائے منکر کے الفاظ بھی مفہوم دیتے ہیں۔

البتہ اس دور سعادت کے بعد حضرت عمر بن عبد العزیز کے خطبۂ خلافت میں پھر وہ چیز نمایاں نظر آتی ہے جو مشروط بیعت کا لازمہ ہے۔ فرمایا۔

لوگو: جو شخص خدا کی اطاعت کرے اس کی اطاعت واجب ہے اور جو شخص اس کی نافرمانی کرے اس کی فرماں برداری جائز نہیں۔ جب تک میں خدا کی اطاعت کروں میری اطاعت تم بھی کرو، اور اگر میں اس کی نافرمانی کروں تو میری فرماں برداری تم پر فرض نہیں ہے" ابن سعد نے جو تقریر طبقات میں نقل کی ہے، اس میں آتا ہے کہ "لا طاعة لنا فی معصية الله" یعنی اللہ کی نافرمانی میں ہماری اطاعت کوئی نہ کرے

چند خاص اہتمامات

مذکورہ بالا چار اصولوں کے ساتھ ساتھ ہر اسلامی نظام انتخاب میں چند اور امور بھی ہیں جن کا اہتمام کرنا شرعاً ضروری ہے۔

۱۔ اسلامی سوسائٹی اور اسٹیٹ کا نظام ایک اصولی نظام ہے۔ یعنی ایک اصول پر ایک جماعت جمع ہوتی ہے۔ وہ اسی اصول کی حکومت قایم کرتی ہے اور اسی اصول کے تقاضوں کا لحاظ کرکے مناصب کے لیے موزوں افراد کا انتخاب کرتی ہے۔

پس ایسے اصولی اسٹیٹ میں ذمہ داری کے مناصب کے لیے صرف وہی افراد منتخب کئے جا سکتے ہیں جو اس اصول کے ماننے والے ہوں۔ اور ان کے لیے ووٹ بھی وہی دے سکتے ہیں جنھیں اس اصول سے پوری وابستگی ہو۔ دینی اسٹیٹ میں لادینی اسٹیٹ کے اوصاف لا کے پیوند کرنے کا کوئی موقع نہیں چنانچہ خلافت راشدہ میں چاروں موقعوں پر یہی اصول کارفرما رہا ہے۔

۲۔ دوسری جماعتوں کے مقابلے میں مسلم جماعت کو رکھ کے دیکھا جائے تو اس کے اسٹیٹ کی نوعیت یک حزبی (ONE PARTY STATE) قرار پاتی ہے لیکن خود داخلی حیثیت سے اس جماعت کا سارا اندرونی نظم لاحزبی (NON PARTY SYSTEM) کے اصول پر چلتا ہے پس اس کی شوریٰ (PARLIAMENT) میں یا اس کے انتخابات میں پارٹی بازی کی کوئی گنجائش نہیں۔ یہاں انتخابات "لاحزبی" اصول (NON PARTY SYSTEM) پر ہوتے ہیں۔

داخلی طور پر اسلامی ریاست کو "تخریب" سے سختی کے ساتھ روکا گیا ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ خلافت راشدہ کے تحت چاروں انتخابات کے موقع پر نہ پارٹیاں بنیں نہ پارٹی ٹکٹ جاری کئے گئے نہ مقابلہ ومجادلہ کا سلسلہ چلا۔

۳۔ عصبیت جاہلیہ سے اجتناب ــــ یعنی نسل، نسب، علاقہ، زبان، خاندان، وغیرہ کی تمام جاہلی عصبیتوں کو اسلام نے کالعدم قرار دیا ہے پس ان عصبیتوں کا اسلامی اسٹیٹ کے نظام سیاسی میں دخیل ہونا یا ان کے واسطوں کا انتخابات میں استعمال ہونا خدا اور رسول کے نزدیک مبغوض ہے۔ چنانچہ خلفائے راشدین کے انتخابات اس قسم کی عصبیتوں کی مداخلت سے پاک رہے۔ قریش یا مہاجرین یا بنی ہاشم یا انصار میں سے اگر انتخاب امیر کے لیے اپیل کیا بھی گیا تو بطور عصبیت جاہلیہ نہیں کیا گیا، بلکہ یا تو اس وجہ سے کہ ایک خاص گروہ خدمات اسلام کے لحاظ سے اس کا مستحق ہے یا اس بنا پر کہ شرعًا کسی کے استحقاق خصوصی پر کوئی شرعی دلیل پیش نظر تھی۔

۴۔ رائے عام کی آزادی کا تحفظ ــــ اس امر کا بھی خاص اہتمام خلافت راشدہ میں رہا ہے کہ عوام کی آزادئ رائے انتخابات کے دوران میں محفوظ رہے۔ بیعت وہی موثر ہے جو اختیاری ہو اور جبری نہ ہو۔ جبری بیعت جس طرح دھمکانے سے وجود میں آتی ہے اسی طرح ذہنی مرعوبیت سے بھی بیعت نیم جبری ہو جاتی ہے اس چیز کا لحاظ کرتے ہوئے حضرت عمرؓ نے اپنے چچازاد بھائی کو خلیفہ ثالث کو نامزد کرنے والے کمیٹی کا رکن نہیں بنایا تھا۔ کہ لوگ کہیں ان پر اس وجہ سے نگاہ نہ ڈالیں کہ یہ میرے چچازاد بھائی ہیں۔ اسی طرح عبداللہ ابن عمرؓ کو قبول خلافت سے محروم کر دیا تھا کہ کہیں ان کو میرا بیٹا ہونے کی وجہ سے لوگ ترجیح نہ دیں۔ ان دونوں صورتوں میں حضرت عمرؓ کو اندیشہ تھا کہ لوگوں کی آرا۔ بے جا طور پر متاثر ہو جائیں گی جب ہم اس اصول کو سامنے رکھتے ہیں تو ناگزیر معلوم ہوتا ہے کہ حکومت کے کارپردازوں اور ان کے لواحقین کو کسی الیکشن کے دوران میں متعین اشخاص کے خلاف یا ان کے حق میں پروپیگنڈہ کرنے سے روک دیا جائے۔ یہ عین شریعت کے مزاج کے مطابق ہے۔

نظام مصطفےٰ نمبر کے بارے میں اپنے تاثرات ضرور لکھئے (مدیر)

محمد انوار الحسن خاں انور

راہِ نجات

ادھر آ ادھر ساقیٔ خوش خرام
ترے رند مدت سے ہیں تشنہ کام

پلا دے شرابِ محبت کا جام
عداوت کے جبڑوں میں دیدے لگام

وہ مے جس میں پنہاں محبت کا رنگ
کرے دور جو دل سے نفرت کا زنگ

وہ مے جس سے پائے جنوں تازگی
وہ مے جس سے دل کو ملے زندگی

وہ مے جس سے دھل جائے دل کا غبار
وہ مے جس سے پائے محبت نکھار

وہ مے جس سے چھلکے یقیں کا جلال
وہ مے جس سے سنورے وفا کا جمال

وہ مے جس سے قائم خودی کا سہاگ
بھڑکتی رہے جس سے ایماں کی آگ

وہ مے جس سے ہو آرزو کا نمو
وہ مے جس سے رگ رگ میں دوڑے لہو

مجھے جام دے وہ بصد اہتمام
ملے جس سے سوزِ دروں کو دوام

مرے ساقیا کیوں ہے اتنا اداس
فسردہ نگاہیں، پریشاں حواس

نہ آنکھوں میں نرمی، نہ چہرے پہ نور
ابھرتی نہیں دل میں موجِ سرور

نہ لب پر تبسم نہ عارض پہ رنگ
ادا میں ہے شوخی نہ دل میں امنگ

پریشاں ہے کیوں اس قدر کیا ہے بات
ہے بے چین دل میں غمِ کائنات

راہِ نجات

زمانے کے فتنوں سے دل سرد ہے — جبھی تو ترا رنگ رُخ زرد ہے
ہے انسانیت کی تباہی کا ڈر — جبھی تو تری کانپتی ہے نظر
یہ سچ ہے کہ جینا ہے دشوار آج — زمانہ ہے مصروف پیکار آج
جفا رقص عشریاں میں مشغول ہے — وفا آج اک جنس مجہول ہے
محبت کا اڑتا ہے ہر سو مذاق! — دلوں میں جگہ پا چکا ہے نفاق
زمانے کا کچھ ایسا بدلا ہے ذوق — نہ ایماں سلامت نہ بیتاب شوق
مروت کا نام و نشاں تک نہیں — یقیں دور، دل میں گماں تک نہیں
ستم کا ہر اک سو ہے سکہ رواں — جفا پیشہ دنیا پہ ہیں حکمراں!
کہیں میری و سروری کا ہے زور — کہیں آمریت کا بڑھتا ہے زور
کہیں زار شاہی ہے جمہوریت — کہیں مارکسزم اور کہیں نازیت
کہیں بادشاہی کا جاہ و جلال — کہیں اور ازموں سے جینا وبال
اہنسا کے پردے میں ہنسا کہیں — تشدد سے محفوظ کوئی نہیں
کہیں پنچ شیلا کے بودے اصول — کہیں یو۔ این۔ او میں مباحث فضول
کہیں سرخ شعلے بھڑکتے ہوئے — کہیں خوف سے دل دھڑکتے ہوئے
کہیں مادیت کے پھیلے ہیں جال — سکوں کی ہے اک سانس لینی محال
کہیں آدمیت ہے خوار و زبوں — کہیں ہو رہا ہے محبت کا خوں
کہیں عصبیت کا جنوں جوش پر — کہیں برق گرتی ہوئی ہوش پر
قبائے اخوت کہیں تار تار — کہیں بے گناہوں پہ جینا ہے بار
کہیں زندگی ہے بہاروں پہ تنگ — کہیں آبگینوں پہ ہے جورِ سنگ
کہیں بک رہی ہے متاعِ سخن — کہیں لٹ گیا زیست کا بانکپن
کہیں گرم بازار رشوت کا ہے — کہیں خون شرم و شرافت کا ہے

راہِ نجات

کہیں عصمتوں کے لٹے کارواں کہیں عفتوں کے پھنکے آشیاں
زبانوں پہ تالے نظر قید ہے خود انساں ہی انساں کا صید ہے
خیالات و افکار پابند ہیں ہے مجروح احساس لب بند ہیں
کہیں زخم خوردہ وقارِ حیات کہیں بجھ رہا ہے شرارِ حیات
کہیں چھن رہا ہے قرارِ حیات کہیں لٹ رہی ہے بہارِ حیات
کہیں خون ارزاں ہے جذبات کا کہ ہے دور دورہ اب آلات کا
کہیں امن کی آڑ میں عزمِ جنگ کہیں اڑ رہا ہے محبت کا رنگ
کہیں جنگ بازوں کی تیاریاں کہیں امن خواہوں کی مکاریاں
کہیں صلح کے روپ میں دشمنی کہیں دشمنی کے لئے دوستی
کہیں پردۂ آشتی میں فریب لباسِ بلندی میں پنہاں نشیب
گناہوں کا سیلاب بڑھتا ہوا رعونت کا نشہ ہے چڑھتا ہوا
کہیں جہل کو مل رہا ہے فروغ کہیں سچ پہ چھاتا چلا ہے دروغ
ترقی پسندی کا شہرہ بہت مگر پٹ چکا ہے یہ مہرہ بہت
مسلط ہوئی بھوک انسان پر دھندلکوں سے دبتی چلی ہے سحر
دل و روح پر اب ہے شہوت کا راج ہے شہوت کے قدموں پہ الفت کا تاج
حسد کے ہیں سینے میں روشن الاؤ زباں پر محبت ہے دل میں تناؤ
کہیں نچ رہے ہیں بتانِ ہوس کہیں آشیاں بھی ہیں ننگِ قفس
کہیں خواہشوں کے سنہری ہیں دام کہیں زیر دستوں پہ جینا حرام
کہیں چھن رہی ہے متاعِ یقیں کہیں اہلِ حق کا ٹھکانا نہیں
نہ غم اتنا کر ساقیٔ فکرمند کہ ہوتا ہے پھر سبز پرچم بلند
یہ پرچم یہ پیغامِ امن و اماں مساواتِ اقوام کا ترجماں

راہِ نجات

نشانِ محبت امینِ خوشی — مدارِ جہاں، رہبرِ زندگی!
رسولِ خودی، مظہرِ ذوالجلال — یہ گہوارۂ عزّ و حشم و جمال
یہ زخموں کا مرہم، یہ درمانِ غم — محبت کی راہوں پہ بڑھتا قدم
یہ تاریکیٔ شب میں روشن چراغ — یہ عشق و یقیں سے چھلکتا ایاغ
یقیں کا تبسم، خودی کا جلال — عروج اس کا انسانیت کا کمال
یہ پیغمبرِ عدل و معراجِ عشق — یہ انسانیت کی بقا، تاجِ عشق
یہ تاریک راہوں میں تفسیرِ نور — یہ تصویرِ عزم و ثبات و شعور
یہ آئینۂ حزم و صدق و صفا — زبانِ حیا، ترجمانِ وفا
نگہدارِ حق پاسبانِ حیات — نگہبانِ ناموس، جانِ حیات
یہ آنکھوں کی جنت یہ دل کا سرور — زمیں پر اتر آئی جنت کی حور
پنپتی ہے سائے میں اس کے حیات — یہ بھٹکی ہوئی زندگی کی نجات
ابھرتا ہے دنیا میں پھر وہ نظام — نہیں جس میں تفریقِ شاہ و عوام
نہیں کشمکش جس میں طبقات کی — حکومت نہیں دل پہ آلات کی
نہیں جس میں محنت کی دولت سے جنگ — نہ نسلی تفاخر نہ پندارِ رنگ
یہاں خار کو بھی ہے اذنِ نمو — سلامت ہے ہر پھول کی آبرو
خزاں سے بہاروں کو رنجش نہیں — نشیمن پہ بجلی کی یورش نہیں
نہ ہے صید کوئی نہ صیاد ہے — صنوبر بھی گلشن میں آزاد ہے
نہیں جام و شیشہ کا سنداں حریف — قوی ہے یہاں جابروں سے نحیف
ہے ممکن یہاں آگ پانی کا میل — یہاں منڈھے چڑھتی ہے ہر ایک بیل
نہیں روشنی کو اندھیرے سے کد — نہ ریشم سے رکھتا ہے آہن حسد
نہ شبنم سے شعلے کو بغض و عناد — نہ باہم زمین و فلک میں فساد

یہاں ظلمتوں کی رسائی نہیں ۔ یہاں ظلم کی بادشاہی نہیں
یہاں بار ہے معصیت کا خیال ۔ اگر ہے تو بس آخرت کا خیال
یہاں خونِ مزدور ارزاں نہیں ۔ پریشاں یہاں کوئی دہقاں نہیں
مسلط دماغوں پہ شیطاں نہیں ۔ لبوں پہ بجز ذکرِ رحمٰں نہیں
یہاں زورِ تخریب چلتا نہیں ۔ شقاوت کا چشمہ ابلتا نہیں
یہاں فتنہ و شر ابھرتے نہیں ۔ یہاں غم کے طوفاں بپھرتے نہیں
ہوس کو ہے یاں سانس لینا حرام ۔ نہ آقا ہے کوئی نہ کوئی غلام
یہاں نفس کی ایک چلتی نہیں ۔ برائی کسی دل میں پلتی نہیں
برابر ہیں اہلِ دول کے غریب ۔ ہیں دونوں ہی اک دوسرے سے قریب
محبت میں کچھ کھوٹ ملتی نہیں ۔ یہاں جنسِ ناموس سستی نہیں
محبت یہاں ہے خدا کے لئے ۔ عداوت یہاں ہے خدا کے لئے
خدا کے لئے بندگی ہے یہاں ۔ خدا کے لئے زندگی ہے یہاں
خدا کے لئے سود و نقصان ہے ۔ خدا کا ہی بندہ ہر انسان ہے
خدا ہی کا دستور چلتا ہے یاں ۔ محبت کا دریا چلتا ہے یاں
وہ ظلمت سے نکلا ہے پھر آفتاب ۔ زمانہ میں پھر آگیا انقلاب
چلے گا زمانے میں پھر حکمِ رب ۔ کہ باطل ہیں انساں کے قانون سب
یہ فرمانِ انساں یہ فرمانِ حق ۔ یہاں رنگ نکھرا وہاں رنگ فق
کہاں زندگی کا جلال و جمال ۔ کہاں موت کی تیرگی کا ابال
کہاں سرخوشی کے چمکتے نجوم ۔ کہاں ظلمت و درد و غم کا ہجوم
کہاں جوششِ طوفانِ نورِ سحر ۔ کہاں کاروانوں کی گردِ سفر
کہاں نغمۂ شوق کی دلکشی ۔ کہاں زحمۂ غم کی افسردگی

راہِ نجات

کہاں عشق کا نشۂ سرمدی	کہاں حرص کا ضعف بیچارگی
کہاں روح کا چین دل کا قرار	کہاں سوزِ غم، فکر کا انتشار
کہاں رنگ و بوئے بہارِ جناں	کہاں شدّت وجورِ فصلِ خزاں
مرے ساقیا ٹوٹے دل جوڑ دے	یہ ملک و وطن کی حدیں توڑ دے
سلامت رہے ارضِ پاکِ حرم	رہے یاد میں اس کی ہر آنکھ نم
مدینے سے دل کو ملے پاک نور	غمِ قرطبہ سے ہو دلِ ناصبور
مقدّس زمیں قبلۂ اوّلیں	رہے نور پاش اور نور آفریں
سلامت رہے قصرِ حمرا کی تاب	لٹاتا رہے چاندنی ماہتاب
نکھرتا رہے تاج کا رنگ و روپ	نچھاور کرے اس پہ مہر اپنی دھوپ
رہے سربلندی قطب کی سدا	رہے جگمگاتا ہوا قاہرا!
بڑھاتا رہے دل کی لو کا شغر	ہمیشہ رہے شام کا کروفر
یہ بغداد و بصرہ کی ارضِ جمیل	بنے منزلِ عشق کی سنگِ میل
یہ قسطنطنیہ کا جاہ و جلال	یہ لاہور و دلی کی شان جمال
بخارا سمرقند کا طمطراق	یہ ٹیونس یہ الجیریا یہ عراق
یہ لبنان و ایران یہ مصر و یمن	شگفتہ رہے ان کا ہر دم چمن
یہ جاوا یہ برما، ملایا و چین	بنیں جلد ہی دست و بازوئے دیں
فلسطین و شام و سعودی عرب	کٹیں ان کے آرام سے روز و شب
یہ سوڈان یہ ہند یہ نجد و پاک	بنے سرمۂ چشمِ شوق ان کی خاک
یہ گنگا یہ دجلہ فراتِ اور نیل	رہیں وادیاں ان کی پاک و جمیل
رہے پرچمِ علم و فن سربلند	ہو عریاں نویسی کی ہر راہ بند
یہ حسانؓ و ابن رواحہؓ و کعبؓ!	ادیب اور مجاہد ہیں جو سب کے سب

وہ صدیق اکبر کا عزمِ قوی — وہ فاروقِ اعظمؓ کی حق پروری
علیؓ اور عثمانؓ صاحب تمیز — وہ زید اور وہ ابنِ عبدالعزیز
وہ سالمؒ مجاہدؒ حسنؒ ابن زیدؒ — ہے تقدیس علم و عمل جن کی صید
یہ چاروں ائمہ کا تخلیقِ فن — بخاریؒ و مسلمؒ کا تحقیقِ فن
یہ بوصیری و اشعریؒ کا کمال — جنیدؒ اور شبلیؒ کا یہ حال و قال
سنائیؒ و عطارؒ و رومیؒ کی مے — غزالیؒ و سعدیؒ و رازیؒ کی نے
یہ حالیؒ و اکبرؒ کا رنگِ سخن — سلیمانؒ و شبلیؒ کا پاکیزہ فن
جمالؒ اور عبدہؒ شکیب ارسلانؒ — ابوالاعلیٰ، مسعودؒ جنت مکاں
یہ جوہرؒ یہ ماجدؒ علیؒ و حسنؒ — شگفتہ ہے جن سے ادب کا چمن
یہ اقبالؒ کا نغمۂ دلنشیں — یہ عشق و خودی و یقیں کا امیں
سعید و سباعی کا زورِ قلم — ترقی ہی کرتا رہے دم بدم
رشیدؒ و ہضیبیؒ و عودہؒ شہید — یہ منظورؒ و عامرؒ امینؒ و حمیدؒ
یہ محمودؒ و شبیرؒ و قاسمؒ رشیدؒ — ہے فن جن کا روحِ قدیم و جدید
یہ شاہ ولی کا اعجازِ فن — مجددؒ کی تحریر کا بانکپن
ابو اللیث، ماہرؒ، مناظرؒ نعیمؒ — ہے پھیلی ہوئی جن کے فن کی شمیم
وہ شہیدؒ وہ ملت کے چشم و چراغ — لہو سے ہے تر جس کے امت کا باغ
وہ الیاسؒ و اشرفؒ کا علم و ہنر — جناحؒ و بہادرؒ کی فکر و نظر
اٹھائے اگر فیض ان سے حیات — تو مل جائے انساں کو راہِ نجات

---

[1] حضرت عمرؓ ابن عبدالعزیز۔ [2] جمال الدین افغانی۔ [3] مولانا ابوالاعلیٰ مودودی۔ [4] مولانا مسعود عالمؒ ندوی [5] علی میاں [6] حسن البنا [7] حضرت سعید رمضان [8] مصطفےٰ سباعی مرحوم [9] رشید رضا مرحوم [10] حسن الہضیبی مرحوم [11] عبدالقادر عودہ مرحوم [12] مولانا منظور نعمانی [13] عامر عثمانی مرحوم [14] حضرت مولانا امین احسن اصلاحی [15] حمید الدین فراہی مرحوم [16] مولانا محمود الحسن مرحوم [17] مولانا شبیر احمد عثمانی مرحوم [18] مولانا قاسمؒ نانوتوی [19] مولانا رشید احمد گنگوہی مرحوم [20] شاہ ولی اللہ مرحوم اور ان کا خانوادہ [21] شیخ احمد سرہندیؒ [22] مولانا ابو اللیث [23] مولانا ماہر القادری مرحوم [24] مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم [25] حضرت نعیم صدیقی [26] سید احمد شہیدؒ [27] مولانا الیاسؒ مرحوم [28] مولانا اشرف علیؒ مرحوم [29] قائداعظم مرحوم [30] نواب بہادر یار جنگ مرحوم۔

نظام اسلام کے نصب العین کے بارے میں قرآن حکیم کا یہ واضح ارشاد ہے کہ

الذین ان مکنھم فی الارض اقاموا الصلوٰۃ واتوا الزکوٰۃ وامروا بالمعروف ونھوا عن المنکر وللہ عاقبۃ الامور

یہ وہ لوگ ہیں جنھیں اگر ہم زمین میں اقتدار دیں تو وہ نماز قائم کریں گے۔ زکوٰۃ دیں گے۔ معروف کا حکم دیں گے اور منکر سے روکیں گے اور سب کاموں کا انجام خدا ہی کے اختیار میں ہے۔

اس لئے اسلامی نظام کے قیام کا اعلان ہوتے ہی نظم نماز اور نظم زکوٰۃ قایم کرنا لازم ہوجاتا ہے۔ کیونکہ اسلامی نظام کا قیام معاشرہ میں بندگی رب کے تقاضے پورے کرنے کے لئے ہی ہوتا ہے۔ اور بندگی رب ہی وہ اصل مقصد ہے جس کے لئے انسانوں کے خالق نے اسے پیدا کیا ہے۔ اور خدا کی عبادت یہ ہے کہ ہوش سنبھالنے کے بعد سے مرتے دم تک آدمی خدا کے قانون کا پابند رہے اور اس کے احکام کے مطابق زندگی بسر کرے اس عبادت کے لئے کوئی وقت مقرر نہیں۔ یہ عبادت تو ہر وقت ہونی چاہیئے۔ نہ اس عبادت کی کوئی ایک شکل مقرر ہے۔ ہر کام اور ہر شکل میں اللہ کی عبادت ہونی چاہیئے کیونکہ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ آدمی ایک خاص وقت میں تو خدا کا بندہ ہو اور دوسرے وقت اس کا بندہ نہ رہے۔

انسان کو ہمہ وقتی بندگی کے لئے تیار کرنے کے مقصد سے مالک نے نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج جیسی عبادتیں فرض کر دی ہیں۔ ان میں سے نماز دن میں ۵ بار پڑھی جاتی ہے۔ گویا نماز ہمیں پانچ بار یاد دلاتی ہے کہ ہم اللہ کے بندے ہیں اور اسی کی بندگی ہمیں کرنی چاہیئے۔ روزہ سال میں ایک مہینہ تک آپ کو دین کی راہ میں بھوک پیاس اور شدائد کو برداشت کرنے کی تربیت دیتا ہے۔ زکوٰۃ ہمیں یاد دلاتی ہے کہ ہم نے جو مال کمایا ہے وہ خدا کی دین ہے۔ اسے صرف اپنی ضرورتوں اور نفس کی خواہشوں پر صرف کرنا صحیح نہیں بلکہ اس میں سے مالک کا حق بھی ادا ہونا چاہیئے۔ اس کے نام پر بھی کچھ خرچ ہونا چاہیئے۔ یہی حال حج کا ہے۔ حج دل پر خدا کی محبت اور بزرگی کا ایسا نقش بٹھاتا ہے کہ ایک مرتبہ بات دل میں اتر جائے تو تمام عمر اس کا اثر دل سے دور نہیں ہو سکتا۔

نظام اسلامی میں بھی یہ ضرورت بہرحال باقی رہتی ہے کہ ہمیں بار بار یہ یاد دلایا جاتا رہے ہم خدا کے بندے ہیں اور اس کی بندگی کے لئے ہر وقت کمربستہ رہنا ہمارا فرض ہے۔ جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا نماز دن میں ۵ بار یاد دلاتی ہے کہ ہم اللہ کے بندے ہیں۔ ہم اس کے سپاہی ہیں اور اس کے احکام کی تعمیل کے لئے مستعد ہیں۔

چنانچہ موذن کی آواز سن کر ہمارے احساس بندگی کا تقاضا ہے کہ ہم ہر کام چھوڑ کر نماز کی طرف دوڑے چلے جائیں اور ثابت کریں کہ ہم اللہ کے احکام کو ماننے کے لئے ہمہ وقت تیار

ہیں۔ جو مسلمان اذان کی آواز سن کر بھی بیٹھا رہتا ہے اور اپنی جگہ سے نہیں ہلتا وہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ اپنے فرض کو پہچانتا ہی نہیں یا اگر پہچانتا ہے تو وہ اتنا نالائق اور بے کار آدمی ہے کہ خدا

کی بندگی کے نظام میں شامل رہنے کا اہل ہی نہیں۔
اسی وجہ سے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جو لوگ اذان کی آواز سن کر اپنے مکانوں سے نہیں نکلتے میرا جی چاہتا ہے کہ جاکر ان کے گھروں میں آگ لگادوں۔ دراصل نماز کفر اور اسلام کے درمیان وجہ تمیز ہے۔ حضور کے زمانے میں کوئی ایسا شخص مسلمان ہی نہیں سمجھا جاتا تھا جو نماز کے بارے میں غفلت کا رویہ اپناتا تھا۔ اس سے یہ بات ذہن نشین کرنا مقصود ہے کہ اسلام میں کسی ایسے آدمی کو مسلمان سمجھے جانے کی گنجائش ہی نہیں جو نماز کے نظم کا پابند نہ ہو۔ ۵ وقت کی روزانہ نماز انسان کا امتحان ہے کہ وہ حقیقتاً ذہن و دل کے اعتبار سے مسلم ہے بھی یا نہیں۔ جو شخص اس پنج وقتہ حاضری کے لئے تیار نہیں ہے وہ نظام اسلامی کی رکنیت کے لئے گویا ابھی تیار نہیں ہے۔ اور خدا اور رسول کی اطاعت کا دعویٰ ابھی محض جھوٹا دعویٰ ہے
یہی وجہ ہے کہ نظام اسلامی کے برپا ہونے کے مرحلہ اوّل ہی سے نماز فرض ہے تاکہ بندگی کے لئے مستعدی کے اظہار کے ساتھ ساتھ آدمی کو بار بار یاد آتا رہے کہ اس کا مقصد وجود کیا ہے اس کے دل میں بار بار خدا کی یاد آتی رہے۔ اسے برائی سے نفرت اور منکرات سے گھن آنے لگے اور وہ خدا کا سپاہی بن کر تعمیر و اصلاح کے کاموں میں لگ جائے۔
پاکستان نے اچھا کیا کہ نظام اسلام کے قیام کے لئے ابتدائی اقدام کرنے سے پہلے نماز کے نظم پر توجہ دی اور حکومت کے ایوانوں، دفاتر، مدارس اور تمام پبلک جگہوں پر نماز کا انتظام کیا۔ یہ بات سن کر بعض لوگوں کو تعجب بھی ہوا کہ قومی اسمبلی اجلاس کی کارروائی روک کر ملک کے صدر کی امامت میں نماز ادا کرے اور پھر اپنے کام میں لگ جاتے۔ مگر یہ عین روح اسلام کے مطابق ہے۔ اس کے رواج سے مسلمانوں میں مسلمان ہونے کا احساس جاگے گا اور لوگوں میں بندگی رب کا جذبہ بیدار رہے گا۔
نماز کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ نظام اسلامی میں ارکان حکومت نظم نماز قائم نہ رکھ سکیں تو امت کو حق ہے کہ ایسے ناکارہ سربراہوں کو معزول کر دے۔
حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ
یکون علیکم امراء تعرفون وتنکرون

فمن انکر فقد بری ومن کرہ فقد سلم ولکن من رضی وتابع۔ فقالوا افلا نقاتلھم؟ قال لا، ما صلّوا۔ (مسلم)

تم پر ایسے لوگ بھی حکومت کریں گے جن کی بعض باتوں کو تم معروف پاؤ گے اور بعض باتوں کو منکر تو جس نے ان کے منکرات پر اظہار ناراضگی کیا وہ بری الذمہ ہوا اور جس نے ان کو ناپسند کیا وہ بھی بچ گیا مگر جو ان پر راضی ہوا اور پیروی کرنے لگا وہ ماخوذ ہوگا۔ صحابہ نے پوچھا ــ جب ایسے حکام کا دور آئے تو کیا ہم ان سے جنگ نہ کریں؟ آپ نے فرمایا ــ "نہیں جب تک وہ نماز پڑھتے رہیں۔"

مراد یہ ہے کہ ترک نماز وہ علامت ہے جس سے معلوم ہوجاتا ہے کہ وہ اطاعت خدا اور رسول سے باہر ہوگئے ہیں۔ اور پھر ان کے خلاف جہاد کرنا درست ہوگا۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ

شرار ائمتکم الذین تبغضونھم و یبغضونکم وتلعنونھم ویلعنونکم ــ قلنا

تم پر ایسے لوگ بھی حکومت کریں گے جن کی بعض باتوں کو تم معروف پاؤ گے۔

یارسول اللہ افلا ننابذھم عند ذلک؟ قال لاما اقاموا فیکم الصلوٰۃ، لاما اقاموا فیکم الصلوٰۃ۔

تمہارے بدترین سردار وہ ہیں جو تمہارے لئے ناگوار ہوں اور تم ان کے لئے ناپسندیدہ۔ تم ان پر لعنت کرو اور وہ تم پر لعنت کریں۔ صحابہ کرام نے عرض کیا کہ ــ "یارسول اللہ! جب یہ صورت ہو تو کیا ہم ان کے مقابلے پر نہ اٹھیں؟" فرمایا نہیں جب تک وہ تمہارے درمیان نماز قائم کرتے رہیں نہیں جب تک وہ تمہارے درمیان نماز قائم کرتے رہیں۔

بات دراصل یہ ہے کہ نماز سے مسلمانوں کی جماعتی زندگی میں بندگی رب کا نظام قائم

کرنا مقصود ہوتا ہے اس لئے مسلمانوں کے
ہمہ اور سربراہان کے لئے ضروری ہے کہ ان
کے تحت جو نظام حکومت چل رہا ہو وہ کم سے کم
اقامت صلوٰۃ کا انتظام کرے یہ اس بات کی
علامت ہوگی کہ ان کی حکومت اپنی اصلی نوعیت
کے اعتبار سے ایک اسلامی حکومت ہے۔ ورنہ
اگر یہ بھی نہ ہو تو پھر اس کے معنی یہ ہوں گے کہ
وہ حکومت اسلام سے منحرف ہو چکی ہے اور
اسے الٹنے کی کوشش جائز ہوگی۔

نماز کے بعد اسلام کا سب سے بڑا رکن زکوٰۃ
ہے۔ دراصل نماز اور زکوٰۃ دو بڑے ستون
ہیں جن پر اسلام کی عمارت تعمیر ہوتی ہے۔ یہ نہ
ہوں تو نظام اسلامی کے قیام کا سرے سے ہی
کوئی امکان نہیں۔

زکوٰۃ کے لغوی معنی پاکی، طہارت، برکت
اور فلاح کے ہیں اور قرآن اور حدیث میں یہ
لفظ ان سب معنی میں ہی استعمال ہوا ہے۔ ویسے
شریعت میں زکوٰۃ کا اطلاق مال کے اس حصے پر
ہوتا ہے جسے اللہ نے مستحقین کے لئے فرض کیا
ہے۔ زکوٰۃ دینے سے آدمی کے دل میں مال کی
محبت میں اعتدال پیدا ہوتا ہے اور دولت
سماج کے لئے برکات کا سبب بن جاتی ہے۔

قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ
خذ من اموالهم صدقة تطهرهم
وتزكيهم بها۔ (التوبہ)

ان کے مال میں سے صدقہ لو اس کے
ذریعہ ان کو پاک کرو اور ان کا تزکیہ کرو۔

شرعی زکوٰۃ کو عربی میں صدقہ بھی کہتے ہیں
اور زکوٰۃ اور عشر ایک ہی قسم کی چیزیں ہیں قرآن
مجید بتاتا ہے کہ قدیم زمانے ہی سے تمام انبیاء
کی امتوں کو نماز کے ساتھ زکوٰۃ کا بھی لازمی طور
پر حکم دیا گیا ہے چنانچہ قرآن حضرت ابراہیم، حضرت
اسمٰعیل، حضرت موسیٰ، اور حضرت عیسیٰ سب کے
بارے میں بتاتا ہے کہ وہ لوگوں کو نماز کے ساتھ
ساتھ زکوٰۃ کی بھی تاکید کرتے تھے۔

زکوٰۃ کی ادائیگی مال کی قربانی کا امتحان ہے
اللہ دیکھنا چاہتا ہے کہ کہیں اس کے بندے
چھوٹے دل کے پست ہمت، کم حوصلہ اور کم ظرف
تو نہیں ہیں۔ وہ ان لوگوں میں سے تو نہیں جو
وفاداری کے دعوے تو کرتا ہے مگر جیب سے
کچھ خرچ کرنے کے لئے تیار نہیں۔ جو شخص
خدا کے دیئے ہوئے مال میں سے بھی اللہ کی

راہ میں خرچ کرنے سے جی چراتا ہے وہ اللہ کی مدد کا مستحق ہی کب ہے۔ وہ پورا مسلم ہی کہاں ہے۔ جب وہ اللہ کی بندگی میں خوشی سے ذرا سا مال بھی خرچ نہیں کرسکتا تو وہ اللہ کی راہ میں جان، اولاد اور خاندان کو کیسے قربان کرسکے گا۔ سچ کہا ہے اللہ تعالےٰ نے کہ

وَمَنْ یُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ

جو لوگ تنگدلی سے بچ گئے وہی فلاح پانے والے ہیں۔

نظام اسلام میں تو ایسے فراخ دل لوگوں کی ضرورت ہے جو تنگدستی اور غربت وافلاس کی حالت میں بھی اپنا پیٹ کاٹ کر خدا کے دین کی خدمت اور خدا کے بندوں کی مدد میں روپیہ صرف کرنے سے دریغ نہیں کرتے۔ اور اللہ کے اس حکم کو خوش دلی سے پورا کرتے ہیں۔

سارعوا الی المغفرۃ من ربکم وجنۃ عرضها السمٰوٰت والارض اُعدت للمتقین الذین ینفقون فی السراء والضراء۔

لپکو اپنے پروردگار کی مغفرت اور اس جنت کی طرف جس کی وسعت زمین و آسمان کے برابر ہے اور جو ان پرہیزگاروں

کے لئے تیار کرکے رکھی گئی ہے جو خوشحالی اور تنگ حالی دونوں حالتوں میں خدا کی راہ میں خرچ کرتے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ زکوٰۃ ایمان کا امتحان ہے۔ یہ دنیا کی حکومتوں کے ٹیکسوں کی طرح کا محض ایک ٹیکس نہیں ہے۔ بلکہ یہ اسلام کی روح اور اس کی جان ہے۔ اس سے اسلامی معاشرہ میں ہمدردی اور فیاضی کی روح پرورش پاتی ہے۔ آپ کے پاس جو دولت ہے اگر آپ اس میں سے اپنے دوسرے بھائیوں کی مدد کریں تو یہ دولت چکر لگاتی ہوئی بہت سے فائدوں کے ساتھ پھر آپ کے پاس پلٹ آئے گی۔ اسے ایک مثال سے سمجھئے۔ مان لیجئے آپ ایک یتیم بچے کی پرورش کرتے ہیں اور اسے تعلیم و تربیت دے کر اس قابل بناتے ہیں کہ وہ آپ کی جماعت کا ایک کمانے والا فرد بن جائے تو گویا آپ نے جماعت کی دولت میں اضافہ کیا اور اس کی

حاکم وقت کا وجود ایک بڑے دریا کی مانند ہے جس کا پانی چھوٹی چھوٹی ندیوں نالوں اور نہروں میں جاتا ہے۔ اگر اس دریا کا پانی شیریں ہے تو ندیوں نالوں اور نہروں کا پانی بھی شیریں ہوگا اور اس دریا کا پانی کھاری ہے تو ندیوں نالوں اور نہروں کا پانی بھی کھاری ہوگا (انتخاب)

خوشحالی سے کسی نہ کسی موقع پر آپ کو بھی براہ راست یا بالواسطہ فائدہ پہنچے گا۔

قصہ مختصر یہ ہے کہ

لن تنالوا البر حتی تنفقوا مما تحبون

آل عمران

تم نیکی کا مقام پا ہی نہیں سکتے جب تک کہ خدا کی راہ میں وہ چیزیں نہ خرچ کرو جن سے تمہیں محبت ہے۔

اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ بات قابل تعریف ہے کہ صدر پاکستان نے نماز کے نظام سے ساتھ ساتھ اب نظم زکوٰۃ کے قیام کا اعلان بھی کردیا ہے۔ جولائی سے وہ زکوٰۃ اور عشر جمع کرنے کا انتظام کر رہے ہیں۔ اور زکوٰۃ اور عشر کو اللہ کے حکم کے مطابق سماجی فلاح کے کام میں خرچ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ جیسا کہ اللہ کا ارشاد ہے۔

انما الصدقات للفقراء والمسکین والعٰملین علیہا والمؤلفۃ قلوبھم وفی الرقاب والغارمین وفی سبیل اللہ وابن السبیل فریضۃ من اللہ واللہ علیم حکیم۔

صدقات یعنی زکوٰۃ اللہ کی طرف سے مقرر کردہ فرض ہے فقراء کے لئے اور مساکین کے لئے اور ان لوگوں کے لئے جو زکوٰۃ وصول کرنے پر مقرر ہوں اور ان کے لئے جن کی تالیف قلب منظور ہو اور گردنیں چھڑانے کے لئے اور قرض داروں کے لئے اور راہ خدا میں اور مسافروں کے لئے اللہ بہتر جاننے والا اور حکمت والا ہے۔

صدر پاکستان نے اچھا کیا کہ لوگوں کو زکوٰۃ اور عشر کا مصرف بھی واضح طور پر بتادیا۔ انھوں نے کہا۔

۱۔ زکوٰۃ اور عشر کے ذریعے مقامی کھاتوں میں جمع شدہ رقم کا ۱۵ فی صد اسی گاؤں محلے یا دیہہ میں خرچ کیا جائے گا جہاں سے یہ رقم حاصل ہوئی ہے۔

۲۔ یہ رقم مقامی لوگ ہی خرچ کریں گے

جن کا انتخاب خود محلے گاؤں یا دیہہ والے ان کی اچھی شہرت یا اعلیٰ کردار کی بنا پر کریں گے۔ یہ نیک اور خدا ترس لوگ یقیناً بیواؤں، یتیموں مسکینوں اور حاجت مندوں کا خیال رکھیں گے اور اپنے علاقے کی جائز ضرورتوں کو پورا کریں گے۔ البتہ حاجت مندوں کی مالی امداد کرتے وقت اس بات کا خیال رکھا جائے گا کہ لوگوں میں مفت خوری کی عادت نہ پڑ جائے بلکہ کوشش یہ ہو کہ اس پیسے سے حاجت مندوں کو اپنے پاؤں پر کھڑا کیا جائے۔ تاکہ وہ دوسروں کے محتاج نہ رہیں اور معاشرے کے صحت مند رکن بن جائیں۔ جب بلدیاتی اداروں کے انتخابات ہو جائیں گے تو یہ کار خیر بھی اس کے سپرد کر دیا جائے گا۔

۳۔ زکوٰۃ اور عشر سے جمع ہونے والی رقم کا جو ۲۵ فیصد حصہ صوبائی کھاتے میں جمع کیا جائے گا اسے صوبائی زکوٰۃ کونسل ان علاقوں میں خرچ کرے گی جہاں زکوٰۃ یا عشر سے جمع ہونے والی رقم کم ہو اور حاجت مند زیادہ ہوں۔

۴۔ اسی طرح مرکزی کھاتے میں جمع شدہ رقوم بھی مرکزی زکوٰۃ کونسل کی ہدایت کے مطابق صوبائی اور مقامی کھاتوں میں ان کی ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے منتقل کی جائیں گی۔

اس سلسلے میں حکومت نے دو باتوں کا تہیہ کر رکھا ہے۔ پہلی بات یہ کہ زکوٰۃ کی ایک ایک پائی صرف ان مدوں پر خرچ ہو جن کی شریعت نے اجازت دی ہے دوسری یہ کہ یہ رقم ایسے ہاتھوں سے خرچ ہو گی جن پر لوگوں کو پورا پورا اعتماد ہو۔

ہمیں امید ہے کہ صدر پاکستان کا اسلامی نظام کے نفاذ کا یہ اعلان اپنی اصل روح کے مطابق سمجھا اور دیکھا جائے گا۔ اور جب یہ نظام بروئے کار آجائے گا اور لوگ اس کی برکتیں دیکھیں گے تو امید کی جاتی ہے کہ دوسرے مسلم ممالک بھی اس مثال پر عمل کریں گے۔

ایں دعا از من از جملہ جہاں آمین باد

سوال: نفاذِ شریعت کے سلسلے میں ۱۲ ربیع الاوّل
کے مبارک دن کو جو ابتدائی روشن اور محکم اقدامات
ئے ہیں، ان کے لئے بانیٔ تحریک اسلامی
ر پوری جماعت اسلامی کو مبارکباد ہو، نیز ہر
ں عالم و عامی کو جس نے اس مقصد کے حصول
ی تمنا کی اور اس میں حصّہ لیا۔ بعد ازاں ساری
ت کے سامنے بھی ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہوں
اس کے لیے سعادت کی راہیں کھل گئیں۔

اب میرے چند سوالات ہیں، ان کا جواب
مختصراً مطلوب ہے۔

۱۔ اہل تشیع نے زکوٰۃ و عشر اور حدود
کے متعلق اختلافی نقطۂ نظر کو چھیڑ دیا ہے۔ اگر
یہ طرزِ فکر جاری رہا تو اور سب گوشوں سے بھی
آوازیں اٹھ کر "کثرتِ تعبیرا" نفاذِ شریعت کو
خواب پریشاں بنا سکتی ہیں۔ بی بی سی اس
خبر سے بہت خوش ہے۔ اور اس نے دل کی
بات یوں کہہ دی ہے کہ نفاذِ شریعت کوئی آسان
معاملہ نہیں۔

۲۔ زکوٰۃ و عشر کے جمع و صرف میں خیانت
کے سدباب کے بغیر آخر اہل احتیاج کیا کریں گے
دیہات میں تو خیر ان کو پہچاننا آسان ہے، شہر
میں بڑی مشکل پیش آئے گی۔ پھر مستحقین اپنے
حقوق وصول کرنے کے لیے دھکے کھاتے
پھریں گے۔

۳۔ موجودہ دور میں مسافروں کے لیے کیا
کام کیا جا سکتا ہے، نیز گداگری کا انسداد کیسے ہوگا

۴۔ زکوٰۃ کے ساتھ انکم ٹیکس کو جوں کا توں رکھنا تو یوں بھی غلط ہے۔ کچھ خاص طور سے انکم ٹیکس کا تو سارا ڈھانچہ ہی غلط ہے۔ میری نظر ملازموں، ادیبوں اور صحافیوں کے انفرادی انکم ٹیکس پر ہے۔ موجودہ نظام میں بڑی زیادتی ہوتی ہے۔ کیا آئندہ کوئی تبدیلی آسکتی ہے۔

۵۔ اب تک درمیانہ کلاس کے جو لوگ اپنی پس انداز رقوم فکس ڈیپازٹ میں جمع کرا کے یا سرمایہ کار اداروں میں حصہ لے کر یا کسی اور طرح اپنی رقوم کو حصول منافع کے لیے استعمال کرتے تھے، اب ان کی رقوم موجودہ سودی سسٹم میں تو لگائی نہیں جائیں گی، اور شرکت ومضاربت پر اگر کہیں لگائی گئیں تو رقم ڈوب بھی سکتی ہے۔ پھر وہ سرمایہ کام میں نہ لگائیں تو زکوٰۃ عائد ہوتی ہے۔ اس الجھن کا حل کیا ہے۔

جواب:۔ ۱۔ آج تک ہمارا نقطہ نظر یہی رہا ہے اور یہی ہونا چاہیئے کہ اہل تشیع اہل سنت کے ساتھ ساتھ ملت محمدیہ کے جزو ہیں جہاں تک اختلافات کا تعلق ہے وہ سیاسی ہوں یا فقہی، ہم ان کے لیے اختلاف کا حق تسلیم کرتے ہیں، مگر جب نظام چلانے کا معاملہ آئیگا۔ تو اختلاف برقرار رہتے ہوئے بہت سی صورتوں میں ہمیں اتحاد اختیار کرنا ہوگا۔ بلکہ کہنا یہ چاہیئے کہ اظہار اختلاف کو محدود راہوں میں رکھ کر اتحاد و یک جہتی و ہم آہنگی کی باتیں اٹھانی ہوں گی اور ان کے لیے عملاً راستے نکالنے ہوں گے۔

برادران اہل تشیع کا اولین نقطہ نظر تو یہ ہونا چاہیئے کہ وہ اپنے آپ کو اہل سنت کے ہم دوش کھڑا کر کے یہ سمجھیں کہ وہ مل کر الحاد، لادینیت اور مخالف اسلام نظریات کے خلاف جہاد کے لیے میدان میں آئے ہیں۔ اور اگر الحاد اور مخالف اسلام نظریات کی گندگیوں سے بچنے کے لیے انہیں اہل سنت کے تصورات پر استوار ہو جانے والا خدا پرستانہ نظام بھی ملے تو وہ اسے اقرب بلکہ اپنا سمجھیں گے۔ دوسری طرف کسی ملک میں اگر اہل تشیع کے تصورات، الحاد اور مادہ پرستی کو شکست دے کر غالب آئیں تو وہاں کے اہل سنت کے لیے وہ سابق کافرانہ نظام سے ہزار درجہ بہتر ہوں گے۔

جن قوانین کا ابھی اجراء ہوا ہے، اگر اس پہلی قسط سے ہی جھے بگڑنے کرنے اور مختلف گروہی فقہوں کے سامنے سے صورت حالات

مضحکہ خیز بن جائے اور ساری ساکھ کا وقار ضائع ہو تو ابھی سے بغور اس امر کو حل کرنا چاہیئے اگر کسی مملکت میں بھاری اکثریت ایک فقہی نقطۂ نظر کی حامل ہو تو اس میں لا آف دی لینڈ یا عمومی قانون تو بہرحال اکثریتی فقہ پر ہی چلے گا دوسرے چھوٹے فقہی گروہ صرف پرسنل لاء کی حد تک اپنی فقہ کے تحت فیصلے لے سکتے ہیں اسی کے الٹ صورت ہے جو برادران اہل تشیع کی اپنی مملکت ایران میں درپیش ہے۔ وہاں شیعی نقطۂ نظر کی فقہ عمومی قانون کی شکل اختیار کرے گی اور اہل سنت کو پرسنل لاء میں آزادی ملے گی۔ نہ یہ کہ وہ عام ملکی قوانین اور فیصلوں میں اپنے لیے الگ حصہ مانگیں۔ ہمارے برادران تشیع کو پاکستان اور ایران دونوں جگہ اپنی ہی دو مسلم مملکتوں کی حیثیت سے سامنے رکھ کر سوچنا چاہیئے کہ دونوں طرف خیر و خوبی سے کام کس طرح چلے گا۔ ایک کا اثر لازماً دوسری جگہ پڑے گا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ ایران کا معاملہ ایران والے جانیں، ہم اپنے ملک کے حالات میں جیسے چاہیں گے کریں گے۔ یہ طرز فکر اس لیے صحیح نہیں کہ اسلامی انقلابات اٹھانے والی تحریکیں ملک ملک میں ایک دوسرے سے الگ تھلگ نہیں ہیں۔ پاکستان اور ایران کی تحریک میں بھی رابطہ ہوا۔ پورے عالم اسلام کو سامنے رکھنا ہے اور اصولی راستے طے کرنے ہیں کہ تمام ملکوں میں اقلیتی فقہوں کے بارے میں کیا روش صحیح ہوگی۔

یہی حقیقت تھی کہ جس کے پیش نظر ۱۹۵۱ء میں مختلف مکاتب فکر کے ۳۱ علماء نے جمع ہو کر اسلامی ریاست کے جو اصول بالاتفاق طے کیے تھے۔ ان کے ضمن میں اختلافی گروہوں کو پرسنل لاء میں اپنی فقہ کے تحت فیصلہ حاصل کرنے کا اختیار تھا، مگر ملکی قانون کے تحت سب میں طے ہو گیا تھا کہ وہ اکثریتی فقہ کے مطابق چلیں گے۔ اس موقع پر اس فیصلے کو بدل کر کوئی صحت مندانہ صورت اختیار نہیں کی جا سکتی۔

برادران اہل تشیع یہ سوچیں کہ اگر وہ زکوٰۃ فنڈ کو الگ کرا لیں، ان کے وصول و صرف کا نظام الگ طے کرائیں، اسی طرح تعلیمی نشری معاشی اور دیگر اداروں اور قومی بجٹ اور ہر شعبے میں یہ چاہیں کہ ان کا انتظام الگ کر دیا جائے تو وہ دوسروں کے ساتھ کس بات

میں مل کر چلیں گے۔

اہل تشیع کے وہ علماء اور رہبر شاید تدبر سے پوری طرح کام نہیں لے سکتے کہ جنھوں نے اپنے لئے کچھ اس طرح کی علیحدگی پسندی کی ہے جیسی قادیانیوں کو حاصل ہے۔ یہ مقام غیروں کے لئے ہے۔ آپ اپنے ہو کر خواہ مخواہ اس حد تک کیوں جانا چاہتے ہیں۔

اہل تشیع کو یہ سوچنا چاہیئے کہ وہ اپنے مساویانہ حقوق بھی لیں اور مساویانہ مرتبے پر بھی رہیں۔ مگر کسی حالت میں ایک تو علیحدگی پسندی کے راستے پر نہ پڑیں، اور دوسرے اپنا رویہ ایسا مزاحمانہ نہ رکھیں کہ ہماری بات مانو ورنہ ہم نفاذِ شریعت کی گاڑی چلنے ہی نہیں دیں گے۔ یہ کوئی مناسب طریقِ کار نہیں ہے۔

سائل سے گذارش ہے کہ اگر ہمارے یہ بھائی حکمت و بصیرت سے کام لے سکیں تو ان کے حق میں بھی اور ہمارے حق میں بھی بہتر ہوگا ورنہ یہ فرقہ وارانہ کشاکش اور فقہی انتہا پسندیاں سارے کام کو ناکام کر کے فتح کا سہرا الحاد و دہریت کے سر باندھ دیں گی۔ اور ایسے سانحے تاریخ میں پہلے بھی پیش آتے رہے ہیں۔

۲۔ زندگی میں آج جو خیانت کا طوفان درپیش ہے، اسے دیکھ کر آپ کی پریشانی درست ہے۔ مگر زکوٰۃ و عشر کا نظام چلانے والی کمیٹیاں اگر دیانت دار افراد سے ترکیب پائیں اور ان میں مقامی ائمہ و خطیب حضرات کے ساتھ دیندار اور غیر بدنام افراد کو ملا کر کام چلایا جائے تو ضرورت مندوں کی تشخیص ہو سکتی ہے۔ اور ان کے مجلس عام میں اور ان کے گھروں پر جا کر نقد روپیہ یا سامانِ رسد پہنچایا جا سکتا ہے۔

شہروں میں بھی اگر وارڈوں کی زکوٰۃ کمیٹیاں قومی اتحاد کے مشورے سے بنائی جائیں تو بڑی حد تک معاملہ درست ہو سکتا ہے۔ پہلے سے ضرورت مندوں کی فہرستیں اور ان کی ضروریات کے فارم مرتب ہو کر ڈی سی آفس میں چلے جائیں اور وہاں ضلعی زکوٰۃ کمیٹی کے سامنے تمام رپورٹیں اور فہرستیں اور فارم رکھے جائیں، کمیٹی کے مشورے سے ڈی سی منظوری دے اور ہر ضرورت مند کے لیے کارڈ بن جائے جس پر درج ہو کہ اسے عام مالی امداد دی جائے یا غلے کی صورت میں، یا بیماری میں اس کے علاج کے لیے اعانت چاہیئے یا

کسی طالب علم کے لیے کتابیں یا وظیفہ درکار ہے وغیرہ۔ مقررہ وقفوں پر رقوم کی وصولی کے لیے تاریخیں درج ہوں، اور یہ رقم کسی بھی بنک کی شاخ یا کسی بھی ڈاک خانے سے وصول کی جاسکے۔

کمیٹیوں کی طرف سے بالفرض کسی مستحق کو دانستہ یا سہواً چھوڑ دیا گیا ہو تو وہ خود ضلعی کمیٹی کو درخواست دے سکتا ہے تاکہ اس کا معاملہ درست کر دیا جائے۔ گاؤں یا وارڈ کے لوگ تنقید و احتساب بھی کر سکتے ہیں۔

۳۔ میرا خیال ہے کہ نادار مسافروں کے لیے کچھ مدد تو مقامی کمیٹی کی طرف سے ملنی چاہیئے جبکہ انہیں کسی بیماری یا مقدمہ یا کسی اور مجبوری سے سفر کرنا پڑے۔ مسافر کو زادِ راہ مقامی طور پر مل جائے، یا اسے ریل کا ٹکٹ خرید کر دیا جاسکتا ہے۔

جہاں تک مسافروں کی اجنبی شہروں میں رہائش کا تعلق ہے، جہاں ان کا کوئی اپنا رشتہ دار نہ ہو تو ان کے لیے ایسی سرائیں بنوائی جائیں جن میں سادہ بستر دو تین روپے میں ملے اور دن بھر کا سادہ صاف ستھرا کھانا چار یا پانچ روپے میں۔ اس سے زیادہ کوئی بار اس پر نہ پڑے۔ ایسی رعایت تین دن تک عام ہو، کسی خاص صورت میں قیام زیادہ کرنا پڑے تو مقامی زکوٰۃ کمیٹی کا تصدیق نامہ اس کے پاس ہونا چاہیئے کہ یہ شخص مستحق ہے اور اسے فلاں کام کے لیے شہر یا قصبے وغیرہ میں رہنا ہے۔

اجرائے زکوٰۃ وعشر کے بعد گداگروں کا سڑکوں پر موجود رہنا واقعی بڑا شرمناک ہے گداگروں کی دو تین قسمیں ہیں۔

ایک قسم تو جائیداد (مکان، زمین وغیرہ) رکھنے والے لوگوں کی ہے۔ وہ اپنی جائیداد پر گذارہ کریں، یا حکومت اپنے اہتمام سے ان کی جائیداد بیچ کر یا جائیداد سے آمدنی حاصل کر کے ان کو محتاج گھروں میں رکھے اور ان کا مال ہی ان پر خرچ کرے۔ ایک گداگر جسمانی طور پر معذور قسم کے ہیں۔ ان کو محتاج گھروں میں رکھ کر زکوٰۃ فنڈ سے ان کی ضروریات پوری کی جائیں۔ تیسری قسم گداگروں کی وہ ہے جو جائیداد تو نہیں رکھتی مگر مضبوط جسم رکھتی ہے۔ ایسے لوگوں کو محنت مزدوری کے کام دلوائے جائیں یا ان کو کسی دستی کام کی تربیت دلوائی جائے یا

ان سے کوئی خوانچہ وغیرہ شروع کرایا جائے۔ لیکن یہ لوگ مندرجہ فہرست ہونا چاہئیں تاکہ اگر اپنی جائیدادوں سے، محتاج خانوں سے، کسی دارالعلاج سے، محنت یا ٹریننگ کی کسی جگہ سے یا کسی خوانچہ ریڑھی سے بھاگ جائیں تو پھر ان کو گرفتار کر کے پہلے بطور سزا جیل میں رکھا جائے اور پھر انہیں راستے پر ڈالا جا سکے۔

۵۔ یوں تو ہمارے ہاں کے ٹیکس اور مالیات کے پورے ہی نظام کی تجدید کرنی ہوگی لیکن ملازموں اور دماغی کام کرنے والوں سے جو انفرادی ٹیکس لیے جاتے ہیں ان کا سسٹم بے حد نامعقول ہے۔ نمایاں خرابیاں یہ ہیں۔

ا۔ مستثنیٰ رقم کی حد قیمتوں اور افراطِ زر کے ساتھ ساتھ بدلتی نہیں بلکہ برسوں جاری رہتی ہے

ب۔ بھاری کنبے والے، درمیانی کنبے اور مجرد فرد کو یکساں آمدنیوں میں سے تقریباً یکساں ٹیکس دینا پڑتا ہے یہ بالکل بے تکا معاملہ ہے یعنی آٹھ آدمیوں کا بار اٹھانے والے کو، تنہا ایک آدمی کے مقابلے میں کوئی خاص رعایت حاصل نہیں۔ حالانکہ میرے خیال کے مطابق بڑے کنبے ۶-۷ تا ۱۰ افراد) والے اور درمیانہ کنبے والے (۲ تا ۵ افراد) والے اور مجرد حضرات کے لیے ٹیکس سے مستثنیٰ رقوم بحالاتِ موجودہ علی الترتیب ۳۰ ہزار، ۲۴ ہزار، ۱۸ ہزار سالانہ ہونی چاہیئے۔ اسی طرح کوئی شخص اگر اپنا آبائی یا نو تعمیر کردہ مکان رکھتا ہو تو اسے بھی اتنا ہی ٹیکس دینا ہوتا ہے جتنا مکان کا کرایہ دینے والے کو۔ ستم یہ ہے کہ بعض صورتوں میں کرائے کی رعایت ملتی بھی ہے تو معروف گریڈوں کے ساتھ مقرر شدہ کم شرح سے ملتی ہے۔ مثلاً کسی شخص کو ۸۰ یا ۱۰۰ روپے کرایہ الاؤنس ملا، حالانکہ عملاً لاہور میں ایک کمرے کا مکان دو ڈھائی سو روپے سے کم نہیں ملے گا۔ دو یا تین کمروں کا ہو تو چار یا چھ سو روپے میں، اس سے اوپر آٹھ سو تا بارہ سو روپے سے کم نہیں ملے گا۔ میرا خیال ہے کہ جو کچھ حقیقی کرایہ دیا جا رہا ہے اس کا دستاویزی ثبوت رسیدوں کی شکل میں اگر دیا جائے تو کرایہ کی سالانہ رقم ٹیکس سے مستثنیٰ آمدنی محسوب ہونی چاہیئے۔ علاوہ ازیں پڑھے لکھے لوگ جو دماغی کام کرتے ہیں، جیسے اساتذہ، ڈاکٹر، انجنیئر ادیب، صحافی، خطیب وغیرہ، ان کے ملاقاتیوں کا ایک بڑا حلقہ ہوتا ہے۔ اور وہ ان کے لیے

مناسب جگہ اور ضروری فرنیچر کے علاوہ تواضع کا بندوبست بھی کرتے ہیں۔ اس کا بھی استثنے ہونا چاہیئے۔

زندگی کے ان حقیقی مسائل کو اعلیٰ افسران دفتروں میں بیٹھ کر سمجھ نہیں سکتے۔ اور ان پر نگاہ رکھے بغیر ٹیکس کا عادلانہ نظام وضع نہیں کیا جاسکتا۔

۶۔ فکسڈ ڈیپازٹ یا سرمایہ کاراداروں میں رقوم رکھنے والے حضرات کے لیے پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ بنک کی جمع شدہ رقوم مختلف نفع آور کاموں میں لگائی جائے گی۔ اور موجودہ سود کے بجائے، منافع ان پر جمع ہوتا رہے گا۔ کسی ایک آدھ کام میں خسارہ ہو بھی تو اس کا اثر نہیں پڑے گا۔ آخر رقوم تو پھیلا کر لگائی جائیں گی۔ اور مجموعی طور پر ساری رقوم کا منافع محسوب ہوگا۔ کیونکہ بنک ہر فرد کی رقوم الگ الگ اس سے معاہدہ کرا کے نہیں لگائے گا، بلکہ اپنے کھاتہ داروں کی حاصل کردہ رقوم کو وہ ملا جلا کر آگے چلائے گا۔ اور حاصل شدہ منافع سب پر پھیل جائے گا۔

اس منافع میں سے ۲½ فی صدی زکوٰۃ نکالتے رہنے سے کوئی کمی واقع نہ ہوگی، ہاں البتہ کوئی آدمی اب گھر میں کالا دھن چھپا کر رکھے گا تو خسارے میں رہے گا۔

مصطفیٰ احمد زرتاع

اسلام کا نظامِ تعزیر

لغوی لحاظ سے تعزیر کے معنی ہیں 'باز رکھنا' تہذیب و شرافت سے بہرہ مند کرنا۔ یہ لفظ مدد اور نصرت کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے:

فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِہٖ وَعَزَّرُوْہُ وَ نَصَرُوْہُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْ اُنْزِلَ مَعَہٗ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ
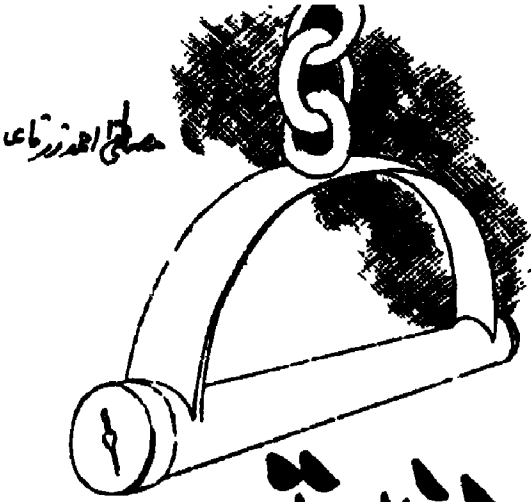
(جو لوگ رسول پر ایمان لاتے اور اس کی مدد و نصرت کی اور اس نور کی اتباع کی جو اس پر نازل کیا گیا ہے۔ یہی لوگ دراصل فلاح پانے والے ہیں۔)

تعزیر میں مدد اور نصرت کا مفہوم بھی اس لیے شامل ہے کہ اس میں دشمن کے انسداد اور استیصال کے معنی پائے جاتے ہیں۔ اصطلاحِ فقہ میں تعزیر اس سزا کو کہتے ہیں جو قانون میں بہ لحاظ مقدار و نوعیت بالکل مقرر نہ کر دی گئی ہو بلکہ جس میں عدالت حالاتِ مقدمہ کے لحاظ سے کمی بیشی کر سکتی ہو۔

یہ سزا حدود و قصاص کے ما سوا تمام ایسے جرائم اور افعالِ ممنوعہ کے ارتکاب پر دی جا سکتی ہے جو مرتکب جرم کو زجر و توبیخ کرنے اور آئندہ اسے جرم سے باز رکھنے کا تقاضا کرتے ہیں۔

تعزیر کو اختیاری سزا بنانے کی مصلحت

تعزیر کی نوعیت و مقدار کا تعین ارباب قضا کو سونپ دینے میں مصلحت شرعی یہ ہے کہ جرائم اپنی اشکال و اقسام کے لحاظ سے غیر محدود ہیں اور بسا اوقات ان کی ایسی نرالی قسمیں سامنے آتی رہتی ہیں جن کا پہلے وجود نہیں ہوتا بلکہ کبھی ایک ہی مجرم نو بہ نو لبادے اوڑھ کر اور گوناگوں ہتھکنڈے اختیار کر کے سامنے آتا ہے، جس کے انسداد اور بیخ کنی کے لیے ایک ہی نوعیت کی تدابیر کارگر نہیں ہو سکتیں بلکہ دوسرے مؤثر طریقوں کو بھی بروئے عمل لانے کی ضرورت ہے۔ چنانچہ شریعت اسلامی نے اپنی گہری حکمت عملی کے پیش نظر معروف اور نمایاں جرائم کی چند اقسام جو براہ راست اسلام کے اجتماعی نظام کی بنیادوں پر حملہ آور ہوتے ہیں بذریعۂ نص متعین کر کے اُن کی سزائیں مقرر کر دی ہیں اور اُن کے علاوہ تمام جرائم کے استیصال و بندش کے لیے سزاؤں کی نوعیت اور مقدار کے اختیارات عام ارباب امر کو تفویض کر دیے ہیں تاکہ وہ اپنی صوابدید کے مطابق زمان و مکان کے اختلاف، افراد کی حیثیت اور معاشرے کی تہذیبی سطح کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہر جرم کی مناسب سزا مقرر کرنے میں آزاد رہیں۔ بعض لوگوں کو معمولی گوشمالی اور انتباہ ہی راہ راست پر لے آتا ہے۔ اور بعض موٹی کھال کے مجرم شدید عقوبت کا مزہ چکھے بغیر جرم سے دست کش ہونے پر رضامند نہیں ہوتے۔ طبیعتوں کے اسی تفاوت اور اثر پذیری کے فرق کی بنا پر شریعت حاکم کو اس امر کا مجاز ٹھہراتی ہے کہ وہ ایک ہی نوعیت کے فعل پر مختلف سزائیں نافذ کر سکتا ہے۔

حاکم اور قاضی مجرم کے لیے تعزیر کی جو صورت بھی تجویز کریں اُس میں اپنے سامنے یہ اصول رکھے کہ وہ شرعی سزاؤں سے مناسبت رکھتی ہو۔ یعنی ان میں انسانوں کو عذاب دینے اور وحشیانہ ایذا پہنچانے کا تصور نہ شامل ہو۔ بلکہ محض اُن کو مؤدب و مہذب بنانے اور اُن کی سرکشی کو روکنے کا مقصد پیش نظر ہو جیسے تازیانہ لگانا، قید کر دینا، جلا وطن کر دینا مالی جرمانہ عائد کر دینا[1] حتیٰ کہ قاضی جرم کی شدت

---

[1] مالی تاوان عائد کرنے کی سزا پر فقہا میں شروع سے اختلاف چلا آتا ہے کیوں کہ اس سزا میں اس امر کا شدید اندیشہ ہے کہ ظالم حکام لوگوں کے مال

...کے پیشِ نظر موت کی سزا بھی دینا چاہے تو اُسے اختیار
...حاصل ہے

تعزیر کے مراتب

فقہائے حنفیہ کے نزدیک تعزیر کا کم سے کم درجہ یہ ہے کہ قاضی یا حاکم مجرم کی طرف ایک بار غضب آلود نگاہوں سے دیکھ لے۔ یا اُسے مخاطب کرکے یہ کہے: "مجھے معلوم ہوا ہے کہ تو نے فلاں حرکت کی ہے۔" یہ سزا اُس وقت اختیار کی جائے گی۔ جب کہ جرم کسی معمولی درجہ کی لغزش شمار ہوتا ہو اور اُس کا مرتکب شرفاء اور اہلِ مروت طبقے سے تعلق رکھتا ہو کیوں کہ ایسے لوگوں کے لیے اتنی سی سزا بھی کافی اثر رکھتی ہے۔ تعزیر کا آخری درجہ سزائے موت ہے۔ جب کہ جُرم نہایت سنگین ہو۔

(بقیہ صفحہ ۱۹۸) پر دست درازیاں شروع کر دیں اور جرمانوں کے نام سے لوگوں کے مال وصول کرکے خود ہڑپ کرنے لگیں۔

قاضی ابو یوسفؒ جرمانہ کی سزا کو جائز ٹھہراتے ہیں۔

فقہائے شافعیہ میں سے محمد بن محمد القرشی المعروف بابن الاخوۃ نے امام شافعیؒ کا یہ مسلک نقل کیا ہے کہ امام شافعیؒ کے نزدیک بعض بُرے افعال کے ارتکاب پر معین مالی جرمانہ واجب ہے۔ ان کا استدلال یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار اونٹ کی زکوٰۃ کے بارے میں ارشاد فرمایا تھا کہ چالیس اونٹوں پر ایک بنتِ لبون یعنی اونٹ کا پورے دو سال کا مادہ بچہ دیا جائے۔ جو شخص یہ حق رضامندی سے ادا کردے گا اسے اللہ کے ہاں اجر ملے گا۔ اور جو اس حق کو روکے گا، اس سے میں وصول کرکے چھوڑوں گا (اور اس وصولی کی شکل یہ ہوگی کہ) اس کے مال کو دو حصوں میں تقسیم کیا جائے گا اور (جرمانہ کے طور پر) اس کے اچھے حصے سے زکوٰۃ وصول کی جائے گی۔ یہ ہمارے پروردگار ہی کا فیصلہ ہے محمدؐ کی اولاد کا اس میں کوئی حق نہیں ہے۔"

ابن شافعیؒ کا یہ مسلک ابن الاخوۃ نے اپنی کتاب "معالم القربۃ فی احکام الحسبۃ" میں بیان کیا ہے۔ اس موضوع پر جتنی کتابیں تالیف کی گئی ہیں ان سب میں جامع کتاب یہی ہے۔ مؤلف رحمۃ اللہ علیہ نے اسے مختصر

مصلحت، حکام و قضاۃ کی صوابدید پر موقوف کر دی گئی ہے، اور اس میں از روئے نص کوئی مقدار یا نوعیت ثابت نہیں ہے۔ لیکن سبب سزا کی تحدید یعنی کیفیت جرم کی تشخیص جو کسی فرد کو مستوجب تعزیر ٹھہراتی ہے لازمی ہے۔ فقہائے اُمت نے اس بارے میں پوری چھان بین اور غور و فکر کے بعد ایک عام ضابطہ مقرر کر دیا ہے جو ذیل میں درج ہے:۔

الضابطة ان کل من ارتکب منکرًا او آذیٰ غیرہ بغیر حق بقولٍ او فعلٍ او اشارة یلزمه التعزیر

اس سلسلے میں اصول یہ ہے کہ جو شخص فعل منکر کا مرتکب ہوتا ہے یا کسی دوسرے کو ناحق اپنی زبان سے یا عمل سے یا اشارہ و کنایہ سے ایذا دیتا ہے اُس پر تعزیر لازم ہے۔

اسی عمومی ضابطے کے تحت وہ تمام جرائم آجاتے ہیں جو ملکی نظام میں اور پُرامن سوسائٹی میں رخنہ اندازی اور فساد انگیزی کا موجب ہوتے ہیں۔ خواہ وہ انسانوں کی باہم ایک دوسرے کی جانوں اور مالوں پر تعدی ہو، اور مار پیٹ، سب و شتم، دہشت انگیزی ڈرانا دھمکانا، فریب دہی، جعل سازی، جھوٹی گواہی اشیا میں ملاوٹ کا کاروبار، فحش و فحش اور چالبازی اور لوٹ بازی کے واقعات ظہور پذیر ہوتے ہوں۔ خواہ وہ مذہبی شعائر کی توہین اور علانیہ ارتکاب معصیت اور اشاعت منکرات ہوں جیسے رمضان المبارک میں سربازار خورد و نوش کی جسارت، مذہب کا مذاق اور زندقہ و فجور کی ترغیب اور شہری آداب و قواعد (Public Morality) کی خلاف ورزی اور بے حرمتی وغیرہ۔ مذہبی فرائض سے بے پروائی اور تغافل برتنا، بالخصوص تعلیم و تعلم میں کوتاہی کا ارتکاب کرنا بھی افعالِ منکرہ کی فہرست میں داخل ہے۔ اگر کوئی صاحب علم دوسروں کو علم سکھانے کا فرض ادا کرنے میں کوتاہی کرتا ہے۔ یا بے علم دینی علم کی ضروری مقدار کے حصول میں بھی تکاسل برتتا ہے تو یہ دونوں شریعت کی نگاہ میں مستحق تعزیر ہیں[1]

---

[1] حافظ منذریؒ مولف مختصر سنن ابی داؤد نے "الترغیب والترہیب" میں یہ روایت نقل کی ہے کہ ایک روز نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ دیا: اس میں آپؐ نے پہلے مسلمانوں کے ایک گروہ کی ستائش کی اور پھر دوسرے گروہ کے بارے میں فرمایا" ان

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے کہ:

"طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم"

علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔

کیا تعزیر معاف کی جاسکتی ہے

اگر موجب تعزیر جرم شہریوں کی باہم تعدی اور ضرر رسانی کی قبیل سے نہ ہو بلکہ صرف مذہبی شعائر کی بے حرمتی اور ارتکاب معصیت کی بنا پر ہو تو یہ تعزیر خالص شریعت کا حق شمار ہوگی۔ لیکن اگر جرم کسی کو مار پیٹ کرنے، سب وشتم کرنے یا دوسروں کو کسی نوعیت سے ایذا پہنچانے کا ہو تو مجرم پر تعزیر کا حق بیک وقت دو طرف سے عائد ہوگا۔ ایک اس شخص کی داد خواہی کا حق جس کو مجرم کے ہاتھوں تکلیف پہنچی ہے اور دوسرا شریعت کا حق جو کہ سوسائٹی

(باقی صفحہ ۲۰۲ کا) لوگوں پر کیا افتاد پڑی ہے کہ وہ اپنے ہمسایوں کو نہ دینی تعلیم دیتے ہیں، وعظ ونصیحت کرتے ہیں، نہ ان کو نیکیوں کی تلقین کرتے ہیں نہ برائیوں سے ٹوکتے ہیں اور نہ خود ہمسایوں کو یہ خیال آتا ہے کہ وہ از خود اپنے عالم ہمسایوں کی طرف رجوع کریں۔ ان سے علم سیکھیں، دین میں تفقہ حاصل کریں۔ وعظ و نصیحت سنیں۔ میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ لوگوں کو اپنے ہمسایوں کو دین سکھانا چاہیے۔ دینی امور میں انہیں تفقہ سے بہرہ مند کرنا چاہیے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے رہنا چاہیے اور ادھر خود لوگوں کو بھی اپنے ہمسایوں سے علم حاصل کرنا چاہیے اور اپنے اندر فہم وفقاہت پیدا کرنا چاہیے۔ اگر ان باتوں کی پابندی نہ کی گئی تو میں ان سب کو دنیا میں بہت جلد سزا دوں گا۔" آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ان ارشادات کو سن کر کچھ لوگ اٹھ کھڑے ہوئے اور پوچھنے لگے، یا رسول اللہ! آپ کے مخاطب کون لوگ ہیں" صحابہ ہی میں سے کچھ لوگوں نے جواب دیا۔" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا روئے سخن اشعری قبیلے کی طرف ہے۔ اس قبیلے کے لوگ خود تو صاحب علم و بصیرت ہیں مگر ان کے پڑوسی اسی طرح بدو اور کندہ ناتراش ہیں۔ اشعریوں کو جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس خطبے کی خبر ملی تو وہ فوراً آپ کے پاس حاضر ہوتے اور عرض کی: اے اللہ کے رسول! آپ نے دوسرے لوگوں کی تعریف فرمائی ہے اور ہماری مذمت کی ہے، ہم سے کیا سرزد ہوا ہے" جواب میں آپ نے اپنی سابقہ تہدید کا اعادہ فرمایا۔ وہ کہنے لگے: کیا ہم لوگ اپنے سے

کو پُرامن رکھنے اور شہریوں کی تادیب و اصلاح کے بارے میں اصولی طور پر حاصل ہے۔ دوسری صورت میں یعنی جب کہ تعزیر کسی مظلوم شخص کے حق کی بنا پر قائم ہوا اور وہ شخص انتقام لینے کا مطالبہ کر رہا ہو تو عدالت کو یہ اختیار حاصل نہیں ہے کہ وہ مجرم کی سزا کو معاف کر دے یا منسوخ کر دے۔ یہ انسانی حقوق کی صریح پامالی ہے اور عدالت کو انسانوں کے حقوق ساقط کرنے کا اختیار نہیں ہے۔ البتہ اگر مستغیث اپنی رضامندی سے ملزم کو معاف کر دے یا تعزیری سزا خالص شرعی حق کے تحت کسی مقدمے میں نافذ کی جا رہی ہو تو اس صورت میں بھی قاضی پر لازم ہے کہ صاحب حق کی طرف سے عفو و درگزر کے باوجود شرعی حق کو قائم کرتے ہوئے مجرم کو سزا دے۔ فقہا کی صراحت کے مطابق قاضی یا حاکم محض اپنے حق کو معاف کرنے کا مجاز ہے لیکن شہریوں کی تہذیب و اصلاح اور انسداد مفاسد کے سلسلے میں ریاست کو جو حقوق حاصل ہیں اُسے وہ معاف نہیں کر سکتا[1]۔ اسی بنا پر فقہا کا یہ فیصلہ بھی ہے کہ اگر ایک شخص کسی دوسرے شخص کو مارتا

علاوہ لوگوں کو بھی سوجھ بوجھ والا بنا دیں۔ آپ نے پھر اپنے کلمات کو دہرایا۔ اُنھوں نے پھر بھی کہا کہ کیا ہم غیروں کے اندر بھی سوجھ بوجھ پیدا کر دیں۔ اس پر آپ نے پھر اپنی وعید کو دہرایا۔ اس کے بعد اُنھوں نے کہا یا رسول اللہ! آپ ہمیں ایک سال کی مہلت عنایت فرما دیں۔ چنانچہ آپ نے ان لوگوں کو تعلیم ہمسایہ کے لیے ایک سال کی مہلت دے دی اور پھر قرآن کی یہ آیت تلاوت فرمائی۔ لُعِنَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ عَلٰی لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِیْسَی ابْنِ مَرْیَمَ ۭ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ۔ كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ ۭ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ (بنی اسرائیل میں سے جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی اُن پر داؤدؑ اور عیسیٰ ابن مریم کی زبان سے لعنت کی گئی کیونکہ وہ سرکش ہو گئے تھے اور زیادتیاں کرنے لگے تھے اُنھوں نے ایک دوسرے کو بُرے افعال سے روکنا چھوڑ دیا تھا۔ یہ بُرا طرزِ عمل تھا جو اُنھوں نے اختیار کیا (المائدہ۔ ۷۸) تعلیم و تعلم میں کوتاہی کو اجتماعی جُرم قرار دینا فی الواقع ایسا حیرت انگیز موقف ہے جو ہادیِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے یا بعد تاریخ کے کسی دور میں بھی اختیار نہیں کیا گیا ہے۔

[1] الاحکام السلطانیہ از ابوالحسن ماوردی باب التعزیر۔

ہے اور دوسرا شخص جواب میں ضارب کو مارتا ہے تو دونوں مستوجب تعزیر ہوں گے۔

طبری نے تاریخ الامم والملوک میں یہ روایت نقل کی ہے کہ ایک بار حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے راستے میں جاتے ہوئے کسی فریادی کی پکار سنی آپ اس کی طرف لپکے اور فرمایا۔ "مددگار حاضر ہے" چنانچہ آپ نے قضیے کی تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ مستغیث نے ایک شخص کے ہاتھ سات درہم میں ایک کپڑا فروخت کیا۔ ان میں سے ایک درہم ناقص تھا بیچنے والے نے اسے واپس کرنا چاہا مگر خریدار نے اسے واپس لینے سے انکار کر دیا۔ جب کپڑے والے نے اسے واپس لے لینے پر اصرار کیا تو خریدار نے اسے ایک گھونسہ رسید کر دیا حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اس واقعہ کا گواہ طلب کیا گواہ نے اس واقعہ کی تائید کی۔ حضرت علیؓ نے گاہک کو زمین پر بٹھا دیا اور کپڑے والے کو قصاص لینے کا حکم دیا۔ اس نے کہا: "امیر المومنین میں نے اسے معاف کیا"۔ امیر المومنین نے کہا: "تو نے محض حق وصول کرنے میں احتیاط کا پہلو اختیار کیا ہے۔" اس کے بعد حضرت علیؓ نے خود آگے بڑھ کر کپڑے والے کو سات درّے مارے اور فرمایا: "ھذا حق السلطان" یہ ریاست کا حق تھا (طبری جلد ۶ ص [illegible])

اگر ستم رسیدہ بطور خود مجرم کا فعل معاف کر دے یا تعزیر کا نفاذ کسی ایسے مقدمے میں ہو رہا ہو جو حق شرعی کے تحت قائم کیا گیا ہو تو قاضی کو اگر یہ یقین ہو جائے کہ ارتکاب جرم کرنے والا قبل از وقت راہ راست پر آ چکا ہے اور قاضی کا یہ خیال بھی ہو کہ درگزر کر دینا اس کے لیے مزید باعث اصلاح ہوگا تو اس استثنائی صورت میں وہ مجرم کو معافی دے سکتا ہے۔ اس ضمن میں یہ واضح کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ شریعت کا ارباب عدل و قضا کو یہ حق دے دینا کہ وہ مقدمات تعزیر میں (جس کی صورت اوپر گذر چکی ہے) سزا دیئے بغیر مجرم کو معاف کر دینے کے مجاز ہیں۔ حق جمہور میں دراندازی کے مترادف نہیں ہے۔ کیوں کہ جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں ارباب عدل و قضا کو یہ اختیارات بلا شرط اور علی الاطلاق حاصل نہیں ہیں بلکہ صرف مصالح خصوصی کے پیش نظر ان کا استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اس کے برعکس جب ہم جدید فوجداری اور تعزیری قوانین اور تصورات قانون کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ جدید

قوانین و دساتیر جو ہمارے ملکوں میں رائج ہیں یا دیگر ترقی یافتہ ممالک میں نافذ ہیں، صدر ریاست کو یہ حق دیتے ہیں کہ وہ قتل اور ڈکیتی کے بڑے سے بڑے جرائم میں مجرموں ہی کو معافی دے سکتا ہے

صدر ریاست کا یہ حق عفو

عدالت عالیہ کے فیصلے پر بھی بالاتری رکھتا ہے اور وہ جب بھی کسی فیصلے میں "مصلحت" دیکھتا ہے اسے بلا تامل استعمال کرنے کا مجاز ہے۔ اور اس سب پر مستزاد یہ ہے کہ اس عفو و درگذر کو حق جمہور میں دست درازی کے مترادف نہیں گردانا جاتا مذکورہ بالا بیان سے یہ واضح ہو گیا ہے کہ اسلام میں تعزیری قانون عام ملکی تعزیرات سے علیحدہ کوئی چیز نہیں ہیں بلکہ یہ انہیں کے تحت آتے ہیں تعزیری قوانین میں تغیر پذیری کی خصوصیات موجود ہیں اور وہ زمان و مکان کی قیود میں محصور نہیں ہیں، بلکہ ان میں یہ صلاحیت بدرجہ اتم موجود ہے کہ وہ عصری تقاضوں کے مطابق نوعیت و مقدار کے ہر سانچے میں ڈھل سکتے ہیں۔ انہی خصائص کی وجہ سے ارباب فقہ و قانون نے تعزیرات کو "مصلحت شرعی" کے دائرے میں شمار کیا ہے مصلحت شرعی ان کے نزدیک "حکومت اسلامی کا وہ عمل ہے جو اس نے مصلحت وقت اور مفادِ عامہ کے تحت کیا ہو اور خواہ اس فعل کے جواز میں کوئی مخصوص شرعی دلیل نہ وارد ہوئی ہو۔" اس تعریف کی رو سے مصلحت شرعی دراصل مصالح مرسلہ یا استصلاح الحال ہی کی ایک قسم ہے بلکہ فقہا نے یہاں تک فرما دیا ہے کہ: کتاب قانون کا باب تعزیر ہی فی الحقیقت شرعی مصلحت کے احکام کا نگران اور انہیں کامیاب و نتیجہ خیز بنانے کا کفیل ہے۔

تعزیری قوانین کی تدوین ہو سکتی ہے

اس مقام پر قانون کے طالب علم کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ اگر شریعت نے تعزیر کی تعیین نوعیت و مقدار کو حکام و قضاۃ کی رائے پر چھوڑ دیا ہے تو کیا یہ تفویضی اختیارات مختلف النوع جرائم کے لیے مختلف سزائیں مقرر کرنے اور انہیں قانونی شکل میں مدون کرنے میں حائل نہیں ہوتے اور اس کی نفی نہیں کرتے جیسا کہ موجودہ دور میں قانون عقوبات (Penal Code) میں یہ صورت اختیار کی جاتی ہے کہ وقتی و ملکی داعیات کے تحت مختلف سزاؤں کا مجموعہ احکام وضع کیا جاتا ہے اور انہیں عدلیہ کے ذریعہ نافذ کیا

جاتا ہے۔ اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ یہ قانون سازی اور سزاؤں کے احکام کی تدوین کا عمل خود اس بات کی دلیل ہے کہ شریعت نے یہ معاملہ ارباب امر کو تفویض کر رکھا ہے۔ اس لیے یہ قانون سازی اور حد بندی آزادیٔ رائے کو ختم نہیں کرتی بلکہ آزادیٔ رائے کا ثبوت فراہم کر رہی ہے۔ اس وقت ہمارے ملک میں فوجداری قوانین کی بہت بڑی تعداد اسلامی نقطۂ نظر سے جائز تعزیرات کے حدود میں داخل ہے بجز اس کے کہ حدود کے نفاذ میں بے اعتنائی برتی جاتی ہے یا قصاص کے مقدمات میں بعض صورتوں میں شریعت سے ہٹ کر قانون سازی کی گئی ہے اسی طرح موجودہ قانون ساز ادارے فوجداری قوانین کی تدوین کے ضمن میں کسی جرم کی سزا کے لیے اس کی صرف ابتدائی اور آخری حدود کی تصریح کرتے ہیں اور باقی تمام جزئیات اور درمیانی مقداریں ارباب عدل و قضا پر چھوڑ دیتے ہیں یہ بات بھی اس امر کا واضح ثبوت ہے کہ مقننہ نے ارباب عدل و قضا پر اعتماد کیا ہے اور ہر جرم کی موزوں سزا کی مقدار انہی کو تفویض کر دی گئی ہے شریعت اسلامی نے ان تفویضی اختیارات کو بنیاد بنا کر سزاؤں کی تحدید کو ہر زمانے کے صاحب امر اداروں پر چھوڑ دیا ہے تاکہ وہ زمان و مکان کے مطابق ان میں تصرف کرتے رہیں۔ فوجداری اور تعزیراتی قانون سازی کے وقت ارباب امر کا سزاؤں کی تعیین و تحدید کر دینا یہ معنی رکھتا ہے کہ انھوں نے اپنے قانونی اختیارات (Legal Authority) کو روبعمل لاتے ہوئے گویا ان سزاؤں کو بالقوۃ نافذ کر دیا ہے۔ اگرچہ یہ نفاذ سزا وقوع جرم سے قبل ہوا ہے لیکن اس کا فائدہ یہ ہے کہ مجرم اقدام جرم سے قبل ہی اپنی سزا کی نوعیت اور مقدار سے آگاہ رہے گا۔ اب یہ بدیہی امر ہے کہ قبل از وقوع جرم سزا کا متعین کر دینا بھی انہی اختیارات کے اندر ہے جو تعیین سزا کے باب میں شریعت نے ارباب امر کو ہر وقتی سونپ رکھے ہیں۔

تعزیر بذریعہ اصلاح ہے

خاتمۂ بحث پر ہم بیروت کے مشہور محقق ڈاکٹر صبحی محمصانی ایڈوکیٹ کی کتاب "النظریۃ العامۃ للموجبات والعقود" کا ایک اقتباس نقل کرتے ہیں جو ڈاکٹر موصوف نے اصول تعزیر کی بحث میں ایک نوٹ کی صورت میں لکھا ہے۔ ڈاکٹر موصوف لکھتے ہیں:۔

"آپ نے اس سے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ شریعت اسلامی میں تعزیر ایک ایسا لچکدار وسیلۂ عدل ہے جو صاحب امر کے میدانِ عمل کو وسیع کرتا ہے اور اسے یہ مواقع فراہم کرتا ہے کہ وہ عمومی مصلحت کے تحت فساد انگیز عنصر کی اصلاح کرسکے۔ من جملہ دوسرے دلائل کے یہ بھی اس امر کی دلیل ہے کہ شریعت اسلامی جمود اور ٹھہراؤ کے اس اتہام سے بری ہے جو بعض لوگ اس پر دیدہ دلیری سے لگاتے ہیں، بلکہ یہ عصری مصالح کے مطابق ایک تغیر پذیر اور وقتی ضروریات کو بدرجۂ کمال بر لانے والی شریعت ہے اسی طرح منجملہ دوسرے وسائل کے تعزیر بھی ایک ایسا وسیلہ ہے جو قاضی کو فوجداری احکام کی تنفیذ میں ہر واقعہ کے مطابق اور ہر مجرم کے حسب حال پوری آزادی سے بہرہ مند کرتا ہے۔ تاکہ وہ سزا کی اصل غرض و غایت تک پہنچ سکے۔ اور سزا کی غرض و غایت یہ ہے کہ مجرم خود بھی اپنے جرم سے باز آجاتے اور اس کے ہم جنس اس کی تقلید سے دامن کش ہو جاتیں۔"

انصاف کا اسلامی تصور

ترکی کے مشہور سلطان مراد نے ایک مشہور معمار کے دونوں ہاتھ اس جرم میں کٹوا دیئے کہ وہ مسجد کی خوبصورتی و رعنائی میں کوئی اضافہ نہیں کر سکا۔ اس نے قومی سرمایہ اور قیمتی وقت دونوں ضائع کیے ہیں۔ معمار نے قاضی کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ قاضی نے سلطان کو عدالت میں طلب کر لیا۔ اس کے شاہانہ وقار اور عظمت کو بالائے طاق رکھتے ہوتے قاضی نے ایسے زوردار الفاظ میں باز پرس کی کہ سلطان وقت کانپ اٹھا۔ اس نے ڈبڈبائی آنکھوں کے ساتھ دونوں ہاتھ آستینوں سے نکالے اور بولا "میرے دونوں ہاتھ حاضر ہیں آپ انہیں قلم کرا دیں" معمار جو یہ سب کچھ آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ قاضی کی انصاف پسندی دیکھ کر چلا اٹھا "میں خدا اور مصطفےٰ کے لیے معاف کرتا ہوں۔ چنانچہ سلطان نے نہ صرف بھرے دربار میں معافی مانگی بلکہ معقول معاوضہ دیکر معمار کو خوش کیا۔ یہ ہے اسلامی مساوات جو ایک بادشاہ کو ایک معمار کے سامنے جھکنے پر مجبور دیتی ہے۔

درسلہ: انتخاب طاہر۔ رامپور

ماہر القادری

پلا ساقیا! بادۂ تند و تیز
عطا کر مرے دل کو عزم ستیز

عطا کر مجھے بادۂ آتشیں
بھڑکنے لگے اور سوزِ یقیں

نظر دی ہے ذوقِ نظر بخش دے
مجاہد کا قلب و نظر بخش دے

امیری رہے اور نہ شاہی رہے
نہ یہ عظمتِ خانقاہی رہے

جہاں میں مساوات کا دور ہو
زمانہ کی آب و ہوا اور ہو

غلامی کے جنجال سے چھوٹ جائیں
بنائی ہوئی سب حدیں ٹوٹ جائیں

زمانہ کی ہر مشکل آسان ہو
خدا کی حکومت کا اعلان ہو

ساقی نامہ

اسلام صرف مسلمانوں کے لیے رحمت نہیں ہے۔ بلکہ تاریخ کے ہر دور میں یہ کس طرح غیر مسلموں کا محافظ بنا رہا ہے اس کا اندازہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس تاریخی فرمان سے ہو سکتا ہے جو حضور اکرم نے سینٹ کیتھرین کی خانقاہ واقع کوہ سینا کے راہبوں کو عطا فرمایا تھا۔

یہ فرمان صرف کیتھرین کی خانقاہ کے راہبوں کے لیے مخصوص نہ تھا۔ بلکہ یہ تمام دنیا کے عیسائیوں کے لیے تھا۔ چنانچہ اس فرمان کے متعلق عام رائے یہ ہے کہ دنیا میں ایسی رواداری اور کشادہ دلی کی مثال ناپید ہے اور تاریخ ایسی کوئی دوسری مثال پیش کرنے سے قاصر ہے کہ کسی فاتح قوم نے غیر مذاہب والوں کے ساتھ اس قدر رواداری اختیار کی ہو۔ اس فرمان کے ذریعہ پیغمبر اسلام نے عیسائیوں کو اس طرح کے حقوق اور مراعات عطا فرمائی تھیں جو انہیں اپنے ہم مذہب عیسائی بادشاہوں کے دور حکومت میں بھی حاصل نہیں تھیں۔ اس کے ساتھ ہی آپ نے یہ اعلان کیا کہ "اگر کوئی مسلمان اس فرمان کی دفع کو پامال کرے گا تو اس کو خدا کے حکم کا ٹھکرانے والا سمجھا جائے گا۔"

اس فرمان کے ذریعہ رسول اللہ صلعم نے مسلمانوں کو ہدایت فرمائی تھی کہ وہ عیسائیوں کی پوری پوری حفاظت کریں۔ اگر ان کے گرجوں خانقاہوں اور راہبوں کے گھر پر کوئی حملہ کرے تو اپنی جانوں کو خطرے میں ڈال کر ان کی حفاظت کی جائے۔ اور انہیں ہر طرح کے نقصان سے بچایا جائے۔ اس فرمان کی رو سے کوئی بشپ اپنے گرجے

سے نکالا نہیں جا سکتا تھا۔ اس کے علاوہ مسلمان کسی عیسائی کو مسجدوں میں آنے سے نہیں روک سکتے تھے اور نہ مسلمانوں کو اس بات کی اجازت تھی کہ وہ گرجوں کو توڑ کر وہاں مسجد تعمیر کریں یا گرجوں کو رہائش گاہوں میں تبدیل کر سکیں اور عیسائی عورتیں جو مسلمانوں کے نکاح میں تھیں انہیں اختیار تھا کہ وہ اپنے آبائی مذہب پر قائم رہیں اور انہیں تبدیلی مذہب کے لیے کسی طرح مجبور نہ کیا جائے۔ اگر عیسائیوں کو اپنے گرجوں یا خانقاہوں کی تعمیر یا مرمت یا کسی دوسری رسومات مذہبی کے لیے امداد کی ضرورت ہو تو مسلمانوں کو ان کی امداد کرنی چاہیے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ پیغمبر اسلام نے یہ اعلان فرما دیا تھا کہ:

"یاد رکھو اگر ہماری امت میں سے کسی نے کسی ذمی (غیر مسلم) کے ساتھ بدسلوکی کی یا اس سے ایسا کام لینا چاہا جو اس کی طاقت کے باہر ہو یا اس کی اجازت کے بغیر اس کی کسی چیز پر قبضہ کیا یا کسی ذمی کو نفرت و حقارت کی نظر سے دیکھا تو میں قیامت کے دن خداوند کے حضور میں اس کا دشمن ہوں گا۔"

یہ ہیں وہ بنیادی اصول اور احکام جو کہ ذمیوں (غیر مسلموں) سے متعلق مسلمانان عالم کی ہدایت کے لیے پیغمبر اسلام نے قائم کیے ہیں۔ ذرا غور کیجیے کہ اس سے زیادہ سخت الفاظ اور اس سے بڑھ کر غیر مسلموں کے حق میں اور کیا ہدایت ہو سکتی ہے۔ ذمی خواہ عیسائی، یہودی، آتش پرست یا ہندو جو بھی ہوں ان کے ساتھ مسلمان ان ہی احکامات کی روشنی میں بہتر سے بہتر سلوک کرنے پر مجبور ہیں کیوں کہ یہ ان کے پیغمبر کا حکم ہے۔

بعض لوگ کہہ سکتے ہیں کہ یہ فرمان صرف عیسائیوں کے لیے تھا جو کہ اہل کتاب ہیں یہ غیر عیسائیوں پر منطبق نہیں ہو سکتا۔ لیکن یہ صحیح نہیں ہے کیوں کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ دوم حضرت عمر فاروق رضی نے ایران کے آتش پرستوں کے ساتھ بالکل وہی سلوک کیا تھا جو اہل کتاب کے ساتھ کیا جاتا تھا۔

حضرت عمر فاروق رض کے زمانہ میں ایران کی فتح کے بعد یہ سوال اٹھا تھا کہ ایرانی اہل کتاب ہیں یا نہیں چنانچہ اس مسئلہ پر صحابہ کرام میں کافی بحث و مباحثہ کے بعد یہ طے پایا کہ چونکہ ایرانی اپنے آپ کو اہل کتاب کہتے ہیں، اس لیے انہیں اہل کتاب مان لیا جائے اور یہی اصول علماء اسلام نے ہندوؤں

کے بارے میں بھی اختیار کیا تھا۔ چنانچہ ہندوستان کے مسلم فاتحوں نے عملی طور پر ہندوؤں کو ذمی قرار دے دیا تھا۔ اور ان کے ساتھ وہی تمام مراعات روا رکھی تھیں جن کا ذکر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان میں موجود ہے۔ اس تاریخی فرمان کا یہ نتیجہ ہے کہ مسلمان تاریخ کے تقریباً ہر دور میں غیر مسلموں کے ساتھ انتہائی رواداری کا سلوک کرتے رہے ہیں۔

دمشق خلفاء بنی امیہ کا دارالخلافہ تھا۔ دمشق کی جامع مسجد کے قریب ایک چھوٹا سا گرجا تھا امیر معاویہ نے مسجد کی توسیع کرنا چاہی اور انھوں نے عیسائیوں سے گذارش کی کہ وہ بڑی سے بڑی رقم لے کر یہ گرجا مسلمانوں کے حوالے کر دیں لیکن عیسائیوں نے گرجا دینے سے صاف انکار کر دیا۔ اور امیر معاویہ کے بعد تقریباً ہر خلیفہ اس گرجا کو رضامندی سے حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ لیکن کسی کو بھی اس سلسلے میں کامیابی نہ ہوئی۔ سب سے آخر میں خلیفہ ولید بن عبدالملک کے عہد میں کوشش کی گئی تو عیسائی آپے سے باہر ہو گئے اور انھوں نے سر دربار ولید کو برا بھلا کہا۔ ولید بھی طیش میں آگیا اور اس نے زبردستی گرجا پر قبضہ کر لیا۔ لیکن کچھ دنوں کے بعد جب حضرت عمر بن عبدالعزیز خلیفہ ہوئے تو انھوں نے عیسائیوں کی شکایت پر گرجا کو پھر عیسائیوں کے حوالے کر دیا اور ان عیسائیوں سے اس بات کی معافی چاہی کہ اسلام کی صریحی ہدایت کے باوجود انہیں خلیفہ ولید کی ناانصافی کا شکار ہونا پڑا۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ مسلم حکمرانوں نے نہ صرف پرانے گرجوں اور مندروں کی حفاظت کی ہے بلکہ اپنے عہد میں بے شمار گرجوں اور مندروں کی تعمیر کی اجازت دی ہے اور ان سے متعلق جتنے بھی اوقاف تھے ان پر ہاتھ نہیں ڈالا، بلکہ ان کی ہمیشہ حفاظت کی ہے۔ بغداد اگرچہ کلیتاً مسلمانوں کا شہر تھا۔ لیکن اس شہر میں ایک بڑی تعداد میں آتش پرستوں کے آتش کدے عیسائیوں کے گرجے اور یہودیوں کے معابد بھی موجود تھے قاہرہ میں سیکڑوں گرجے خلفائے راشدین کے عہد میں تعمیر ہوئے جن کی تاریخ اور نشانات آج بھی موجود ہیں۔ ہندوستان کے مسلم دور حکومت میں بے شمار مندر تعمیر ہوئے جن میں سے ایک بڑی تعداد آج بھی موجود ہے۔ اسلامی فقہ کا ایک مشہور قانون ہے جس کی رو سے اگر کوئی غیر مسلم

گرجا کی تعمیر کی وصیت کر جائے تو اسلامی حکومت کے ذمہ داران کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنی نگرانی میں گرجا کی تعمیر کر کے غیر مسلم کی وصیت کو پورا کر دیں۔ لیکن اس کے برعکس اگر کوئی غیر مسلم مسجد کی تعمیر کے لیے وصیت کر جائے تو مسجد کا تعمیر کرایا جانا اسلامی حکومت کا فرض نہیں ہے۔ گویا اسلام نے صرف زندگی ہی میں نہیں بلکہ مرنے کے بعد بھی غیر مسلموں کے مذہبی احساسات کے احترام کی ہدایت دی ہے امام ابوحنیفہ کا قول ہے کہ مسلمانوں کو غیر مسلموں کی مذہبی رسوم میں دخل اندازی کا کوئی حق نہیں ہے۔

پھر اگر کوئی مسلم اپنی وصیت کو عملی جامہ پہنانے کا کام کسی (ذمی) غیر مسلم کے سپرد کر جائے تو یہ اسلامی فقہ کی نظر سے جائز ہے۔ چنانچہ مسلم عہد حکومت میں بہت سے غیر مسلموں کو اسلامی مدرسوں اور اسلامی اداروں کا نگراں مقرر کیا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ مسلم اوقاف کی تولیت بھی بعض اوقات ذمیوں کے سپرد کی گئی ہے۔ اور وہ متولی کے فرائض بحسن وخوبی انجام دیتے رہتے ہیں۔

خلفائے راشدین کے دور خلافت سے لے کر ہندوستان کی مغلیہ حکومت تک تقریباً ہر زمانے میں مسلم حکمرانوں نے ذمیوں یعنی غیر مسلموں کے حقوق کا پورا پورا خیال رکھا ہے۔ اگر کسی مسلم حکمران نے غیر مسلموں کے ساتھ رواداری نہیں برتی جیسا کہ سلطان سکندر لودی نے ایک بار تھانیسر میں ہندوؤں کو اشنان کے حق سے روکنا چاہا۔ تو اس زمانے کے مشہور عالم میاں عبداللہ جودھنی نے بادشاہ کی مخالفت کرتے ہوئے کہہ دیا تھا کہ "شریعت اسلامیہ کی رو سے کسی حکمران کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ غیر مسلموں کو ان کے مذہبی مراسم کی ادائیگی سے روک سکے یا مندروں کو توڑنے کا ارادہ کرے

اس پر بادشاہ نے کہا تھا۔

"آپ عالم ہو کر مشرکانہ رسموں کی حمایت کرتے ہیں۔"

اس پر میاں عبداللہ جودھنی نے جواب دیا تھا کہ،

"میں نے شریعت اسلامیہ کا صحیح صحیح قانون آپ کے سامنے رکھ کر اپنا فرض ادا کر دیا ہے۔ اب آپ کو اختیار ہے کہ اس پر عمل کریں یا اسلام کے قانون کو ٹھکرا دیں۔"

اس جواب پر سکندر لودی بے حد شرمندہ

جوا اور اسی وقت اس نے ہندوؤں کے خلاف اپنا حکم واپس لے لیا۔

تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ طلوعِ اسلام سے لے کر آخر تک ہمیشہ ہی شاہانِ اسلام نے اپنی حکومتوں میں غیر مسلموں کے ساتھ انتہائی رواداری کا سلوک کیا اور ان کا ایسا کرنا کسی سیاست پر موقوف نہیں تھا۔ بلکہ یہ اسلامی احکامات کا نتیجہ تھا۔ خود رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم غیر مسلموں پر بے حد مہربان تھے اس کے بعد خلفائے راشدین اور سلاطین اسلام کا رویہ بھی ہمیشہ غیر مسلموں کے ساتھ ہمدردانہ رہا ہے۔

اور تمہیں خوش ہونا چاہیئے کہ ....

قاضی شریح بن حارث کے ایک اور چند اشخاص کے درمیان ایک معاملے میں کچھ جھگڑا تھا۔ لڑکے نے اپنے والد کو واقعات بتاتے ہوئے پوچھا۔ اباجان! یہ واقعات مقدمہ ہیں۔ اگر میرا حق نکلتا ہو اور مقدمہ میں کامیابی کی امید ہو تو میں دعویٰ کروں ورنہ خاموش رہوں۔

"تم دعویٰ کر دو۔" باپ نے مقدمے کی نوعیت پر غور کرنے کے بعد جواب دیا۔ لڑکے نے دعویٰ دائر کر دیا اور مقدمہ قاضی صاحب کی عدالت میں پیش ہوا۔ اپنے لڑکے اور فریق ثانی کے بیانات سننے کے بعد باپ نے فیصلہ دیا اور وہ اپنے لڑکے کے خلاف تھا۔ عدالت برخاست کرکے جب گھر واپس لوٹے تو بیٹے نے کہا۔

اباجان! آپ نے مجھ پر بڑا ظلم کیا۔ میں نے دعویٰ کرنے سے پہلے آپ سے مشورہ اسی غرض سے کیا تھا کہ اگر کامیابی کی امید ہو تو عدالت کا دروازہ کھٹکھٹاؤں ورنہ خاموش رہوں۔ آپ نے دعویٰ دائر کرنے کا مشورہ دیا اور پھر فیصلہ میرے خلاف کر دیا۔ اور اس طرح مجھے خواہ مخواہ ذلیل کیا۔"

"مردم شناس اور عدل پرور باپ نے جواب دیا: جانِ پدر، تم مجھے روئے زمین پر ان جیسے تمام آدمیوں سے عزیز ہو لیکن اللہ تعالیٰ تم سے بھی زیادہ محبوب ہے۔ جب تم نے مجھ سے مشورہ کیا تھا اور صورتِ مقدمہ پیش کی تھی تو میں اسی وقت سمجھ گیا تھا کہ تمہارے مخالف حق پر ہیں۔ اگر میں تمہیں بتا دیتا کہ حق ان کا نکلتا ہے تو تم ان سے صلح کر لیتے اور ان کا حق ضائع ہو جاتا۔ میں نے حق کو حقدار تک پہنچانے کے لیے تم کو مشورہ دیا اور تمہیں خوش ہونا چاہیئے کہ تم ناحق مال پر قابض ہونے سے بچ گئے۔

درحقیقت ہم اسلام کے نادیدہ عاشق ہیں ہمیں اسلام کے نام سے محبت ہے اور اس کے لانے والے سے دیوانہ وار عشق ہے۔ لیکن اسلام کو زندگی کا جو نقشہ مطلوب ہے اس سے ہم قطعی ناآشنا ہیں۔ اسلامی نظام کے نفاذ کے اعلان کے بعد سب سے پہلی ضرورت یہ ہے کہ عام ذہن کو اسلام کے نقشۂ زندگی سے متعارف کرایا جائے ورنہ اس کا اندیشہ ہے کہ اسلامی زندگی سے غیر متعارف ذہن اسلام کو صرف تعزیرات کا دین سمجھنے لگیں گے اور زندگی کے صفات کا دین نہیں سمجھیں گے۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے اس حقیقت کو واضح کرنے کی ضرورت ہے کہ اسلام صرف تبلیغ دین کا نام نہیں بلکہ اقامتِ دین کا نام بھی ہے۔ افسوس کہ آج عام آدمی سرمایہ، استحصال، محنت اور سوشلزم کی اصطلاحات سے واقف ہو گیا ہے۔ لیکن اقامتِ دین کی قرآنی اصطلاح سے ناواقف ہے۔ اقامتِ دین کا سادہ الفاظ میں مفہوم یہ ہے کہ اسلام انفرادی اور اجتماعی زندگی کا ایک تصور رکھتا ہے۔ اسلام کے پیروؤں کی زندگی میں اس تصور کو قائم و غالب کرنے کا نام اقامتِ دین ہے۔ چونکہ ہم ایک مدت سے اسلام کی اجتماعی زندگی کا کوئی نقشہ نہیں دیکھ سکے ہیں۔ اس لیے اکثر ذہنوں میں اسلام کے بارے میں یہ تصور ابھی تک موجود ہے کہ اسلام ایک نجی تبلیغی مذہب ہے اور اس کے دینداروں کو اپنی تبلیغ میں مشغول رہنا چاہیے۔ جب اسلام کے نفاذ کا ذکر چھڑتا ہے تو بعض کہنے والے کہہ دیتے

ہیں۔ ٹھیک ہے۔ کون اس سے روکتا ہے؟ اس
سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک عام مسلمان کے ذہن
میں اسلام کا بس ویسا ہی تبلیغی تصور ہے جیسا عام
مذہب کے بارے میں ہوتا ہے۔ اور یہی سبب
تھا کہ پیپلز پارٹی نے اپنے چار نعروں میں ایک
نعرہ "اسلام ہمارا دین ہے" رکھا تھا اور ووٹروں
کی ایک موثر تعداد نے پیپلز پارٹی کو ووٹ دیکر
مقتدر بنا دیا تھا۔ ان کا ووٹ دینا بجائے
خود شہادت ہے کہ عام ذہن میں اسلام بحیثیت
نظام نہیں بلکہ اسلام بحیثیت ایک نیکی و عبادت
کی تبلیغ کرنے والے مذہب کے موجود ہے۔
حالانکہ قرآن کا بغور مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا
ہے کہ داعیانِ حق نے دین کے قیام کے لیے اسی
طرح کی مساعی کی تھیں جس طرح آج انسانی حقوق
کی بحالی اور جبر سے گلو خلاصی کے لیے افریقہ
اور مشرق بعید میں کی جا رہی ہیں۔ عصرِ حاضر میں
ایران کی جدوجہد حریت ایک مثال ہے۔ اگر
دین کا معاملہ صرف تبلیغ کا ہوتا تو اہلِ دین کو کسی
زمانے میں بھی مزاحمت کا سامنا نہ ہوتا۔ قرآن
میں فقط چند انبیا کا ذکر ملتا ہے کہ جن کو اقامتِ
دین کے لیے اقتدار کی سہولت میسر تھی۔ اور
انھوں نے اقتدار کے ذریعہ دین کو قائم کیا تھا۔
ان انبیا کا تعلق بنی اسرائیل سے تھا۔ مثلاً حضرت
داؤد علیہ السلام، حضرت سلیمان علیہ السلام حضرت
یوسف علیہ السلام حضرت طالوت علیہ السلام،
یہ وہ انبیا تھے جن کو اقتدار حاصل تھا اور انھوں
نے اقتدار کو اپنے دینی نظریے کے نفاذ کے لیے
اسی لیے استعمال کیا جس طرح آج برطانیہ اور
امریکہ میں جمہوریت اور روس اور چین میں
سوشلزم کے لیے اقتدار استعمال ہوتا ہے۔
سوشلزم میں جبر و اکراہ کا پہلو ملتا ہے لیکن اللہ کے
دین کے نظام میں یہ تلخ اور ناگوار پہلو نہیں ہوتا۔
یا پھر اقتدار برائے دین کی نعمت نبی آخر الزماں
صلی اللہ علیہ وسلم کے حصے میں آئی۔

حقیقت یہ ہے کہ مطالعہ سیرت رسول صلی
اللہ علیہ وسلم کے بعد ہی واضح ہوتا ہے کہ دین کیا
ہے اور اقامت دین محض تبلیغ دین نہیں ہے
نبی صلی اللہ علیہ وسلم مکہ کے بعد مدینہ تشریف لے
گئے تو مقصد کنول کے پھول کی طرح تدریج کھلنے
لگا۔ جس کے لیے مکہ میں تیرہ برس تک پرمصائب
زندگی گزاری گئی تھی پھر مدینہ میں بھی سکون نہیں
تھا بلکہ ایک طویل مدت تک مسلسل جدوجہد جاری رہی۔

اگر دین اقامت دین کا نام نہ ہوتا تو ہجرت نہ کرنی پڑتی اور بدر، اُحد، اور حنین کے مرحلے ہرگز پیش نہ آتے۔ ذرا دوسرے مذاہب کی تاریخ اُٹھا کر دیکھیے ان میں سے کس کو ان مقامات سے دوچار ہونا پڑا ہے جن سے اہل حق مدینہ میں دوچار ہونے تھے، مدینہ کی اسلامی تاریخ ہی سے اس بات کی سمجھ آتی ہے کہ حضرت ابراہیم خلیل اللہؑ کو نار نمرود میں کیوں پھینکا گیا تھا۔ باطل کی ساری قوت و جبروت کے باوجود حضرت ابراہیمؑ انہیں مسلسل للکارتے رہے کہ اب ہمارے اور تمہارے درمیان لڑائی ٹھن گئی ہے۔ اگر یہ محض تبلیغ کا معاملہ ہوتا تو اس الٹی میٹم کی ضرورت نہ ہوتی۔ قرآن حضرت ابراہیمؑ کے اس الٹی میٹم کو بیان کرتے ہوئے کہتا ہے :۔

تم لوگوں کے لیے ابراہیمؑ اور اس کے ساتھیوں میں ایک اچھا نمونہ ہے کہ انھوں نے اپنی قوم سے صاف کہہ دیا کہ ہم تم سے اور تمہارے معبودوں سے جن کو تم خدا کو چھوڑ کر پوجتے ہو قطعی بیزار ہیں۔ ہم تمہارا انکار کرتے ہیں اور ہمارے اور تمہارے درمیان ہمیشہ کے لیے عداوت ہوگئی اور بیر پڑ گیا جب تک تم اللہ واحد پر ایمان نہ لاؤ۔ (سورہ ممتحنہ)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کشمکش اور جدوجہد کا قرآن بڑی تفصیل کے ساتھ ذکر کرتا ہے۔ بنی اسرائیل کے لڑکوں کو ذبح اور لڑکیوں کو زندہ کیوں چھوڑا جاتا تھا۔ قرآن خود بیان کرتا ہے :۔

جب فرعون (ہامان اور قارون) کے سامنے حق آیا تو انھوں نے کہا۔ جو لوگ ایمان لاکر ان (یعنی اہل حق) کے ساتھ شامل ہوتے ہیں۔ ان سب کے لڑکوں کو قتل کر دو اور لڑکیوں کو جیتا چھوڑ دو۔ (سورۂ مومن)

بنی اسرائیل کے لڑکوں کو قتل کا حکم جاری کرنے میں قارون کا ہاتھ بھی تھا جو قرآن کے بیان کے مطابق بنی اسرائیل سے تعلق رکھتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ تمام بنی اسرائیل کے لڑکے قتل نہیں کیے جاتے تھے۔ صرف اہل ایمان کے کیے جاتے تھے۔ اگر دین صرف تبلیغ کا معاملہ ہوتا تو پھر نوبت کو یہاں تک نہیں پہنچنا چاہیے تھا۔ ظاہر ہے کہ کفر کے ان سرخیلوں نے دین کو اپنے لیے اور اپنے

طرز زندگی کے لیے ایک خطرہ اور چیلنج سمجھا ہوگا۔ اسی لیے انھوں نے اہل دین کی طاقت توڑنے کے لیے اس حکم کا اجراء کیا۔ یہ فرعون ہی کا بیان ہے کہ

چھوڑو مجھے، میں اس موسیٰ کو قتل کرتا
ہوں اور وہ اپنے رب کو (مدد کے
لیے) پکارے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ
یہ (موسیٰ) تمہارا دین بدل ڈالے گا
یا ملک میں فساد برپا کردے گا۔

(سورۃ مومن)

قریب یہی صورت عرب کو جاہل سوسائٹی میں حق کی دعوت بلند کرنے کے بعد پیدا ہوگئی تھی۔ اس لیے پاکستان کے آج کے مسلمانوں پر نفاذ قوانین اسلام کے بعد یہ بات بھی اچھی طرح سے واضح کر دینے کی ضرورت ہے کہ بارہ ربیع الاول کا اعلان محض چند اسلامی حدود کے نفاذ کا اعلان نہیں ہے بلکہ ایک نئے دور زندگی کے آغاز کا اعلان ہے۔ اسلام کے یہ قوانین محض قوانین نہیں ہیں بلکہ ایک انوکھے اور مختلف طرز زندگی اور نظام زندگی اور نظام حیات کا نوٹس ہیں۔ جس کے بعد یہ توقع کرنا کہ اب اسلامی طرز زندگی کے دشمن خاموش ہوکر بیٹھ رہیں گے۔ خام خیالی ہے۔

جس طرح مدینہ میں اسلامی ریاست کے قیام کے بعد سے اہل مدینہ کے لیے ایک خطرے اور خوف کی زندگی کا آغاز ہوگیا تھا۔ اسی طرح آج بھی یہ نہ سمجھا جائے کہ اسلامی نظام کے اعلان کے بعد سب خیریت ہی رہے گی۔ اندر سے فتنے اٹھیں گے اور باہر سے حملے ہوں گے۔ اعدا در جنین کے مرحلے مکی زندگی میں پیش نہیں آئے تھے مدنی زندگی میں آئے تھے۔ منافق مکے میں نہ تھے مدینے میں نہ تھے، مکی زندگی حزب اختلاف کی سی زندگی تھی۔ جس میں اور نوعیت کی ابتلاء و آزمائش کا سامنا ہوتا ہے۔ حزب اختلاف کی جنگ ایک ظالم و مظلوم کی جنگ ہوتی ہے جس میں تمام تر زور اور توانائی جارح اور ظالم ہی کی کی صرف ہوتی ہے۔ مظلوم کی طاقت و توانائی محفوظ رہتی ہے لیکن جب اقتدار کا مرحلہ آتا ہے تو اس کے ساتھ اور نوع کی ذمہ داریاں ہوتی ہیں تب نہ صرف اپنے اندرونی ڈسپلن (نظام) کو قائم رکھنا پڑتا ہے بلکہ خارجی حملوں کا مقابلہ کرنا بھی ہوتا ہے۔ پھر اپنے ہی دفاع کے لیے حملہ آور ہونے کی ضرورت بھی پیش آجاتی ہے۔ مکی زندگی میں تشویش اور بے خوابی تھی، لیکن مدنی زندگی میں

اور تم میں ایک جماعت ایسی ہونی چاہیئے جو لوگوں کو نیکی کی طرف بلائے اور اچھے کام کرنے کا حکم دے اور بُرے کاموں سے منع کرے اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔
(آل عمران : ۱۱)

تشویش بھی تھی اور بے خوابی بھی۔ مدنی زندگی کا جائزہ لیجیے ایک لمحہ بھی سکون نہیں ہے۔ پوری مدنی زندگی ہنگامی حالات کی عکاس ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ مدینے کے داخلی و خارجی دشمنوں کے خوف سے صحابہ ہتھیاروں سمیت سوتے تھے۔ راتوں کو باری باری پہرہ دیا جاتا تھا اور اس فرض کی ادائیگی میں خود سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم بھی حصہ لیتے تھے۔ پوری مدنی زندگی میں ہر سو دن بعد ایک جنگی معرکہ پیش آتا ہے۔ بدر اسی زندگی میں آیا، اُحد اسی دور میں آیا۔ پھر یہی عہد تھا جس میں تبوک اور حنین کے معرکے آئے۔ حملے صرف جسموں پر نہیں ہوتے، ناموس پر بھی ہوتے۔ واقعہ افک بھی اسی دور میں پیش آیا۔

غرض پوری مدنی زندگی ایک بیداری چوکسی اور ذمہ داری کی زندگی تھی۔ اگر اہلِ پاکستان نظامِ اسلامی کے نفاذ کے بعد ایک نئے نظام کی مدنی زندگی میں داخل ہو گئے ہیں تو پھر ناگزیر ہے کہ ان کو احد و حنین پیش آئیں۔ ان مرحلوں کے لیے قوم کو جگانا انتہائی ضروری ہے ورنہ خطرہ ہے کہ وہ اس نظام زندگی کی کما حقہ حفاظت نہ کر سکیں گے۔ ان کے لیے نئی ذمہ داریوں کا نیا شعور و احساس حاصل کرنا ناگزیر ہے۔ ایک وہ دور تھا جب پاکستان معرضِ وجود میں نہیں آیا تھا ایک دور یہ ہے جب پاکستان بن گیا ہے اور اس کے دفاع کے ہم خود ذمہ دار ہیں۔ ستمبر ۶۵ء اور دسمبر ۷۱ء کی جنگیں پاکستان بننے کے بعد پیش آئی تھیں اس سے پہلے نہیں۔ اسی طرح نظامِ اسلام کے اعلان کے بعد بھی کچھ معرکے پیش آ سکتے ہیں۔ جن کے لیے ہمیں تیار ہونا ہوگا۔ کوئی دوسرا آکر ہماری یہ جنگ نہیں لڑے گا۔ اگر پاکستان کی حقیقت کو ہم تسلیم کرتے ہیں تو پھر اسلامی نظام کی حقیقت بھی ہمیں تسلیم کرنا ہوگی اور اس کا دفاع بھی ہماری اسی طرح ذمہ داری ہے جس طرح پاکستان کا دفاع ہماری ذمہ داری ہے۔

(ہفتہ وار ایشیا کا ایک اداریہ)

کوثر ندوی

نوجوانوں سے خطاب

نوجوانو! دل کی قوت چاہیئے مستقل احساسِ ملت چاہیئے

نوجوانی ہو تمہاری کامیاب یاد رکھنا شیرِ یزداں کا شباب

قوم کی قوت تمہارے دم سے ہے قوم زندہ قوم کے رستم سے ہے

نوجوانو! تم بنو فخرِ وطن فخرِ دنیا، فخرِ دین، فخرِ زمن

روح کو اتنا بناؤ پاک صاف عرشِ اعظم کا کرے یہ بھی طواف

حیدرؓ و صدیقؓ کا انداز ہو اور بلالی روح کی پرواز ہو

حمزہؓ و فاروقؓ کا کردار ہو شبرؓ و شبیرؓ کا معیار ہو

رسمِ عریانی کو یکسر توڑ دو بے حیائی کی کلائی موڑ دو

زور پر ہے پر ہے مے فروشی کا رواج تم مٹا دو بادہ نوشی کا رواج

ہاں بنو علم و ہنر میں آفتاب

مفت میں ضائع نہ ہو عہدِ شباب

مولانا کا یہ مضمون پاکستان میں اسلامی نظام کے اعلان سے دو ماہ پہلے شائع ہوا تھا
تھا اس مضمون میں اشارے ملتے ہیں کہ نظامِ اسلامی کے نفاذ کے لیے
فطری تدریج کیا ہوگی۔ (مدیر)

اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے اُسے مختلف حصوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ صرف اسلامی قوانین کے نفاذ کا نام اسلامی نظام کا نفاذ نہیں ہے بلکہ اس کے لیے زندگی کی اُس پوری اسکیم کو نافذ کرنا ضروری ہے جو اسلام نے ہمیں دی ہے اور قانون بھی اس اسکیم کا ایک اہم حصہ ہے جو مجموعے سے الگ کر کے نافذ کر دیا جائے تو یہ اسلامی نظام کا نفاذ نہ ہوگا۔ اگر ہم زندگی کے پورے نظام کو اسی طرح جاہلیت کی راہ پر چلنے دیں جس طرح وہ چل رہا ہے اور صرف اسلامی قانون کو عدالتوں کے ذریعہ نافذ کر دیں تو اس کے وہ نتائج نہیں ہو سکتے جو اسلام کو مطلوب ہیں اس کی مثال کچھ ایسی ہے کہ چولہے میں آگ جل رہی ہو۔ ہنڈیا چولہے پر رکھی ہو اور ہم برف رکھ رکھ کر اسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کریں۔ ٹھنڈی تو وہ جب ہو جب آگ اس کے نیچے سے نکال دی جائے۔ معاشرے میں برائیوں کے اسباب جوں کے توں رہیں اور ہم صرف قانون

کے ذریعہ سے اصلاح کی کوشش کریں تو آخر
اصلاح کیسے ہو جائے گی؟

آپ ایک سہانی صبح یا کسی تابناک رات
کو اسلامی قانون کے نفاذ کا اعلان کر سکتے ہیں مگر
اس پر عمل درآمد کرنے والی مشینری تو وہی ہوگی
جو اب تک کفر کا قانون نافذ کرتی رہی ہے۔
اور لوگ بھی وہی ہوں گے جن کی عظیم اکثریت
کو مدتِ دراز کے غیر اسلامی اقتدار نے بگاڑ
رکھا ہے۔ صرف ایک اعلان سے تو آپ ان
کے سینے ایمان کے نور سے، ان کے ذہن
اسلام کے علم سے، ان کے عادات و خصائل اسلامی
اخلاق سے مزین نہیں کر سکتے۔

برصغیر ہند میں جب انگریز آئے تو یہاں
اسلامی تعلیم رائج تھی، مسلمانوں کی اپنی تہذیب
قائم تھی، ان کا اپنا تمدن موجود تھا، ان کی اپنی
روایات باقی تھیں ان کی اخلاقی اقدار محفوظ تھیں
اور ملک میں اسلامی قانون نافذ تھا۔ اب دیکھیے
انگریزی اقتدار نے اس صورت حال کو کس طرح
بدلا۔ اس نے صرف اتنا ہی نہیں کیا بلکہ ہمارے
قانون کو منسوخ کر کے اپنا قانون جاری کر دیا بلکہ
اس نے ہر طرف سے ہمارے نظام زندگی پر حملہ کیا
اور ہر پہلو سے ہمارا گھیراؤ کیا۔ اس نے ہمارے
نظام تعلیم کی جگہ اپنا نظام تعلیم رائج کیا اور اسی کو رزق
اور ترقی کا ذریعہ بنا دیا ہماری زبان پر اپنی زبان کو
غالب کر دیا۔ ہماری تہذیب اور ہمارے تمدن
کو حقیر بنا کر اپنی تہذیب اور اپنے تمدن کو عظمت
کے مقام پر فائز کیا۔ ہمیں پیٹ کی مار دے کر
ہماری گردن اقتدار کے آگے جھکائی اور ہمیں
ضمیر، ایمان، غیرت، غرض اپنا سب کچھ بیچ ڈالنے
کا خوگر بنایا۔ اپنے نظام معیشت کو ہم پر مسلط کیا
کسب حلال کے راستے تنگ اور حرام خوری کے
سارے راستے کھول دیے۔ اپنے سیاسی نظام
کو رائج کر کے ہمارے تصور حکومت کو اس طرح
فنا کیا کہ ہم یہ سوچنے کے قابل ہی نہ رہے کہ ہمارا
بھی کوئی سیاسی نظام ہے۔ قانون کی تبدیلی کے
ساتھ یہ تمام تغیرات جب برپا ہوتے تو انگریز کو
بھی یہ کہنے کی ضرورت پیش نہ آئی کہ اپنا دین بدلو،
اپنے افکار و نظریات بدلو، اپنی اخلاقی اقدار بدلو
اپنی تہذیب بدلو۔ یہ سب کچھ ہم خود ہی بدلتے
چلے گئے۔ ہمارے ایمان و اخلاق کی جڑیں غیر محسوس
طریقے سے کھوکھلی ہوتی چلی گئیں، ہمارے لیے
ہر حرام، حلال ہوتا چلا گیا اور حلال کی طرف ہماری

رغبت مفقود ہوتی چلی گئی۔ انگریز کے افکار و نظریات ہمارے ذہنوں پر مسلط ہو گئے۔ اس کی زبان اس کے لباس، اس کی تہذیب اس کے طریقہ زندگی کو ہم نے فخر کے ساتھ قبول کر لیا اور ہم میں وہ تمام فواحش وبا کی طرح پھیل گئے جو انگریزی تہذیب کی خصوصیات میں شامل تھے۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتے کہ ایک قوم بدلتی ہے تو کیسے بدلتی ہے۔

اب ذرا دیکھئے انگریز کے رخصت ہونے کے بعد آزادی کے پہلے لمحے سے لے کر آج تک ہم نے آخر ان چیزوں میں سے کسی چیز کو تبدیل کیا تبدیل کرنا تو درکنار ہم اسی راستے پر آگے ہی بڑھتے چلے گئے ہیں جس پر انگریز ہمیں ڈال گیا تھا۔ تعلیم وہی ہے، بلکہ پہلے سے بدتر نتائج دکھا رہی ہے اور ہماری درس گاہوں پر ایسے اساتذہ کی ایک پوری کھیپ مسلط ہے جو نئی نسلوں کو بے دین اور بدکردار بنانے پر تُلے ہوتے ہیں۔ اس خراب کو ہمارے ہاں مخلوط تعلیم کی روزافزوں ترویج دو آتشہ بنا رہی ہے معاشی اور سیاسی نظام بھی ہمارے ہاں وہی ہے جو پہلے تھا۔ بلکہ اس کی خرابیوں میں بھی ہم پہلے سے زیادہ الجھتے چلے جا رہے ہیں، اور اس گاڑی کے چلانے والے ذہن اس راہ سے ہٹ کر کسی دوسرے نظام کو ممکن تصور کرنے کے لیے بمشکل ہی تیار ہوتے ہیں۔ زبان اور تہذیب و تمدن اور طرز زندگی پر آج بھی انگریزیت چھائی ہوئی ہے۔ بلکہ خود انگریز کے دور حکومت میں وہ اتنی نہ چھائی تھی۔ اس پر مزید وہ عام اخلاقی بگاڑ ہے جو ہماری زندگی کے ہر گوشے میں پہلے سے بہت زیادہ پھیل چکا ہے اور پھیلتا جا رہا ہے۔ ہماری انتظامیہ کی عظیم اکثریت رشوت خیانت اور فرائض سے غفلت میں مبتلا ہے۔ ہمارے کاروباری طبقوں میں کم ہی ایسے ہیں جو حرام طریقے سے دولت کمانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے دیتے ہوں۔ ہمارے وسائل نشر و اشاعت اور ذرائع ابلاغ بڑے پیمانے پر لوگوں میں فواحش جرائم اور بدکرداری پھیلانے میں لگے ہوئے ہیں اور ہمارے معاشرے میں نظام معیشت و سیاست میں اور ملکی نظم و نسق میں اُن برائیوں کے محرکات اور مواقع زیادہ سے زیادہ بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ اگر حالات جوں کے توں باقی رہیں تو کیا یہ ممکن ہے کہ ہم صرف اسلامی قوانین کو نافذ کر کے وہ مقصد حاصل کر سکیں جس کیلئے

اسلام نے یہ قوانین ہم کو دیتے ہیں؟ شریعت کا فوجداری قانون آپ چاہیں تو ایک دن میں جاری کر دیں مگر اس کے تحت مجرموں کو پکڑے گا کون؟ کیا یہی پولیس جو انصاف کی دشمن، مجرموں کی پشت پناہ، اور بے گناہوں پر ظلم کرنے میں حد درجہ بے باک ہے۔ پھر عدالتوں کو وہ شہادتیں کہاں سے ملیں گی جن سے کسی شخص کے مجرم یا بے گناہ ہونے کا فیصلہ انہیں کرنا ہوگا؟ کیا وہ اسی معاشرے سے بہم پہنچیں گی جس میں جھوٹے گواہوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر اہم سوال یہ ہے کہ اسلام کا منشا کیا اسی طرح پورا ہو سکتا ہے کہ ملک کا معاشی نظام یہی رہے جو ڈاکے اور چوری کے محرکات سے لبریز ہے ملک میں قانون کو نافذ کرنے کی مشینری بھی یہی رہے جو ان جرائم کے لیے پورے مواقع فراہم کرتی ہے اور عدالتیں ان لوگوں کو سزائیں دے ڈالیں جو ڈاکہ ڈالیں یا چوری کریں۔ نیز کیا اسلام یہی چاہتا ہے کہ فواحش کی اشاعت اسی طرح جاری رہے، ہیجان انگیز فلم، تصویریں، لٹریچر اسی طرح سفلی جذبات کو اکساتے رہیں۔ بنی سنوری عورتیں اسی طرح برسرِ عام پھرتی رہیں، کالجوں، دفتروں کلبوں اور دوسرے بہت سے مقامات پر اختلاط مرد و زن اسی طرح جاری رہے اور ان حالات میں جو شخص زنا کا ارتکاب کرے اس کی پیٹھ پر قانون کوڑے برساتے۔ اگر ان سوالات کا جواب نفی میں ہے اور لازماً نفی ہی میں ہونا چاہیے تو پھر یہ تسلیم کیے بغیر چارہ نہ رہے گا کہ اسلام صرف اپنے قانون ہی کا نفاذ نہیں چاہتا بلکہ اپنی اس پوری اسکیم کا نفاذ چاہتا ہے جو اس نے نظام زندگی کے لیے ہمیں دیا ہے اور زندگی کے اس پورے ہنجار کی تبدیلی چاہتا ہے جو اس وقت ہمارے ملک میں پایا جاتا ہے۔

یہ جو کچھ میں نے کہا ہے اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ غیر اسلامی قوانین کی جگہ اسلامی قانون کے نفاذ کا خیال چھوڑ دینا چاہیے۔ اس کے برعکس جو بات میں کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اسلامی قانون کے نفاذ اور نظام زندگی کی ہمہ گیر اور ہمہ جہت تبدیلی کا کام ایک ساتھ کیا جائے جس طرح انگریز نے ہر طرف سے ہمارے نظام پر حملہ کر کے اور ہر پہلو سے اس کو گھیر کر اپنے سانچے میں اسے ڈھالا تھا۔ اسی طرح اب ہمیں اس کی چھوڑی ہوئی پوری میراث پر ہر جہت

انگریز کے رخصت ہونے کے بعد آزادی کے پہلے دن سے لے کر آج تک ہم نے آخر اُنہی چیزوں میں سے کس چیز کو تبدیل کیا؟ تبدیل کرنا تو درکنار، ہم اُسی راستے پر آگے ہی بڑھتے چلے گئے ہیں۔

سے عمل کرنا چاہیے اور ہر شعبۂ حیات میں اس کا قلع قمع کر کے اسلام کے پورے نظام کو عملاً قائم کرنا چاہیے اس مقصد کے حصول کے لیے قانون کی تبدیلی کے لیے جو اقدامات کرنے ضروری ہیں انہیں میں مختصراً بیان کرتا ہوں۔

(۱) نظامِ تعلیم کو یکسر تبدیل کیا جائے اور علوم و فنون کے ہر شعبے کا نصاب اسلامی نقطہ نظر کے مطابق ترتیب دیا جائے۔ کوئی نظریاتی مملکت اپنی درس گاہوں میں نرسری سے لے کر اعلیٰ تعلیم تک کسی مرحلے اور کسی گوشے میں اپنے نظریے سے مختلف کسی علم یا فن یا ذہنی تربیت کے کسی طریقے کا دخل گوارا نہیں کرتی۔ مثال کے طور پر چین اور روس اور دوسرے اشتراکی ممالک کے نظامِ تعلیم کو دیکھ لیا جائے۔ مغربی ممالک میں بھی کہیں ایسا نظامِ تعلیم نہیں پایا جاتا جو اُن کی نسلوں کو اُن کے بنیادی نظریات اور اصولوں سے منحرف کر دینے والا ہو۔

(۲) درس گاہوں کے لیے اُستادوں کے انتخابات میں سب سے مقدم یہ بات ہونی چاہیے کہ ہر اُستاد اسلام کا علم رکھتا ہو، اسلامی نظریے میں پختہ ہو اور عملاً بھی اسلامی احکام کا پابند اور اسلامی اخلاق سے متصف ہو۔ ہماری کسی درس گاہ میں کسی ایسے اُستاد کا وجود گوارا نہ کیا جائے جو اسلام کے خلاف نظریات رکھتا ہو اور اخلاقی حیثیت سے بھی اُس کا کردار درست نہ ہو۔ کوئی صاحبِ عقل و دانش قوم دنیا میں ایسی نہیں ہے جو اپنی اولاد کو دشمن کے حوالے کر دیتی ہو تاکہ وہ اُن کی لوحِ سادہ پر جو نقش چاہے ثبت

کردیں، خواہ وہ اس کی موت کا پروانہ ہی کیوں نہ ہو۔

(۳) مخلوط تعلیم غیر مسلموں کی نگاہ میں خواہ کتنی ہی قابلِ قبول یا پسندیدہ ہو، اسلام کے نقطۂ نظر سے وہ معاشرے کے لیے قطعی تباہ کن ہے اور کوئی شخص جو ادنیٰ سی بھی اسلامی حس رکھتا ہو، ان نتائج کے لیے ہرگز تیار نہیں ہوسکتا جو اس سے برآمد ہوتے ہیں اور عملاً برآمد ہو رہے ہیں جو لوگ اس کی حمایت کرنے والے ہیں وہ اسلام پر بڑا کرم کریں گے۔ اگر یہ زہر ہلاہل مسلمانوں کی اولاد کو پلانے کے ساتھ اسلامی قانون نافذ کرنے کے پاکیزہ عزائم کا اظہار چھوڑ دیں۔ پاکستان کو اگر اسلامی مملکت بننا ہے تو یہاں لڑکیوں کی تعلیم کے لیے لازماً الگ درس گاہیں اور یونیورسٹیاں بھی قائم ہونی چاہئیں۔

(۴) کالجوں کی تعلیم میں بلاتاخیر عربی زبان، قرآن، حدیث اور فقہ کی تعلیم کا پورا انتظام کیا جائے۔ اور ہمارے قانون دانوں کو تقویٰ کی تربیت بھی دی جائے تاکہ آئندہ ہماری عدالتوں کو موزوں قاضی اور وکیل بہم پہنچ سکیں۔

(۵) تمام ان اداروں میں جو ہمارے ہاں مختلف سرکاری ملازمتوں کی ٹریننگ کے لیے قائم ہیں اسلامی تعلیم اور اخلاقی تربیت کا انتظام کیا جائے تاکہ حکومت کو صرف کارداں ملازم ہی نہیں بلکہ ایسے ملازم مل سکیں جو ایماندار، خدا ترس، فرض شناس اور دین کا علم رکھنے والے بھی ہوں۔

(۶) اس وقت جو لوگ سرکاری ملازمت میں ہیں ان کے کردار کی چھان بین کی جائے۔ جو لوگ ناقابلِ علاج بد دیانت ہیں ان کو رخصت کر کے اچھے کردار رکھنے والے نوجوانوں کو ملازمت میں لے لیا جائے اور باقی لوگوں کے لیے ہر مقررہ مدت کے بعد ایسے ریفریشر کورس جاری کیے جائیں جن میں ان کو اسلامی تعلیم و تربیت دی جائے۔

(۷) تفتیش جرائم کے شعبے کو چھوڑ کر، سی آئی ڈی کا پورا محکمہ پولیس سے الگ کر لیا جائے اور اسے اس کام پر مقرر کیا جائے کہ وہ تمام سرکاری محکموں، افسروں اور ملازموں کے طرزِ عمل کی نگرانی کرے اور حکومت کو ہر قسم کی بدعنوانیوں کے بارے میں صحیح اطلاعات بہم پہنچائے۔ اس کے علاوہ حکومت کی دوسری انٹیلی جنس ایجنسیاں بھی اس کی نگرانی کے لیے استعمال کی جائیں تاکہ خبر رسانی کا کوئی ایک ذریعہ حکومت کو غلط خبر نہ دے سکے۔

(۸) خلافِ اسلام نظریات اور فواحش اور جرائم کی اشاعت جن جن ذرائع سے بھی ہو رہی ہے ان کا سدِ باب کیا جائے۔ کوئی نظریاتی مملکت اس بات کو برداشت نہیں کر سکتی کہ اس کے بنیادی نظریے اور اس کے اخلاقی اصولوں کے خلاف کسی قسم کا پرچار کیا جائے۔ ان میں اگر کوئی استثنا ہو سکتا ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ دوسرے مذاہب کے لوگ اپنے مذہب کی تعلیمات پر مشتمل کتابیں اور رسائل وجرائد شائع کرنے کے لیے آزاد ہوں۔

(۹) تمام ذرائع نشر واشاعت اور ذرائع ابلاغ ایک ایسی ہمہ گیر مہم کے لیے استعمال کیے جائیں جو عوام کو اسلامی عقائد اور احکام سے آگاہ کرے۔ ان میں خدا کا خوف اور آخرت کی جوابدہی کا احساس پیدا کرے۔ ان کے اندر صالح اخلاق کی طرف رغبت اور برائیوں سے نفرت پیدا کرے اور نہایت معقول و مؤثر طریقوں سے لوگوں کو سمجھائے کہ زندگی میں خدا اور رسول کے احکام سے تجاوز کرنا اور اخلاقی حدود کو توڑنا انسان کو دنیا اور آخرت میں کیسے بُرے نتائج سے دوچار کرتا ہے۔

(۸) ملک کے معاشی نظام میں اسلامی احکام کے مطابق ایسی تبدیلیاں لائی جائیں جن سے دولت کی تقسیم منصفانہ ہو، دولت کمانے اور صرف کرنے کے حرام طریقے بند ہوں، رزق حلال حاصل کرنے کے مواقع عام لوگوں کے لیے کھلے ہوں، کوئی شخص زندگی کی بنیادی ضروریات سے محروم نہ رہے، اور ناجائز و ناپاک ذرائع سے جو لوگ قارون بن گئے ہیں ان کی دولت قانون کے ذریعے سے واپس لی جائے۔

جس طرح انگریز نے ہر طرف سے ہمارے نظامِ حیات پر حملہ کر کے اور ہر پہلو سے اسے گھیر کر اپنے سانچے میں اسے ڈھالا تھا اسی طرح اب ہمیں اس کے چھوڑے ہوئے میراث پر ہر جہت سے حملہ کرنا چاہیے

قرآن واحادیث پر منتخب قابل قدر کتابیں

تفہیم القرآن چھ جلدوں میں مکمل	-/۱۲۷	تدبر قرآن (مولانا امین احسن اصلاحی) جلد اوّل	-/۳۲
تفسیر ابن کثیر	-/۱۶۰	گلوریس قرآن صرف انگریزی ترجمہ	-/۱۰
تفسیر مظہری ۱۴ جلدوں میں مکمل	-/۳۲۵	گلوریس قرآن انگریزی ترجمہ مع عربی متن	-/۲۰
ریاض الصالحین دو جلدیں	-/۵۵	گلوریس قرآن انگریزی ترجمہ (" ڈی لکس)	-/۳۰
قرآن آپ سے کیا کہتا ہے۔	/۶	قرآن مجید معریٰ ۳	-/۴۰
قرآن اور اس کے حقوق	۳/۵۰	قرآن مجید مترجم ۱۵	-/۲۵
قرآن اور سائنس	-/۱۲	قرآن مجید ہندی انگریزی ترجمہ	-/۳۰
معارف الحدیث چھ جلدوں میں مکمل	-/۷۲	قرآن مجید ہندی اردو ترجمہ	-/۳۰
کلام نبوت	-/۱۵	تفہیم القرآن آخری ۲۱ سورتیں	-/۳
راہ عمل	-/۱۰	تفہیم القرآن پارہ عم	-/۵
انتخاب حدیث	-/۶	زادِ راہ	-/۱۲

ہر قسم کے قرآن مجید و سیپارے یسرنا القرآن ہم سے طلب فرمائیے

صدر ضیاء الحق نے پاکستان کو اسلامیانے کی راہ ہموار کرنے کے لیے بعض سماجی، اقتصادی اور تعزیری اصلاحات کا اعلان کیا ہے۔ دورِ استعمار کی چھوڑی ہوئی سماجی، اقتصادی اور قانونی زنجیروں کو توڑنے اور اپنے مقصدِ وجود کو پہچان کر اپنی راہ متعین کرنے کی یہ پہلی مخلصانہ تاریخی کوشش ہے۔ اس پر مسلمانوں کو فطری طور پر خوشی ہونی چاہیے۔ لیکن اسلامی نظام کی طرف یہ پیش قدمی ہمارے ملک کے سیکولر مسلمانوں اور غیر مسلموں کے لئے ایک سوالیہ نشان بن کر کھڑی ہوئی ہے۔

* ان کی ایک الجھن یہ ہے کہ کیا آج کے اس دور میں کوئی ترقی پذیر ریاست قرآن اور سنت کے قانون کے مطابق چلائی بھی جا سکتی ہے یا نہیں ___

* دوسری پریشانی یہ ہے کہ اسلامی نظام کی طرف پیش قدمی کرنے والے ان ممالک میں غیر مسلم دوسرے درجہ کے شہری تو بن کر نہ رہ جائیں گے۔

یہ دونوں سوالات بڑے اہم ہیں، اور ان کا شافی و کافی جواب دیا جانا اس لئے ضروری ہے کہ دنیا اسلامی نظام کی برکتوں سے ناآشنا ہے اور اسلام کے نظامِ معیشت، دیوانی اور فوجداری قوانین، سیاسی نظام، رفاہی تصورات، تعلیمی خطوط اور معاشرتی احکام کو ناقابلِ عمل سمجھتی ہے۔ حالانکہ یہ سب نہ صرف قابلِ عمل بلکہ مقابلتاً انتہائی سہل العمل اور پسندیدہ ہیں۔

ذیل کی سطروں میں ہم ان سوالوں کا جواب دینے کی کوشش کریں گے۔

اولاً ایسے تمام بھائیوں کی جو اسے قابلِ عمل

نہیں سمجھتے، پہلی اُلجھن کو لیجئے کہ کیا آج کے اس دور میں کوئی ترقی پذیر ریاست قرآن و سنت کے اصول کے مطابق چلائی بھی جا سکتی ہے یا نہیں۔

اس سوال کا جواب دینے کے لئے اس سے پہلے کہ ہم یہ بحث چھیڑیں کہ ریاست کی بنیاد کیا ہو، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم ذہن کو اس معاملے میں صاف کرتے چلیں کہ ریاست کہتے کسے ہیں؟ علمائے سیاست نے ریاست کی گوناگوں تعریفیں کی ہیں۔ افلاطون، ابن خلدون، ہیگل، آدم سمتھ، رابرٹ اون، ہابس اور روسو سبھی نے ریاست کی اچھی تعبیریں پیش کی ہیں مگر ان علماء کی رائیں ایک دوسرے سے اتنی مختلف ہیں کہ ان کے پڑھنے سے ذہن اُلجھ کر رہ جاتا ہے۔ اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ریاست کے خد و خال سے متعارف ہونے کے لئے ہم ان اوصاف و عناصر پر روشنی ڈالیں جن سے ریاست کی تشکیل ہوتی ہے۔

ریاست دراصل ایک ادارہ (Institution) ہے جو متعین مقاصد اور متعین حقوق و فرائض کا حامل ہے۔ چنانچہ ریاست بحیثیت ہیئت اجتماعی مندرجہ ذیل عناصر سے ترتیب پاتی ہے۔

۱۔ تنظیمی ڈھانچہ

۲۔ عوام

۳۔ حکومت

۴۔ اقتدار اور

۵۔ دستور یا ایسا بنیادی قانون جو ناقابل ترمیم و تنسیخ ہو۔

لہٰذا ریاست کے لئے لازم ہے کہ:

۱۔ وہ معاشرے کے تمام طبقات اور تمام اداروں کی اصولی نمائندگی کرے۔

۲۔ ان تمام اداروں کو ایک قانونی نظام میں منسلک کرے۔

۳۔ معاشرے کے تمام اجزاء کو ہم آہنگی کے ساتھ منظم کرے۔

۴۔ اقتدار سے بہرہ مند ہو تاکہ اپنے تمام اجزاء کو قانون کی قوت کے آگے جھکا سکے اور

۵۔ معاشرے کی فلاحی تربیت اور اس کی حقیقی اخلاقی، سماجی، اقتصادی اور سیاسی ضرورتوں کو پورا کر سکے۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ریاست کی بنیادیں معاشرے کے اندر پیوست ہونا ضروری ہے۔ نیز یہ بھی لازم ہے کہ اس کی اساس
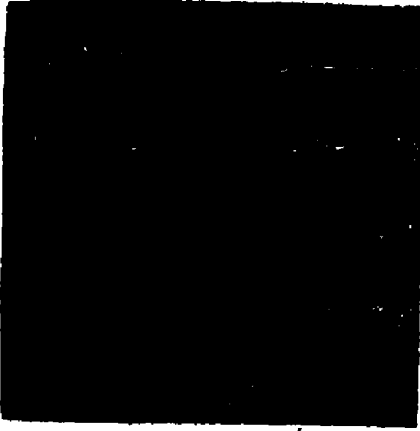
واضح اور جامع نظریہ Ideology پر استوار ہو۔ سادہ الفاظ میں اس بات کو یوں کہہ سکتے ہیں کہ ریاست کا فرض ہے کہ وہ افراد اور جماعتوں کی تنظیم اور ان کے حقوق و فرائض کا تعین کر سکے۔ یہی بات ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ ریاست کے پاس ایسا کامیاب دستور ہو جس کی بدولت حکومت اور معاشرے کے مابین مضبوط اور پائیدار رابطہ وجود میں آئے۔ دستور کی جڑیں ہوا میں نہ ہوں بلکہ معاشرہ کے افراد کے دل و دماغ میں پیوست ہوں اور اس کے ریشے افراد کے طرزِ فکر، اُن کے رجحانات، احساسات، عقائد اور فلسفۂ زندگی میں اُترے ہوئے ہوں۔

اس نقطۂ نظر سے دیکھئے تو آج کی دنیا میں نظامِ سیاست کے لئے دو طرح کے راستے اختیار کئے گئے ہیں۔

★ ایک لادینی نظریہ یعنی سیکولر نظریہ ریاست

اور

★ دوسرا دینی نظریہ

لادینی نظریہ حیات یہ ہے کہ دنیوی زندگی کے مقاصد و مسائل میں ماوراء الطبیعی امور کا کوئی لحاظ نہ رکھا جائے اور مسائل زندگی کے حل کے لئے خدا اور آسمانی تعلیمات سے بے نیاز ہو کر عقل انسانی

اور تجربہ کی روشنی میں اپنے لئے راہ تلاش کی جائے۔ اس نظریۂ حیات میں عقائد اور اخلاقی قدروں کی کوئی اہمیت نہیں ہے اس لئے وہ علم کو دین اور اخلاقیات سے جدا رکھنے پر مصر ہیں۔ وہ دین کو کوئی درجہ دیتے بھی ہیں تو وہ انسان کی نجی زندگی میں ـــــ ان کا کہنا ہے کہ علم اور مذہب ایک دوسرے سے توافق کبھی نہیں پیدا کر سکے۔ ان میں بُعد قطبین ہے۔ لیکن حقیقت کی دنیا میں کچھ ایسے تجربے سامنے آتے ہیں جو ہمیں اخلاقیات کو بالادستی دینے پر مجبور کرتے ہیں۔ اس بات کو ایک مثال سے اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے۔

سائنس نے ایٹمی توانائی دریافت کی ہے لیکن سوال یہ ہے کہ ایٹم بم کے موجد اپنے آپ کو ایٹم بم کے اچھے اور برے استعمال سے کیسے روک سکتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ مجرد علم اپنے آپ کو اس طرح کی ہر ذمہ داری

سے بری قرار دے سکتا ہے۔ لیکن کیا یہ صحیح نقطۂ نظر ہوگا ــــ

اسی طرح زندگی کے دوسرے پیچیدہ مسائل ہیں جن میں لادینی نظریہ کفایت نہیں کرتا۔ مثلاً فرد اور سماج کے تعلقات کے متعلق لادینی نظریہ کوئی قابلِ عمل بنیاد پیش کرنے سے قاصر ہے۔ یہ نظریہ افادیت کا نام لے کر مختلف مواقع پر مختلف معیار کام میں لاتا ہے۔ چنانچہ سیکولر انداز پر سوچنے والے لوگ انسان کی ازدواجی زندگی کے بارے میں متضاد رائیں رکھتے ہیں۔ کچھ لوگ مرد اور عورت کے آزادانہ حیوانی اختلاط کے قائل ہیں اور کچھ ازدواجی نسبت قائم کئے بغیر مرد اور عورت کے جسمانی تعلق کو انسانی فطرت کے خلاف قرار دیتے ہیں۔

یہ ایک مثال ہے جس سے لادینی نقطۂ نظر کا کھوکھلا پن واضح ہو جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک معاشرے میں فرد اور جماعت کے تعلقات کی نوعیت کا مسئلہ بنیادی اہمیت کا حامل ہے جسے سیکولر نقطۂ نظر اچھی طرح حل نہیں کر سکتا۔ ان مسائل سے دین ہی اچھی طرح عہدہ برآ ہو سکتا ہے۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ انسانی زندگی کی حقیقت کیا ہے؟ لادینی نقطۂ نظر رکھنے والے لوگ زندگی کی حقیقت سمجھنے کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ چنانچہ لادینی نظریئے نے انفرادی زندگی میں طرح طرح کے نفسیاتی الجھاؤ پیدا کر دیئے ہیں اسی لیے انسانی نفس اور انسانی روح کی سلامتی اور صحت مندی کے لئے دین جو بنیاد فراہم کرتا ہے اس کا اعتراف ماہرین نفسیات کو بھی ہے۔

سیکولر ریاست میں سماجی، اقتصادی اور تعلیمی سارے معاملات کو سلجھانے کے لئے مادی مصلحتوں کو سامنے رکھا جاتا ہے۔ اس نظام میں انسانی قدروں کا ماخذ خدا سے چھین کر انسان کے ہاتھ میں دے دیا جاتا ہے۔ چنانچہ جو تعلیم انسانی قتل کو حرام قرار دیتی ہے اور باہمی الفت و محبت کو لازم ٹھہراتی ہے سیکولر نظریہ حیات کے مطابق معاشرتی زندگی کا ایک تقاضا ہے۔ حالانکہ یہ فطرت انسانی کا

مطالبہ ہے۔ پھر جب لادینی نقطۂ نظر سے قتل کی ضرورت ناگزیر ہوجاتی ہے اور الفت و محبت کا کوئی مصرف نہیں رہتا تو سماج کے سارے رجحان بدل جاتے ہیں۔ اور وہ چیزیں جنہیں انسان احترام اور تقدس کی نظر سے دیکھتا ہے، ناکارہ قرار پاتی ہیں۔ کیوں کہ لادینی نظریہ حیات کے مطابق اخلاق، دین اور خدا ——— سب اضافی تصورات ہیں۔ جن کی افادیت ہو بھی سکتی ہے اور نہیں بھی ہوسکتی۔ یہ بڑے مزے کی بات ہے کہ لادینی مفکرین کے نقطۂ نظر سے یہ تصورات سماجی ارتقا کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ اسے مثال سے سمجھئے۔ ان کا کہنا ہے کہ جب سماج کھیتی کے دَور سے ترقی کرکے صنعتی دور میں داخل ہوتا ہے تو اخلاق، دین اور خدا، سب تصورات بدل جاتے ہیں۔ کھیتی کیلئے ہر سماج میں خدا کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ اس لئے کسان خدا پر بھروسہ کرتا ہے۔ خدا سے دعا کرتا ہے اور اس سے فضل کا طالب رہتا ہے —— مگر جب وہ صنعت کے میدان میں قدم رکھتا ہے تو اسے خدا کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی

لادینی نظریہ نیوڈارونزم اور مارکسزم کے علمبرداروں کا نظریہ ہے جس کی رو سے دین اور فلسفہ کا ماخذ وحی نہیں بلکہ انسانی سماج اور اس کے معاشی حالات ہی دین و فلسفہ کو جنم دیتے ہیں۔ پھر جب یہ نظریہ جارحانہ روش اختیار کرلیتا ہے تو نازی ازم کی شکل دھار لیتا ہے۔ بالشویک تحریک میں بھی یہی نقطۂ نظر کارفرما نظر آتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مطلق اقتدار خود ہی ایک بہت بُری چیز ہے۔ یہ بات انسان کے بس کی نہیں ہے کہ اقتدار مطلق کو احتیاط اور دوراندیشی سے استعمال کرسکے۔ البتہ دین زندگی کی جو اساس مہیا کرتا ہے وہ انسانی فطرت سے زیادہ ہم آہنگ ہے۔ کیونکہ دین جہاں خالق کائنات اور انسان کے درمیان باہمی تعلق پر محیط ہے وہیں وہ انسان اور انسان کے باہمی تعلق پر بھی حاوی ہے۔ دین کے پہلے جز کو عبادات سے تعبیر کیا جاتا ہے اور دوسرے کو معاملات سے —— اس کا مطلب یہ ہے کہ دین محض چند فلسفیانہ خیالات اور بکھرے ہوئے اعمال کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ ایک باضابطہ نظریہ ہے جو دنیا کے ہر نبی اور ہر روحانی مصلح کا مشن رہا ہے —— یہ سارے نبی اور مصلح خدائے واحد کی خدائی منوانے اور اس کی بندگی کا حق ادا کرنے کی تعلیم دیتے تھے۔ اسے آپ ایشور واد کہئے یا خدا پرستی، بات ایک ہی

ہے۔ فرق صرف زبان اور اصطلاح کا ہے ورنہ روح
دونوں کی ایک ہی ہے۔

ایشور واد اور خدا پرستی دونوں نے تعمیر کردار
یعنی چرتر نرمان پر زور دیا ہے۔ سارے ایشور وادیوں
اور انبیا علیہم السلام کا مشن ہی یہ تھا کہ وہ اعلیٰ
درجے کے انسانی اخلاق کی تعلیم دیں۔ محمد رسول اللہ
چونکہ سلسلہ رسالت یعنی ——
(ईशदौत्यवाद की शृंखला) کی آخری
کڑی تھے اس لئے ان کی احادیث (वाणी)
پوری طرح محفوظ ہیں۔ انھوں نے نبیوں اور ایشور
وادیوں کے اس مشن کا ان الفاظ میں اعلان
کیا تھا کہ ——

بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَكَارِمَ الْاَخْلَاق

"مجھے مکارم اخلاق کی تکمیل
کے لئے مبعوث کیا گیا ہے۔"

ایشور وادیوں اور خدا دوستوں میں اس
بات پر کبھی اختلاف نہیں ہوا کہ اللہ کائنات کا خالق
مالک اور مدبر ہے۔ اور اسی کا حکم مانا جانا چاہیئے۔
اسی کی بندگی (उपासना) کرنی چاہیئے۔
اسی کی بھیجی ہوئی ہدایات کے مطابق زندگی گذارنی
چاہیئے اور اسی کی خدائی ماننی چاہیئے۔ انسان پر انسان
کی خدائی فساد کا سرچشمہ ہے۔ چنانچہ دین یا دھرم
کی دعوت وہی ہے جسے ہر نبی نے پیش کیا اور جسے
قرآن سورۂ آل عمران کے ان الفاظ میں پیش کرتا
ہے کہ ——

تعالوا الی کلمۃ سواء بیننا وبینکم
الا نعبد الا اللہ ولا نشرک بہ شیئا ولا
یتخذ بعضنا بعضا اربابا من دون اللہ ——

"آؤ ایک ایسی بات کی طرف
جو ہمارے اور تمہارے درمیان

یکساں ہے یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں اور خدائی میں کسی کو اس کا شریک نہ قرار دیں اور ہم میں سے کوئی کسی (انسانؑ فرشتے، دیوتا یا عناصر قدرت) کو خدا کے سوا رب نہ بنالے۔"

یہی بات ہمارے ہندوستانی ایشؔ دوت کہتے رہے ہیں۔ حضرت محمدؐ عرب میں پیدا ہوئے تھے اس لئے اللہ نے اُن پر عربی میں ہدایت اُتاری وہ ہندوستان میں پیدا ہوئے ہوتے تو ان پر کسی ہندوستانی زبان میں ہدایت اتاری جاتی۔ لیکن نبی آخرالزماں کسی ملک یا قوم کے لئے خاص نہیں تھے۔ وہ سارے عالم کے لئے بھیجے گئے تھے۔ وہ رحمتہ للعالمین (विश्व बन्धु) تھے۔ اور اس لئے آئے تھے کہ وہ انسان کی روح اور اس کی عقل و فکر کو غلامی کی اُن زنجیروں سے آزاد کردیں جن میں وہ جکڑا ہوا تھا اور اسے خدا کے پسندیدہ طرز زندگی کی طرف دعوت دیں۔

کیونکہ اس دنیا کا اصل حاکم خدا ہے اور باقی ساری کائنات، انسان اور فرشتے سب اس کی رعیت ہیں۔

حضرت محمدؐ نے رحمت عالم ہونے کے تعلق سے ساری دنیا کو خدا کا کنبہ قرار دیا۔ یہ وہی بات ہے جسے ہمارے ہندوستانی ایشؔ دوت بسودھیو کٹمبکم (वसुधैव कुटुम्बकम्) کے الفاظ میں بتاتے رہے ہیں۔ پھر حضرت محمدؐ نے انسانی دنیا کو ایک اکائی مان کر۔

ایک خدا، ایک انسان، ایک نظام کی دعوت دی ——

اور ایک ایسی ریاست کی بنیاد ڈالی جس میں خدا کا سرمدی قانون نافذ تھا۔ اور ہیئت اجتماعی کا فرض صرف یہ تھا کہ اس قانون کو بلا کم و کاست نافذ کردے۔ اللہ کا یہ قانون زندگی کے سفر کا صحیح رُخ متعین کرتا ہے اور ہر پُرپیچ مقام ہر موڑ اور ہر دوراہے پر یہ بتاتا ہے کہ سلامتی کا راستہ کس طرف ہے۔ ہ اسلامی اسٹیٹ کا فرض ہے کہ

وہ لوگوں کی آزادی کی حفاظت کرے، لوگوں کو انصاف دے، انھیں ایک دوسرے پر زیادتی کرنے سے روکے۔ نیکی کی تلقین کرے اور برائیوں سے روکے۔ نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں تعاون کرے اور گناہ و تعدی میں نہ خود تعاون کرے نہ کسی دوسرے کو تعاون کرنے دے۔

اسلامی اسٹیٹ کا فرض ہے کہ وہ لوگوں کی آزادی کی حفاظت کرے، لوگوں کو انصاف دے۔

ظاہر ہے کہ یہ ریاست ایجابی مقاصد سے قائم ہوتی ہے اور اس کا مقصد سلبی نہیں ہوتا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ریاست ایک فلاحی ریاست ہوتی ہے جس میں رہنے والے ہر فرد کو اس کی بنیادی ضرورتیں فراہم کرنا ریاست کا فرض ہے اور ترقی پذیری کے صالح عناصر کو ابھرنے اور بروئے کار آنے کا پورا موقع ملتا ہے۔ ایسی ریاست کے نہ چلنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

اب آیئے، دوسرے سوال پر غور کریں۔ اسلامی ریاست میں غیر مسلموں کو ذمی کہا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حکومت اس کے حقوق کی حفاظت کا ذمہ (Guarantee) لیتی ہے۔ اور یہ ذمہ وہ احسان کے طور پر نہیں بلکہ خدا اور رسول کے مقرر کئے ہوئے ضابطوں کے مطابق فرض کے طور پر لیتی ہے۔ انھیں مذہب کی پوری آزادی دیتی ہے۔ مذہبی تعلیم کی اجازت دیتی ہے۔ مذہبی لٹریچر چھاپنے اور شائع کرنے کی اجازت دیتی ہے۔ قانون کے حدود میں مذہبی بحث کی آزادی دیتی ہے۔ ان کے پرسنل لا کی حفاظت کی گارنٹی دیتی ہے۔ دیوانی اور فوجداری قانون میں مسلمانوں کے ساتھ پوری مساوات دیتی ہے، اور حکومت کا عام برتاؤ مسلمان اور غیر مسلم کے ساتھ یکساں رہتا ہے ـــــ حاجتمند ہونے کی صورت میں مسلمانوں کی طرح غیر مسلموں

کو بھی بیت المال سے مدد دی جاتی ہے۔ انھیں اپنی آبادیوں میں معابد بنانے کی آزادی ہوتی ہے۔

البتہ یہ صحیح ہے کہ اسلامی حکومت میں کوئی غیر مسلم صدر ریاست یا وزیر یا سپہ سالار اور ایسے کلیدی منصب کا حامل نہیں ہوتا جہاں وہ حکومت کی پالیسی پر اثر ڈال سکے۔ اس کی وجہ صاف ہے۔ اسلامی حکومت دراصل ایک نظریاتی حکومت ہے اور وہاں یہ عہدے انھیں لوگوں کو دیئے جاسکتے ہیں جو اس نظریئے کے حامل ہوں۔ چونکہ غیر مسلم قرآن وسنت کے اس نظریئے کے قائل نہیں ہوتے جن پر اسلامی حکومت کی اساس ہے اس لئے یہ مناصب انھیں نہیں دیئے جاسکتے۔ البتہ اگر وہ قرآن و سنت کے اس نظریہ کو مان لیں جن پر ریاست کی تاسیس ہوئی ہے تو وہ حکمراں جماعت میں خوشی سے شامل کیے جاسکتے ہیں۔ مگر اس صورت میں وہ غیر مسلم رہیں گے ہی کہاں۔

اس کی ایک مثال ہے۔ لیوپولڈ ویس ایک پولینڈ کے رہنے والے یہودی تھے۔ مطالعہ کے بعد وہ اسلامی نظریات کے قائل ہوگئے۔ پھر نجانے کیسے وہ پاکستان آکر بس گئے۔ تو اگرچہ وہ نومسلم تھے مگر حکومت پاکستان نے انھیں ایسے وقت یو، این، او میں اپنا نمائندہ بناکر بھیجا جبکہ وہاں نظام اسلامی کے قیام کا اعلان بھی نہ ہوا تھا۔ اسی طرح جب جسٹس اے کارنیلیس مسلمان ہوگئے تو وہ پاکستانی سپریم کورٹ کے چیف جج مقرر کیے گئے۔

اس لئے اسلامی ریاست میں رہنے والے غیر مسلموں کے بارے میں یہ تصور غلط ہے کہ وہ دوسرے درجے کے شہری ہوجاتے ہیں۔ اس کا سبب غالباً یہ ہے کہ ہم اپنے ملک میں اکثریت اور اقلیت کی اصطلاحیں استعمال کرتے ہیں۔ ہم نے اقلیت کو اکثریت کے دباؤ اور جبر سے بچانے کے لئے کچھ قانونی تحفظ بھی دیئے ہیں۔ جن سے ان کی تہذیب اُن کے پرسنل لاز اور اُن کی روایات کا تحفظ مقصود ہے۔ اگر یہ تحفظات ہمارے یہاں عدل وانصاف اور فراخ دلی کی علامت قرار دیئے گئے ہیں تو پھر اسلامی ریاست میں جہاں اقلیتوں کے حقوق خدا کے قانون کے تحت ملتے ہیں غیر مسلموں کو اور بھی بہتر تحفظ ملے گا اور ان کے پھولنے پھلنے کے بہتر مواقع مہیا ہوں گے۔

ایک سوال چار جواب

نعیم صدیقی

تاریخ نے پوچھا، اے لوگو! یہ دنیا کس کی دنیا ہے؟
شاہی نے کہا ——— یہ میری ہے!
اور دنیا نے یہ مان لیا
پھر تخت بچھے، ایوان سجے، گھڑیال بجے، دربار لگے!
تلوار چلی اور خون بہے! انسان لڑے، انسان مرے
دنیا نے بالآخر شاہی کو
پہچان لیا، پہچان لیا

تاریخ نے پوچھا پھر، لوگو! یہ دنیا کس کی دنیا ہے؟
دولت نے کہا ——— یہ میری ہے
اور دنیا نے یہ مان لیا
پھر بنک کھلے، بازار جمے، بیوپار بڑھے!
انسان لٹے، انسان بکے! آرام اڑے، سب چیخ اٹھے!
دنیا نے بالآخر دولت کو
پہچان لیا، پہچان لیا

تاریخ نے پوچھا پھر، لوگو! یہ دنیا کس کی دنیا ہے؟
محنت نے کہا ——— یہ میری ہے!
اور دنیا نے یہ مان لیا
پھر روح دبی، پھر پیٹ بڑھے، افکار بڑے، کردار گرے!
ایمان لٹے، اخلاق جلے! انسان نرے حیوان بنے!
دنیا نے بالآخر محنت کو
پہچان لیا، پہچان لیا!

تاریخ نے پوچھا پھر، لوگو! یہ دنیا کس کی دنیا ہے؟
مومن نے کہا ——— اللہ کی ہے!
اور دنیا نے یہ مان لیا
پھر قلب و نظر کی صبح ہوئی! اک نور کی ندی پھوٹ بہی!
ایک ایک خودی کی آنکھ کھلی! فطرت کی صدا پھر گونج اٹھی
دنیا نے بالآخر آقا کو
پہچان لیا، پہچان لیا

اوصاف سعید وصفی

پاکستان شاہراہ اسلام پر

پاکستان کی اسلامی جمہوریہ نے اسلامی نظریے کو عملی روپ دینے میں تیس برس کے قریب صرف کر دیے۔ جو اس کے قیام کے لیے اساس کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسلامی نظریہ کو عملی جامہ پہنانے کا یہ عمل جولائی ۷۷ء سے تیز ہوا ہے۔ اور ایک سپاہی کے ہاتھوں تکمیل کو پہنچ سکتا ہے

صدر ضیاء الحق کے اقتدار میں آنے کے بعد جن کی واحد کمزوری یہ ہو سکتی ہے کہ وہ ایک فوجی ہیں، اسلام کو واضح طور پر برتری حاصل ہو گئی ہے۔

پاکستانی سڑکوں پر چہل قدمی کرنے کے بعد مختلف مکتب فکر کے دانشوروں سے تبادلۂ خیال کر کے کسانوں اور مختلف شعبوں کے دفتری کارکنوں کے ساتھ بات چیت کر کے جو تاثر مرتب ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ غیر اسلامی طرز فکر اب وہاں مدافعانہ پوزیشن میں ہے۔ اور اگر فوری طور پر نہیں تو مستقبل قریب میں اسے ضرور پسپائی اختیار کرنا پڑے گی۔

خود تراشیدہ مغرب زدگی کے دیو پر قابو پانے کے لیے جو حکمت عملی مرتب کی گئی ہے۔ وہ معقول بھی ہے اور موثر بھی۔ اس کثیر چہرہ دیو سے نجات پانے کے لیے کسی قسم کی غیر معمولی سرعت سے کام نہیں لیا جا رہا ہے۔ حالانکہ ایک فوجی نظم و نسق کے تحت یہ کوئی مشکل نہ تھا۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ سوشلسٹ اور وہ عناصر جو اسلام سے بیزار ہیں اتنی دیدہ دلیری کے ساتھ صدر ضیاء الحق اور نظام اسلام کے خلاف اپنے دل کی بھڑاس نکالتے رہتے ہیں۔

ان لوگوں کو جو آزادی میسر ہے اسے کمزوری پر محمول
کرنا غلط ہوگا۔

مارشل لاء میں جس انداز کی "شرافت" سے
کام لیا گیا ہے وہ ایک شعوری عمل ہے اور ایک
وسیع تر منصوبے کا حصہ ہے اس کا منشا یہ ہے
کہ ملک کو ایک مکمل مثالی اسلامی ریاست میں
تبدیل کیا جائے کسی سماج کی تشکیل ایک خاصا
صبر آزما اور محنت طلب کام ہوتا ہے۔ جو لوگ
اس کام میں مشغول ہیں۔ انہیں اندازہ ہے کہ
غیر ضروری جوش و خروش کا مظاہرہ کرنے سے
نت نئی پیچیدگیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔ یہی
وجہ ہے کہ وہاں اس عمل کے دوران تند و تیز
قسم کی تبدیلیاں یا انقلابی جوش و خروش کے
مظاہرے دیکھنے کو نہیں ملتے تاہم وہاں اسلامی
طرز فکر کی بنیادیں گہری ہوتی جا رہی ہیں اور بقول
مولانا مودودی کہ "آغاز امید افزا ہے"

اگر ہم صدر ضیاء الحق کے ۱۲ ربیع الاول کو
قوم کے نام جاری کئے گئے اعلان کے پس منظر میں ان
کے اس ارشاد کو پرکھنے کی کوشش کریں تو یہ اور بھی
زیادہ اہمیت اختیار کر جاتا ہے۔ اس سے پہلے اعلان
میں صدر موصوف نے اسلامی کیلنڈر کا آغاز کرتے
ہوئے اپنی حکومت کے اس فیصلے سے قوم کو مطلع
کیا تھا کہ ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ کی سطحوں پر
شریعت کی بنچیں قائم کر دی گئی ہیں نیز اس کے
ساتھ اسلامی نظام کے اجراء کے آغاز کے اس
موقع پر دیگر اور بھی اقدامات کی بابت اعلان فرمایا
تھا۔

اسلامی تحریک کے بانی مولانا مودودی صاحب
جو اپنی عمر کے ۷۶ برس پورے کر چکے ہیں اور
محض ایک گردے پر زندہ ہیں۔ نیز عرصہ سے
دیگر عوارض میں بھی مبتلا ہیں۔ اسلام کے احیاء
کے بارے میں بڑے پُر امید نظر آتے ہیں لیکن
ساتھ ہی وہ احتیاط برتنے پر بھی زور دیتے ہیں
اور کہتے ہیں کہ "ابھی بھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔"
ان کے چہرے پہ ایک حوصلہ افزا سکون
اور طمانیت اور ایک عجیب و غریب تابانی جھلکتی
ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

پاکستان میں سیاسی مبصرین نے جنرل ضیاء کے
اس ولولہ انگیز اعلان کو ایک تاریخی اور عہد ساز بیان
قرار دیا ہے۔ متشککین نے اسلام کے چار قوانین
پر عمل در آمد کے بارے میں تحفظ ذہنی کا اظہار
کیا ہے۔ یہ چار قوانین چوری، ڈکیتی، شراب نوشی اور

زنا کے مرتکب پر حد جاری کرنے اور عقیدے کی آزادی کے تحفظ سے متعلق ہیں۔ ۱۲ ربیع الاول یعنی ۱۰ فروری کو آنحضرتؐ کی ولادت کے مبارک دن سے نافذ کیے گئے۔

ان چند جزوی امور کی انجام دہی کے بعد ایک غیر فوجی کابینہ پاکستان میں اسلامی نظام کو عملی شکل دینا شروع کر دے گی۔ اسلامی نظریاتی کونسل جیسے ادارے جو قرآن و حدیث کی تشریح کرنے پر قدرت رکھتے ہیں۔ سنئے سرے سے منظم کیے جا رہے ہیں۔ ایک دارالفقہ قائم کیا جا رہا ہے۔ بیرونی ملکوں میں مقیم ماہرین معیشت اسلامی کو بھی پاکستان آنے کی دعوت دی گئی ہے۔ زکوٰۃ اور عشر کے مسائل کا جائزہ لینے کے بعد وزارت خزانہ نے صلاح و مشورے سے نظم زکوٰۃ و عشر کا نفاذ کر دیا گیا ہے۔

اسلامی نظام کے نفاذ کے سلسلے میں صدر ضیا کی حکومت نے جو طریقہ اختیار کیا ہے وہ توجہ کا مستحق ہے وہ اگر چاہتی تو چند اسلامی قوانین مرتب کر کے انھیں غیر آمادہ لوگوں کے سر تھوپ سکتی تھی یا وہ عدالتوں کو یہ حق بھی دے سکتی تھی کہ وہ تمام غیر اسلامی قوانین کو مسترد کر سکیں۔ اس کے بعد ان کی جگہ نئے اسلامی قوانین نافذ کر سکتی تھی۔ لیکن اس نے ان سب کاموں میں پہل کرنے کی آزادی عوام اور عدالتوں کو ہی دے دی اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حکومت عدلیہ کے راستے میں حائل نہیں ہونا چاہتی۔

ایک طرز حیات کے طور پر اسلامی نظام کا فروغ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ قومی معیشت سے سود کے لین دین کو قطعاً ختم نہ کر دیا جائے۔

زکوٰۃ اور عشر اسلامی اقتصادیات میں ریڑھ کی ہڈی کا درجہ رکھتے ہیں چنانچہ پاکستان نے طے کیا ہے کہ وہ اپنی اقتصادیات کو اسلامی ڈھانچہ کے مطابق ڈھالے گی۔ یہ ایک زبردست کام ہے اور اسے ساری دنیا پوری دلچسپی کے ساتھ دیکھ رہی ہے کہ معاشی نظام سود کے بغیر کس طرح چل سکتا ہے۔

اسلام آباد خطرے مول نہیں لینا چاہتا اور اسی لیے اس نے دنیا کے ان بہترین دماغوں کو مجتمع کرنے کی کوشش کی ہے۔ جو سود کے بغیر بینک کاری میں مہارت اور تجربہ رکھتے ہیں یہ کہنا مبالغہ آرائی نہ ہوگا کہ پاکستان کے مستقبل کا دار و مدار اسی تجربہ پر مبنی ہے اگر خدانخواستہ یہ ناکام ہوگیا تو صرف پاکستان کے اسلام

پسندوں کو ہی نہیں بلکہ بحیثیت مجموعی تحریکِ اسلامی کو بھی دھکا لگے گا۔

اس سلسلے میں آج کل اس سوال پر پاکستان میں بڑی شد و مد سے بحث جاری ہے کہ ان قرضوں پر سود دینے سے کس طرح بچا جا سکتا ہے جو باقی ماندہ دینے سے پہلے ہی لیے جا چکے ہیں۔ یہ مسلم ماہرین کا بہت بڑا کارنامہ ہوگا۔ اگر وہ اس پیچیدہ مسئلے کا کوئی حل تلاش کرنے میں کامیاب ہوگئے۔

ماضی میں نظریہ پاکستان پر خود پاکستان میں بحثیں ہوتی رہی ہیں۔ چنانچہ اگر پیچیدہ مسئلوں کے حل نہ تلاش کیے گئے تو وہ لوگوں کی پھبتیوں کا نشانہ بن جائے گا۔ آج بھی بزنجوؔ، مینگلوں، اور مرّیوں جیسے بہت سے لیڈر ہیں جو علانیہ طور پر صرف مغربی جمہوریت کو پاکستان کے لیے قابلِ عمل قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ اب یہ بات ثابت کرنے کا وقت آگیا ہے کہ دنیا کے لیے اسلامی نظریہ ہی ایک واحد اور موزوں نظریہ ہے۔ پاکستان میں اسلامی نظام کے اعلان کے بعد یہ عقیدہ جڑ پکڑ چکا ہے کہ پاکستان اور اسلام ایک دوسرے کے لیے چولی دامن کی حیثیت رکھتے ہیں اور اس کے ناقدین کو اب معذرت خواہانہ لب و لہجہ اختیار کرنا پڑ رہا ہے۔

مولانا مودودی کو یقین ہے کہ جو قدم اٹھایا جا چکا ہے وہ اب کبھی واپس نہ لیا جا سکے گا۔ اس کے بجائے یہ تحریک مضبوط سے مضبوط تر ہوتی جائے گی اور جلد وہ وقت آئے گا جب پاکستان کا اسلامی نظام دنیا بھر کے لیے نمونہ ہوگا جسے وہ عالمی سطح پر ایک نظام کی حیثیت سے پیش کرنے کی کوشش کرتا رہا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ اسلامی تحریک دنیا بھر میں تیزی سے آگے بڑھ رہی ہے بعض جگہوں پر اُسے پیش رفت حاصل ہوتی ہے جب کہ بعض دوسری جگہوں پر ابھی یہ ابتدائی مراحل میں ہے متعیّن طور پر مولانا کے الفاظ یہ ہیں کہ "بہت کچھ کیا جانا باقی ہے جس چیز کو ہم کامیابی کہہ سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ یہ بات بین الاقوامی سطح پر محسوس کی جانے لگی ہے کہ اسلامی نظام میدان میں آچکا ہے اور آج کے تمام نظاموں کو چیلنج کر رہا ہے چار بر اعظموں میں ہمارے کارکن جہاں جہاں بھی پہنچے ہیں کامیاب ہوتے ہیں وہاں کام آگے ہی بڑھ رہا ہے۔

پاکستان میں اسلامی نظام کے نفاذ کے

سلسلے میں چار حلقوں یعنی زمینداروں، اعلیٰ حکام روسی لابی اور امریکی لابی کی جانب سے مزاحمت ہو سکتی ہے۔

۱۔ پاکستان میں جاگیرداری کا دور دورہ ہے۔ سندھ میں زمینداروں کو وڈیرہ، پنجاب میں جاگیردار اور سرحد میں خوانین اور بلوچستان میں سردار کہا جاتا ہے۔

چاروں صوبوں میں انہیں اقتصادی وسائل اور سیاسی اثر و رسوخ حاصل ہے۔ وہ مختلف سیاسی جماعتوں کی صفِ اوّل میں ہیں۔ ملازمتوں خصوصاً فوج میں بھی یہی صورتِ حال ہے۔

ان کا طرزِ فکر اور طرزِ زندگی مغربی ہے۔ عزت و وقار کے ان کے اپنے معیار ہیں۔ وہ لوگوں میں گھلنے ملنے کو اپنی شان کے منافی تصور کرتے ہیں۔ ان کے بچوں کے اسکول اور کھیل کے میدان علیحدہ ہیں اور ان کے نقطۂ نظر کی طرح ان کے مشاغل اور مصروفیات بھی مختلف ہیں۔

ان کے بچے عموماً گرامر اسکول سینٹ پیٹر اسکول، امریکن اسکول، فورمین کرسچن کالج مرے کالج اور لارنس کالج وغیرہ میں تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ یہاں کا نصاب تعلیم یا تو برطانوی ہے یا امریکی۔

جہاں برطانوی یا امریکی نصاب پڑھایا جاتا ہے ان تعلیمی اداروں میں داخلے کے لیے اچھے نمبر ہی معیار نہیں ہیں بلکہ یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ وہ کسی اعلیٰ خاندان کا چشم و چراغ ہے کہ نہیں۔

قدرتی طور پر لالوکھیت یا لانڈھی کے علاقوں میں رہنے والے عام کلرکوں کے بچے کبھی خواب میں بھی ان اونچے اور مہنگے اسکولوں میں داخلے کی بات نہیں سوچ سکتے۔ ظاہر ہے کہ ان ہی اسکولوں اور کالجوں کے تعلیم یافتہ افراد کو فوج اور سرکاری ملازمتوں میں اعلیٰ جگہوں پر ملازمتیں حاصل ہوتی ہیں۔ چنانچہ یہی وہ بااثر طبقہ اس کے ہم نواؤں کا گروہ ہے جو مختلف شعبہ ہائے زندگی میں صدر ضیاء الحق کی مخالفت کر سکتا ہے اس کی سیدھی سادی وجہ یہ ہے کہ اسلامی نظام ان کے قدیم مفادات اور رہن سہن کے طریقوں پر کاری "ضرب" لگائے گا۔

(۱) جو افسر شاہی آج کل پاکستان کا نظم و نسق چلا رہی ہے وہ پاکستان میں عرصہ دراز سے ایک عوامی اور مستحکم حکومت کی عدم موجودگی کی بدولت نمایاں اثر و رسوخ کی مالک ہے اور اس پر اسلامی اثرات کے بجائے مغربی اثرات غالب ہیں۔ اس

کا برتاؤ، کام کرنے کے طریقے کردار، پسند اور ناپسند
ساری باتیں ویسی ہی ہیں جو کہ انگریزوں سے
ورثہ میں ملی تھیں، اب یہ طبقہ ل، مارکس، میکاولی
اور جنگ جیسی شخصیتوں کا جس قدر علم رکھتا ہے
حضرت علیؓ، امام مالکؒ ابوحنیفہؒ، غزالیؒ اور تیمیہؒ
جیسی ہستیوں کے متعلق نہیں رکھتا، کتنی باصلاحیت
اور مخلص افسروں میں بھی ہمیں ایسے افسر دیکھنے کو
مل جائیں گے جو نظریاتی وابستگی سے کافی دور
ہیں اور اسلام کو رجعت پسند فلسفہ حیات قرار
دیتے ہیں۔

شاید ضیاء الحق کو ان کے عقائد کا بخوبی علم
ہے۔ چنانچہ انھوں نے ایسے حالات پیدا کر دیئے
ہیں جن کے پیش نظر یہ عالی مرتبت افسر اور سکریٹری
اپنے ہی اردلی کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر
کھڑے ہو سکیں کم از کم روزانہ ظہر کی نماز میں ایسا
ہی ہوتا ہے۔

پاکستان سماج کے یہ اجزا اگر تعداد کے
اعتبار سے خاصے کم ہیں مگر پھر بھی اتنے مستحکم ہیں
کہ وہ اسلامی قوانین کی عمل آوری میں رخنے پیدا
کر سکتے ہیں۔

اس لیے مناسب اصلاحات کا سہارا لیے
بنا ان اہم منصبوں پر فائز افسروں کے ہاتھوں اسلامی
نظام کو نافذ کرنا کٹھن ثابت ہو سکتا ہے۔

(۴) زاروں کے زمانے ہی سے روس
بحر ہند تک رسائی کا خواہشمند رہا ہے۔ انقلاب
نے اس کی ہوس کو اور بھی زیادہ تیز کر دیا ہے
بحر ابیض اور جنوب مشرقی ایشیا میں اس کی
حالیہ فتوحات نے کریملن کو اور بھی زیادہ خود
اعتمادی میں مبتلا کر دیا ہے۔ عرصہ دراز سے
بلوچستان اور صوبہ سرحد میں روسی سرگرمیاں
جاری ہیں۔

چونکہ ان صوبوں کی طرف سے غیر مرکز
نظم و نسق کے لیے آواز بلند کی جا رہی ہے۔
اس لیے لازمی طور پر روس بھی ان کے معاملات
میں دلچسپی لے رہا ہے۔ مگر حال ہی میں اس
نے سرحد سے توجہ ہٹا کر سندھ میں زیادہ دلچسپی
لینی شروع کر دی ہے۔ بھٹو کی معزولی کے بعد
پاکستان کی تاریخ میں پہلی بار مرکز کے خلاف
جذبات میں ابھار دیکھنے کو مل رہا ہے۔

پاکستان کے باشعور حلقے روس نواز عناصر
کو کچھ زیادہ اچھی نظروں سے نہیں دیکھتے جن میں
فیض احمد فیض، ڈاکٹر عالیہ امام، رئیس امروہوی،

جان ایشیا (جو مسلمان ہی ہیں) ڈاکٹر وزیر آغا، جوش ملیح آبادی اور عبداللہ شمیم جیسے لوگ شامل ہیں۔

اس حلقہ کے پاس کوئی مکتبہ فکر نہیں ہے نہ ہی کوئی ایسی شخصیت ہے جو عوام کو ابھار سکے سوشلسٹ اب تک جذباتی نعروں، اشتعال انگیز ادب رقتی جلسوں کے ذریعے اپنے فلسفوں کا پرچار کرنے تک ہی محدود رہے ہیں۔ اس لیے پاکستان میں سوشلزم کو تقریباً تمام ہی محاذوں پر پسپا ہونا پڑا ہے، خواہ وہ سیاسی ہو، معاشی ہو یا علمی ہو ۔یہی وہ مایوس کن حالات ہیں جن کے پیش نظر سیاسی مبصرین یہ اندیشہ ظاہر کرتے ہیں کہ روس کوئی ناخوشگوار قدم اٹھا سکتا ہے

(۳) واشنگٹن ایشیا میں ایک شمالی اسلامی حکومت کے "اخوانی" وجود کو کبھی پسند نہ کرے گا۔ امریکی نقطۂ نظر سے پاکستان کی سیاسی صورت حال خطرناک ہے کیوں کہ اس تبدیلی کے بعد پاکستان اسلامی دنیا کے لیے ایک مقناطیسی مرکز بن گیا ہے اور جنوبی ایشیا اور مغربی ایشیا کو متاثر کرنے کی حیثیت میں ہے۔

پاکستان کو یروشلم کے معاملے سے گہرا تعلق ہے۔ مولانا مودودی کا خیال ہے کہ بیت المقدس کو یہودی ریاست کے قبضہ سے بغیر جنگ کے آزاد کرانا ممکن نہیں۔ ان کا اندازہ یہ ہے کہ امریکہ دکھاوے کے لیے ہی اسرائیل پر یہ دباؤ ڈال رہا ہے کہ وہ بین الاقوامی قانون کے خلاف مقبوضہ علاقوں پر قبضہ برقرار نہ رکھنا چاہیے لیکن امریکہ میں صیہونی حلقے صدر کارٹر کو اس بات کی ہرگز اجازت نہ دیں گے کہ وہ اسرائیل کو ان علاقوں سے دستبردار کرنے کے لیے عملاً کوئی دباؤ ڈال سکیں جسے وہ خود اخلاقی طور پر ناجائز تصور کرتے ہیں۔

امریکی حلقوں کو اسلام کا خوف اپنے روسی حریفوں کے ساتھ تعاون کرنے پر بھی مجبور کرتا رہتا ہے۔ یہ کوئی نیا خوف نہیں ہے۔ ایوب خاں کے زمانے میں بھی اس کے آثار پائے جاتے تھے اس وقت پاکستان میں سرمایہ کو غیر پیداواری شعبوں میں کھپانے کے لیے بڑے بڑے منصوبے تیار کیے گئے تھے جیسے کہ لمبی چوڑی عمارتوں کی تعمیرات امریکی پاکستان میں فری میسن، روٹری لائنز، جیم خانہ، کلبوں، ریڈ کراس سوسائٹیوں جیسی تنظیموں اور اداروں کے تحت اب بھی اپنی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے ہیں۔

ہندوستان کے سلسلے میں وہاں عام تاثر یہ ہے کہ وہ خود اپنے دفاع اور مفاد کے پیش نظر پاکستان کو مزید کمزور نہیں ہونے دے گا وہ سوچتے ہیں کہ اگر پاکستان کمزور ہوا تو ہندوستان کو سُرخ اژدہے کی زد سے کوئی محفوظ نہ رکھ سکے گا۔

صدر پاکستان بیرونی لابیوں کی جوڑ توڑ اور ان کے مقاصد کی طرف سے بے خبر نہیں ہیں۔ وہ اسلام کے پھلنے پھولنے کے لیے ایک خوش گوار ماحول پیدا کرنے پر جس قدر توجہ صرف کر رہے ہیں اس قدر اپنے نجی اثر کو بڑھانے پر نہیں کر رہے ہیں اور یہ خوشی کی بات ہے۔

پاکستان میں مخالفوں کی گرفتاریوں کا کوئی ہوّا دیکھنے کو نہیں ملتا اور مارشل لا نام کی کوئی چیز نظر نہیں آتی۔

صدر ضیاء الحق اسلام مخالف قوتوں کے ساتھ سختی سے پیش آنے کے بجائے ترغیب اور تلقین کے طریقوں کو فوقیت دے رہے ہیں قومی اتحاد کے رُکن کی حیثیت سے پاکستانی جماعت اسلامی نے حال ہی میں سماج کی اصلاح کی ایک مہم کا آغاز کیا ہے جس کے اچھے نتائج نکلنے شروع ہو گئے۔ اسلام کے بنیادی تصورات کو پھیلانے کے لیے ریڈیو اور ٹیلی ویژن کو خاص طور پر استعمال کیا جا رہا ہے۔ چوراہوں اور کھلی جگہوں پر جابجا بڑے بڑے بورڈ نصب کیے گئے ہیں۔ جن پر رسول اکرم کے ارشادات جلی حروف میں تحریر ہیں۔ ان میں پڑوسیوں کے حقوق مسلمانوں کے فرائض وغیرہ شامل ہیں۔

ٹیلی ویژن پر جو خواتین خبریں سناتی ہیں انہیں دوپٹے سے سر ڈھکنے کی ہدایت کی گئی ہے اور محکموں کے سربراہوں کو دفتروں میں نماز پڑھانے کی ہدایتیں دی گئی ہیں۔

اس تحریک کی وجہ سے تمام شعبہ ہائے حیات میں اسلام مخالف عناصر کا غلبہ بڑی تیزی سے گھٹتا جا رہا ہے۔

اس وقت پاکستان کی صنعتی بنیاد کمزور ہے اس کی وجہ بدانتظامی نہیں بلکہ سیاسی سطح پر پائی جانے والی ریشہ دوانیاں اور علاقائی وفاداریاں ہیں۔ یہ وبا وہاں شروع ہی سے موجود رہی ہے اور لیڈروں نے اسے ہمیشہ ابتر سے ابتر بنانے کی کوشش کی ہے۔ صدر ایوب نے پاکستان کی صنعتی بنیاد تعمیر کرنے کی کوشش کی تھی۔ ان کے زمانے میں مہاجروں کو بالادستی حاصل ہو گئی تھی جو

مقامی لوگوں کو شاق گزرتی تھی۔ ایک زمانے میں پاکستانی ملوں کا تیار کردہ کپڑا عالمی منڈیوں میں جاپان کے کپڑے سے بھی زیادہ پسند کیا جاتا تھا۔ اب خود پاکستانی بھی اپنے یہاں کا کپڑا استعمال نہیں کرتے۔ اس لیے کہ اس کا معیار گر گیا ہے۔ نفاست معمولی ہوتی ہے اور مضبوط بھی کم ہوتا ہے۔ اس لیے صنعتی زوال کے ساتھ ساتھ افراطِ زر کا بھی غلبہ طاری ہو گیا کیوں کہ بیرونی ملکوں میں کمایا جانے والا سرمایہ ملک میں پہنچنا شروع ہو گیا۔ افراطِ زر جو پہلے ہی کافی پریشان کن تھا۔ اس کے اچانک تیزی سے بڑھنے کا ایک اور سبب یہ بھی تھا کہ مسٹر بھٹو نے خود کو سیاسی طور پر زندہ رکھنے کے لیے فوجیوں اور دیگر سرکاری ملازمین کی تنخواہوں میں زبردست اضافہ کر دیا۔ اب پاکستان کی برآمداتی اشیاء لے دے کے صرف کپاس چاول اور سبزیاں رہ گئی ہیں۔

جے سندھ کا سہرا بھی مسٹر بھٹو کے سر آتا ہے۔ جنھوں نے اپنے ناپاک مقاصد کے لیے جی ایم سید اور شیخ ایاز کو آلۂ کار بنایا۔

پاکستان کا متحدہ محاذ جو ابتداً تو سیاسی پارٹیوں پر مشتمل تھا اب صرف ۶ پارٹیوں کا مجموعہ رہ گیا ہے۔ ان ۶ میں سرگرم جماعتیں صرف ۳ ہی ہیں تحریکِ استقلال جمعیۃ العلمائے پاکستان اور نیشنل ڈیموکریٹ پارٹی نے خود کو متحدہ محاذ سے الگ کر کے لوگوں کی نظروں سے اوجھل کر لیا ہے اور یہ تینوں پارٹیاں اب اپنے اپنے خول میں جا چھپی ہیں اور ان کا پاکستان گیر کردار برقرار نہیں رہا۔

مسلم لیگ۔ جمعیۃ العلمائے اسلام پاکستان ڈیموکریٹک پارٹی۔ خاکسار تحریک مسلم کانفرنس اور جماعت اسلامی پاکستان کا متحدہ محاذ کامیابی سے پھل پھول رہا ہے

جہاں تک کارکنوں کے نظم و ضبط کا تعلق ہے کوئی بھی پارٹی جماعت کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا پاکستان میں کم و بیش سب ہی اعتراف کرتے ہیں۔ پاکستانی جماعت کی ایک اہم کامیابی یہ ہے کہ وہ مسلم لیگ اور جمعیۃ کے ذہنوں سے کئی غلط فہمیوں کو دور کرنے میں کامیاب ہو گئی ہے۔

حال ہی میں جو مفاہمت قائم ہوئی ہے وہ ایک اچھا شگون ہے اور پاکستان کے لیے مبارک ہے جمعیۃ اور جماعت ہی دو ایسی تنظیمیں ہیں جنھوں نے پاکستان میں نظریاتی تبدیلیوں کو وہ فروغ عطا کیا جس کے سبب ملک میں نظامِ اسلام کے نفاذ کا اعلان ممکن ہو سکا۔

نظامِ مصطفیٰ اور مولانا مودودیؒ

ابنِ ظہیر

پاکستان "اسلام" کے نام پر بنایا گیا تھا۔ پاکستان کی تشکیل حکومتِ الٰہیہ کے قیام کے لیے عمل میں آئی تھی۔ اس لیے ساری دنیا کے مسلمانوں کو توقع تھی کہ وہاں اسلامی نظام بروئے کار آئے گا، لیکن پاکستان کے بانی محمد علی جناح کے انتقال کے بعد جلد ہی پاکستانی رہنما اسلامی حکومت کے وعدوں کو بھول گئے۔ انہوں نے پاکستانی سیاست کو لادینیت (Secularism) کی راہ پر چلانا چاہا مگر پاکستانی عوام پاکستان کے قیام کے مقصد کو نہ بھولے۔ انہوں نے یاد رکھا کہ پاکستان کی بنیاد صرف اسلام ہے اور یہاں اسلامی نظام قائم کر کے رہنا ہے۔

چنانچہ قیام پاکستان کے فوراً بعد ہی سے وہ اسلامی دستور کا مطالبہ کرنے لگے۔ اس سلسلے میں انہیں مولانا مودودی اور جماعت اسلامی نے بہت رہنمائی دی۔ اسلامی دستور کے مطالبے کو تیز تر اور مؤثر کرنے میں مولانا مودودی کی کوششوں کا بڑا ہاتھ رہا ہے۔

> پاکستان اور اسلام کا رشتہ لاینفک ہے اور جتنی بھی تحریکیں اُٹھیں وہ سب کی سب اسلام کے رنگ میں رنگی ہوئی تھیں

بہر حال عوامی مانگ اور مولانا کی رہنمائی میں جب یہ مطالبہ بہت زیادہ زور پکڑ گیا تو مولانا شبیر احمد عثمانی نے قرارداد مقاصد مرتب کی۔ اس میں شک نہیں کہ اگر اسلامی نظام کا مطالبہ نہ اٹھایا جاتا اور اُس کے بعد قرارداد مقاصد کا سنگِ بنیاد نہ رکھا جاتا تو نظامِ مصطفےٰ کا اعلان ممکن نہ تھا۔ اس قرارداد سے یہ بات واضح ہوگئی کہ پاکستان اور اسلام کا رشتہ لاینفک ہے اور جتنی بھی تحریکیں اُٹھیں وہ سب کی سب اسلام کے رنگ میں رنگی ہوئی تھیں۔

اس کے باوجود پاکستان کے بڑے بڑے لیڈر پاکستان کو اسلامی حکومت بنانے کے خلاف جدّوجُہد کرتے رہے۔ اُن کا کہنا تھا کہ اگر پاکستان میں اسلامی نظام لانے کی کوشش کی گئی تو پاکستان میں رہنے والے ۹۰ فیصد لوگوں کے ہاتھ کٹ جائیں گے اس بہیمیت کے بعد ہم دنیا کو کیا مُنھ دکھائیں گے۔ اس دَور میں اسلامی نظام کا مطالبہ سخت دقیانوسی ہے لیکن جب دستور سازی کا مرحلہ آیا تو عوامی مطالبہ نے دستور سازوں کے ذہن میں رچی بسی سیکولر قدروں کے باوجود دستور کو اسلام کے رخ میں رکھا۔ غلام محمد اور سکندر مرزا خود سیکولر قسم کے لوگ تھے۔ اُن کی موجودگی میں ۱۹۵۴ء جیسا مسودۂ دستور پاس ہوجاتا پھر اس کے بعد ۱۹۵۶ء میں دستور کا منظور ہونا اسی عوامی مطالبہ کا نتیجہ تھا جسے مولانا شبیر احمد عثمانی کی قرارداد مقاصد اور مولانا مودودی کی رہنمائی سے مدد ملی تھی۔

پھر جب ایوب خاں کا زمانہ آیا اور انہوں نے اسلامی جمہوریہ پاکستان کو صرف پاکستان بنانے کی ٹھانی تو بھی عوامی مطالبات آڑے آئے۔ ایوب لاکھ ڈکٹیٹر تھے مگر عوامی مانگ سے صَرفِ نظر نہ کرسکے اور ۱۹۶۲ء میں جو دستور انہوں نے نافذ کیا۔ اس میں قرارداد مقاصد کی پوری رعایت موجود رہی۔

یحییٰ خاں کے دورِ حکومت میں بھی دستور کا یہ اسلامی پہلو اُجاگر رہا۔

آخر میں جب بھٹو صاحب نے اپنے سیکولر سوشلزم کی تعبیر شروع کی اور ملک کے دستور کو اپنے مقاصد کے لیے موڑنے کی کوشش کی تب بھی دستور قبلہ رُخ ہی رہا۔

پاکستان کی پوری سیاسی تاریخ کو دیکھ جائیے تو آپ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتے

کہ پاکستان میں سیکولر حکومتوں کے دور میں جتنے محاذ اور اتحاد بنے اُن میں نظامِ مصطفےٰ کی مانگ کی حیثیت اساسی رہی۔ ان معاہدہ کرنے والی سیاسی جماعتوں میں عوامی لیگ اور نیشنل عوامی پارٹی جیسی کٹر سیکولر پارٹیاں تک شامل رہیں مگر ہر دور میں پارلیمانی حزبِ اختلاف کا متحدہ مطالبہ اسلامی نظام کے حق میں رہا۔

جنرل ضیاء الحق نے یہ حقیقت پہچان لی۔ اس حیثیت سے وہ حقیقت شناس ہیں لیکن وہ حقیقت ساز نہیں۔ انہوں نے تاریخ کے ایک اہم موڑ پر ایک اہم کردار ادا کیا ہے مگر وہ تاریخ ساز نہیں کہے جا سکتے۔ اُن کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے ملت کے مزاج کو سمجھ کر ایک عوامی مانگ کو قبول کر لیا۔ فوجی ڈکٹیٹر کی حیثیت سے عین ممکن تھا کہ ایوب، یحییٰ اور بھٹو کی طرح وہ بھی اس مطالبے سے صرفِ نظر کر جاتے لیکن قوم اپنے مطالبہ سے نہ ہٹتی۔ وہ اسلام کی دلدادہ تھی، نظامِ مصطفےٰ کی مانگ کر رہی تھی اور نظامِ مصطفےٰ سے کم پر ہرگز راضی نہ ہوتی۔

قوم کو اس مطالبے میں اس قدر مستحکم بنانے میں مولانا مودودی کا زبردست ہاتھ رہا ہے۔ انہوں نے قوم کے لیڈروں سے لوہا لیا اور عوام کو سمجھایا کہ اگر تم نے اس خداداد مملکت میں اسلامی حکومت قائم نہ کی تو وہ مقصد ہی ختم ہو جائے گا جس کے لیے پاکستان قائم کیا گیا تھا۔ اس سلسلہ میں انہوں نے اُن تھک طریقہ پر پروپیگنڈہ کیا، کتابچے لکھے، اسلامی قانون کے خدوخال

> **پاکستان میں سیکولر حکومتوں کے دور میں جتنے محاذ اور اتحاد بنے اُن میں نظامِ مصطفےٰ کی مانگ کی حیثیت اساسی رہی۔**

واضح کیے۔ اس کے قابلِ عمل ہونے کی دلیلیں اور مثالیں دیں۔ ریڈیو پر تقریریں کیں اور لوگوں کو سمجھایا کہ :-

" اسلام دینِ فطرت ہے۔ اسلام اُن اخلاقی قدروں کا داعی ہے جو ہر دور اور ہر زمانے میں جانی پہچانی جاتی رہی ہیں۔ اسلام انہیں کو معروف کہتا ہے۔ انسانی فطرت اُن برائیوں

کو بھی پہچانتی ہے جو انسانی سماج کو گھن کی طرح
کھا جاتی ہیں ۔ انہی برائیوں کو اسلام منکر
کہتا ہے۔

آدمی کی فطرت میں معروف اور منکر کا تصور
فطری طور پر ودیعت ہوا ہے لیکن دنیا میں جو
مختلف اخلاقی نظام پائے جاتے ہیں اس
کی وجہ یہ ہے کہ کائنات اور انسان کے
بارے میں لوگوں کے نظریات میں اختلاف
پیدا ہو گیا۔ اگر سب لوگ کائنات کو اس
کے خالق کے تصور کے ساتھ دیکھتے اور یہ بات
نظر سے اوجھل نہ ہونے دیتے کہ انسان پیدائشی
طور پر اللہ کا بندہ ہے اور اللہ کی رضا
حاصل کرنا اس کی زندگی کا مقصد ہے تو وہ
کج روی میں نہ پڑتا، وہ انسانی اخلاق کی معروف
قدروں کو اپناتا اور منکرات سے دامن بچانے
کی کوشش کرتا۔

اسلام عین انسانی فطرت کے مطابق
ہے۔ یہ ایک خدا پرستانہ اخلاقی نظام قائم
کرتا ہے اور اس اخلاقی نظام کے قیام کا
استقلال اسلام کے سیاسی نظام کے قائم
ہونے پر منحصر ہے۔ اسلامی نظام حیات
* توحید * رسالت اور * آخرت کے
تصور پر مبنی ہے اور اسلام سیاسی نظام
* توحید * رسالت اور * خلافت کے
تصور پر قائم ہے۔

یہی وہ اساسی اصول ہیں جن پر اسلامی
ریاست قائم ہوتی ہے۔ اسلام انسان کو
خدا کا خلیفہ قرار دیتا ہے۔ اس لیے اسے
اپنے اختیارات کو مالک کی مرضی کے مطابق
استعمال کرنا چاہیئے، تاکہ نیابت کا حق ادا ہو۔

خلافت کے منصب پر وہ پورا سماج
فائز ہے جو توحید اور رسالت کے اصول
کو مان کر خلافت کے فرائض ادا کرنے
کو تیار ہو۔ یہی وہ مقام ہے جہاں سے اسلام
میں جمہوریت کی ابتدا ہوتی ہے۔ لیکن یہ جمہوریت
کسی بھی طرح بے لگام سلطانیِ جمہور نہیں ہے۔
بلکہ یہ ہر حال میں خدا کی نیابت ہے۔ یوں
تو اسلامی سماج کے ہر فرد کو خلافت کے حقوق
بھی ہوا [illegible] ہیں اور فرائض بھی ۔ پھر ریاست
کا نظم و [illegible] س چلانے کے لیے جو حکومت بنائی
[illegible]تی ہے وہ احساس ذمہ داری رکھنے والے
[illegible] لوگوں کی مرضی سے بنتی ہے۔ یہ لوگ

اپنے اختیارات خلافت کو نافذ کرنے کیلئے خوب سمجھ کر ایسے متقی اور خدا ترس شخص کو سونپ دیتے ہیں جو ان کے یقین کی حد تک حدود اللہ قائم کرنے کی اہلیت رکھتا ہو۔ وہ ان کی طرف سے خلافت کے فرائض اس وقت تک انجام دیتا ہے جب تک اُسے اپنے مقرر کرنے والوں کا اعتماد حاصل رہتا ہے۔

اسلام جمہوری حاکمیت کا قائل نہیں بلکہ جمہوری خلافت کا علمبردار ہے۔ جمہوری حاکمیت میں عوام بادشاہ ہوتے ہیں مگر جمہوری خلافت میں بادشاہی اللہ کی ہوتی ہے جمہور صرف اُس کے خلیفہ ہوتے ہیں۔ جمہوری حاکمیت میں جمہور اپنا قانون خود بناتے ہیں لیکن جمہوری خلافت میں قانون اللہ کا ہوتا ہے اور اس قانون کا نفاذ خلیفہ کا فرض ہوتا ہے۔ جمہوری حاکمیت میں حکومت کا فرض جمہور کا منشا پورا کرنا ہوتا ہے جمہوری خلافت میں حکومت کو اللہ کا منشاء پورا کرنا ہوتا ہے۔ اس کا مقصد فساد فی الارض کو ختم کرکے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا ایک نظام قائم کرنا ہوتا ہے تاکہ زندگی کے ہر شعبے میں اللہ اور رسول کے پسندیدہ اخلاق اصولوں کی پابندی کی جائے اور حکومت ظلم کے بجائے انصاف کا ذریعہ بنے۔"

> جمہوری خلافت میں حکومت کو اللہ کا منشاء پورا کرنا ہوتا ہے اس کا مقصد فساد فی الارض کو ختم کرکے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا ایک نظام قائم کرنا ہوتا ہے۔

اصل میں مولانا کا کہنا یہ تھا کہ:

"جس طرح ایک انسان اُسی وقت مسلمان ہو سکتا ہے جب وہ کلمہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا زبان سے اقرار کرے۔ اسی طرح ایک حکومت اُس وقت اسلامی حکومت بنتی ہے جب وہ یہ اقرار کرے کہ مالک الملک خدا ہے اور ملک میں اسی کا قانون چلنا ہے۔"

مولانا کی یہ بات پاکستانیوں کے دلوں میں گھر کر گئی۔ رائے عامہ قرارداد مقاصد کے حق میں ہموار

ہوتی گئی اور یہ عوامی مطالبہ بڑھتا رہا کہ حکومت
پاکستان ان اصولوں کو مان لے۔ اس سے حکومت
لرز گئی۔ اس نے مولانا کے خلاف جھوٹا پروپیگنڈا
شروع کیا اور پھر ایک سیاسی سازش ترتیب
دے کر مولانا اور آپ کے ساتھیوں کو جیل میں
بند کر دیا۔ مگر قرار داد مقاصد کا مطالبہ بڑھتا
گیا اور چار و ناچار حکومت نے قرار داد مقاصد
منظور کر لی۔ مگر حکومت غم و غصہ میں مبتلا تھی چنانچہ
جیسے ہی موقع ملا انہوں نے پھر ایک سازش کی اور
ختم نبوت کی تحریک کھڑی کرا دی۔ اس کے بعد
مارشل لا لگا دیا گیا۔ مگر مولانا کی بات پھیلتی جا رہی
تھی۔ جماعت کا اثر برابر بڑھ رہا تھا۔ آخر حکومت
کے ایجنٹوں نے مولانا کو قتل کرنے کی کوشش
کی یہ ۱۹۶۲ء کی بات ہے۔ جب یہ سازش ناکام
ہو گئی تو ۱۹۶۴ء میں مولانا کی جماعت اسلامی کو
خلاف قانون قرار دے دیا گیا۔ مولانا اور آپ کے
ہم نوا لیڈروں کو جیل میں ڈال دیا گیا۔ لیکن پاکستانی
ہائی کورٹ نے اس نظر بندی کو خلاف قانون قرار
دے دیا۔ اور مولانا پھر سرگرم دعوت ہو گئے کہ
" اسلام اور سیاسی اقتدار ۔ دو جڑواں
بھائی ہیں۔"

انہوں نے عوام کے دل میں یہ بات اچھی
طرح بٹھا دی کہ دین و سیاست توأم ہیں اور
ایک کو دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔

اسلام کے نظریہ سیاست کی مزید وضاحت
کے لیے مولانا نے خلافت و ملوکیت کے نام سے کتاب
لکھی جس میں انہوں نے اسلامی خلافت کے
خدوخال کو اجاگر کیا اور بتایا کہ اسلامی خلافت
کن اصولوں پر قائم ہوتی ہے۔

مولانا نے اس کتاب میں بتایا ہے کہ اسلام
کا سیاسی نظریہ قرآن کے تصور کائنات کی اساس
پر قائم ہے اور اس کے موٹے موٹے نکات
یہ ہیں:

الف: کائنات اور انسان اللہ کی خلق ہیں۔
ب: اللہ اپنی خلق کا مالک اور حاکم ہے۔
ج: اللہ کی حاکمیت میں کسی کا کوئی حصہ نہیں۔
د: حاکمیت کے جملہ صفات اور جملہ اختیارات
اللہ کے ہیں۔

اپنے اس اساسی تصور کی بنیاد پر اسلام کا
مطالبہ ہے کہ انسان اپنی زندگی کے اختیاری حصہ
میں بھی اللہ کی بندگی اور اطاعت کرے۔ خدا
اور رسولؐ کے احکام کو مانے کیونکہ وہی سپریم لا

جدید انسانی حکومت کی صحیح صورت یہ ہے کہ اسٹیٹ خدا اور رسولؐ کی قانونی بالادستی تسلیم کر کے اپنے حاکمیت کے زعم سے دستبردار ہو جائے اور اللہ کی نیابت کی حیثیت اختیار کرے۔ اس جائز خلافت کو وہ لوگ چلائیں جنہوں نے اللہ کی حاکمیت کو قبول کر کے ایک اجتماعیت قائم کرلی ہو۔ پھر جب یہ ریاست قائم ہو جائے تو مسلمان اپنا کام باہمی مشورے سے چلائیں۔ اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کو مقدم سمجھ کر اپنے خلیفہ کی اُس وقت تک اطاعت کریں جب تک وہ اللہ کے رسولؐ کا مطیع فرمان رہے۔ اگر مسلمانوں میں کسی امر پر اختلاف رائے ہو تو خدا اور رسولؐ کے قانون کو حکم بنایا جائے۔ عدلیہ ہمیشہ حکومت کے اثر سے آزاد رہے۔ حکومت لوگوں کو :-

* جان و مال اور عزت کا تحفظ دے۔
* امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی آزادی دے۔
* بھلے مقاصد کے لیے اجتماع کا حق عطا کرے۔
* حدودِ ریاست میں رہنے والے غیر مسلموں کو دین و مذہب کی آزادی دے اور انہیں مذہبی دل آزاری سے محفوظ کرے۔

ان حقوق کے بدلے حکومت لوگوں سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے کام، مفادِ عامہ کے منصوبوں نیز دفاعی کاموں میں تعاون مانگے گی اور یہ اس کا جائز اخلاقی حق ہوگا۔

اسلامی ریاست کی خارجہ پالیسی یہ ہوگی کہ عہدوپیمان کا احترام کیا جائے گا۔ زیادتی کرنے والے کے ساتھ اتنی ہی زیادتی کی جائے گی جتنی اُس نے کی ہے ورنہ عام طور پر ریاست صلح پسند رہے گی۔

مولانا کی خوش نصیبی ہے کہ انہوں نے اپنی زندگی میں نظامِ مصطفیٰ کے نفاذ کی تمہید کا مشاہدہ کرلیا۔

ان اصولی باتوں کی تشریح کر کے مولانا نے نمونے کے طور پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دورِ حکومت سے مثالیں دی ہیں۔ پھر بتایا ہے کہ حضورؐ کے انتقال کے بعد مسلمانوں نے جو انتخابی خلافت کا طریقہ اختیار کیا وہ اسلام کے مزاج کے عین مطابق تھا۔ حکومت شوریٰ کے مشوروں سے چلتی تھی اور خلیفہ احساس ذمہ داری اور احساس جواب دہی سے مضطرب رہتا تھا۔ اس کتاب میں مولانا نے اسلامی حکومت کے ختم

(باقی صفحہ ۲۹۶ پر)

نظامِ مصطفیٰ اور مغربی مصنفین

مغربی مصنفین کتنے ہی حق پسند سہی، اسلام کے معاملے میں ہمیشہ متعصب رہے ہیں۔ اُنہیں اسلام کا چرچا ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ اس لیے وہ ہمیشہ اسلام کو بدنام کرنے کی کاوشوں میں لگے رہتے ہیں۔ مغرب زدہ لوگ اُن سے متاثر بھی ہوتے ہیں اور ان حضرات کی تحریروں کو پڑھ کر اسلام کی افادیت پر شبہ کرنے لگتے ہیں۔ مگر اس کے باوجود مسلمانوں میں بیداری پیدا ہوئی ہے بین الاسلامی ضمیر جاگ پڑا ہے۔ اسلامی تحریکیں کامیاب ہو رہی ہیں۔ اور مغرب زدگی کے اثرات کم ہو رہے ہیں۔

اس صورت حال نے مغربی مصنفین کی صفوں میں کھلبلی مچادی ہے۔ پاکستان میں نظام مُصطفیٰ کے قیام کے امکانات اور ایران میں اسلامی جمہوریہ کے قیام سے وہ لوگ سخت وحشت زدہ معلوم ہوتے ہیں۔ اُن کی سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ ان کی اتنی منظم کوششوں کے باوجود اسلامی تحریکیں کیسے زور پکڑ گئیں۔ ابلیس کی مجلس شوریٰ پھر سر جوڑ کر بیٹھی ہے کہ اسلام کے بڑھتے ہوئے اثر کو کیسے دُور کیا جائے۔

اس غور و خوض میں وہ اس مفروضے کو کلیہ مان کر چلتے ہیں کہ دین اور سیاست الگ الگ چیزیں ہیں۔ جیسا کہ بودھ دھرم اور عیسائی دھرم کے ماننے والوں نے طے کر رکھا ہے۔ وہ یہ سوچتے ہیں کہ دین و سیاست کے توافق کا یہ دعویٰ مسلمان کیمپ ہی سے کیوں ہو رہا ہے۔ دوسرے مذہب والے اس قسم کے دعوے کیوں نہیں کرتے۔

حال ہی میں انگریزی اخبار اکنومسٹ Economist نے اسلامی تحریکوں پر جنگجو اسلام (Militant Islam) کے عنوان سے ایک تبصرہ لکھا ہے۔ وہ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ مسلمانوں میں اسلام کے نظام حیات کے اچھے ہونے کا ایک عقیدہ موجود ہے۔ اور اب مسلمانوں میں یہ رجحان بڑھ رہا ہے کہ وہ اپنے سارے مسائل کو اسلامی اصول و مبادی کی روشنی میں حل کرنا چاہتے ہیں کئی مسلمان ملکوں میں اسلامی نظام کے قیام نے ایک مطالبہ کی شکل اختیار کر لی ہے۔ پاکستان میں "چند اہم اسلامی احکام و قوانین" کے نفاذ کا اعلان ہو گیا ہے۔

اُن کے خیال میں اسلامی تحریکوں کی کامیابی کا ایک سبب یہ ہے کہ اسلام نسبتاً جوان مذہب ہے۔ ابھی اس پر بڑھاپا نہیں آیا۔ اس لیے اس کی مقبولیت بڑھ رہی ہے۔ افریقہ اور بعض یورپی ممالک میں تو یہ بہت ہی پسند کیا جا رہا ہے۔ افریقہ اور روین نارک میں بہت لوگ مسلمان ہو رہے ہیں۔ اور ان میں اسلامی بھائی چارے کے چرچے بڑھ رہے ہیں۔ حج نے اُنہیں ایک دوسرے کے اور بھی نزدیک کر دیا ہے۔ ساتھ ہی عرفات کے میدان میں ایسے حج کے دیتے ہوئے خطبات اسلام کی جاذبیت اور کشش کو بڑھا رہے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ یورپ کے سیاسی اور ثقافتی چیلنج کے باوجود اسلامی معاشرہ منجمد ([illegible]) نہیں ہو پایا بلکہ اپنا دفاع کر رہا ہے اور اپنے اس دفاع میں کامیاب ہے اسی لیے پہلے جس تعداد میں مسلمان عیسائی ہوتے تھے اب نہیں ہوتے پوری پچھلی صدی میں زیادہ سے زیادہ دو ہزار مسلمان عیسائی ہوئے ہیں جبکہ عیسائیوں کی ایک بڑی تعداد مسلمان ہوتی ہے۔

ایسا لگتا ہے کہ عالم اسلام پر یورپ کا سیاسی استعمار ختم ہوتے ہی اسلام جاگ اٹھا ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ یورپی استعمار کے ختم کرنے میں علماء نے بہت کام کیا ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ اس صدی کے شروع میں یورپی استعمار کے خلاف جتنی شورشیں ہوئیں اُن میں مسلمانوں کی دینی اور مذہبی تنظیمیں آگے آگے تھیں۔ مراکش کی جدوجہد آزادی ہو یا شام کی جنگ، عراق کی کشمکش ہو یا تونس کا جہاد، لیبیا کی آزادی کی تحریک ہو یا مصر میں استعماری قوتوں کی مخالفت۔ سب

اب مسلمانوں میں یہ رجحان بڑھ رہا ہے کہ وہ اپنے سارے مسائل کو اسلامی اصول و مبادی کی روشنی میں حل کرنا چاہتے ہیں۔

میں مذہبی مسلمان آگے رہے۔

پاکستان تو بنا ہی اس لیے تھا کہ وہاں اسلامی ریاست قائم ہوگی۔ مگر ایران میں اسلامی جمہوریت کا مطالبہ اتنی جلدی ابھرا اور کامیاب ہوا کہ حیرت ہوتی ہے۔

اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا مظہر ان روایات کا احیا ہے جو مسلمانوں نے مغربی تہذیب کے زیر اثر چھوڑ دی تھیں۔ اب مسلمانوں میں پردہ کو پسند کیا جانے لگا ہے۔ عورتیں ایک حد تک چادر پوش ہوتی جا رہی ہیں۔ مرد مادی کلچر سے منہ موڑتے جا رہے ہیں اور قرآن کے احکام کی سنجیدگی سے تعمیل کرنے کی خواہش مند ہیں۔ اب مسلمان یقین کرتے ہیں کہ اسلام ایک مکمل دین ہے۔ (معروف معنوں میں) ایک مذہب (Religion) ہی نہیں بلکہ ایک مکمل ضابطہ حیات بھی ہے۔ وہ مسلمان کی زندگی کے ہر شعبے پر حکمرانی کرنا چاہتا ہے۔ اسلام آدمی کی نجی زندگی ہی نہیں بلکہ اس کی سیاسی اور اقتصادی زندگی پر بھی کنٹرول چاہتا ہے۔ اسلام میں خدا اور قیصر کی تقسیم نہیں، بلکہ اسلامی ریاست ایک ایسی حکومت ہے جس میں حاکمیت اللہ تعالیٰ کی ہو اور سیاست قرآن کی چلے۔ آج کوئی یہ کہے کہ مسلمان لادین (Secular) بھی ہو سکتا ہے تو یہ اجتماع ضدین ہوگا۔

کمال اتاترک ایک مصلح تھا۔ اس نے مسلم ملک ترکی کو لادین سیاست کے راستے پر چلایا لیکن وہ ناکام ہوا۔ وہاں کے لوگوں نے اتاترک کی ساری غیر اسلامی اصلاحوں کو ٹھکرا دیا۔ انھوں نے دینی اخوت پھر سے قائم کر لی اور اسلام کے علمبردار بن گئے۔ اور چاہتے ہیں کہ ان کا سیاسی نظام اسلامی شریعت کی اساس پر مبنی ہو۔ لیکن اسلامی سیاست کا یہ تخیل نیا نہیں ہے۔ یہ پرانا

۔۔ چنانچہ بہت سے مسلم ممالک میں اسلامی ریاست ۔۔۔ نے کی کوشش بار بار کی جاتی رہی ہے ۔ پاکستان اور ایران کے بعد اب مراکش، لیبیا، مصر، ترکی، ملیشیا اور انڈونیشیا۔ سب اسلامی ریاست قائم کرنے کی فکر میں لگے ہیں ۔ سوڈان، اردن اور شام میں اخوان المسلمون اسلامی نظام قائم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں ۔

لیسلام جنگجو مسلم قوم پرستی کا جذبہ ہے کہ نہیں اُٹھا ہے نہ یہ پان اسلامزم ہی ہے ۔ اسلامی نظامِ حکومت کے خدوخال ہمارے زمانے میں یا تو اخوان المسلمون نے واضح کیے ہیں یا مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے یا انڈونیشیا کے ڈاکٹر محمد ناصر اور اُن کی پارٹی نے ۔

عجیب بات یہ ہے کہ یہ سب قوم پرستی کے خلاف ہیں ۔ حالانکہ استعمار کے خلاف جنگ میں اُنھوں نے قومی سطح پر خوب بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا ۔ واقعہ یہ ہے کہ اسلامی مجتہدین نے قوم پرستی کی بجا طور پر مخالفت کی ہے ۔ کیوں کہ یہ ایک سیاسی اور روحانی بدعت ہے جو کسی قوم کی وفاداری کو بانٹ دیتی ہے ۔ جو کہ صرف اسلام کا ہونا چاہیے اُس میں قوم پرستی شریک بن جاتی ہے ۔ اس وجہ سے اُن کے نزدیک آزادی کے بعد کسی قومی ریاست کو اپنی وفاداریوں کا مرکز بنا لینا طاغوت کی پرستش سے کم نہیں ۔ مگر اس سے یہ نتیجہ بھی نہیں نکلتا کہ مسلمانوں کو پان اسلامزم یا (اتحادِ عالمِ اسلام) کو قبول کر لینا چاہیے ۔ اس بارے میں اسلامی مفکّرین کا عقیدہ ہے کہ مسلم ریاستوں کا یہ اتحاد درحقیقت قومی ریاستوں کا لادینی سیاسی اتحاد ہے ۔ ان ریاستوں میں اتحاد کی جو کوشش ہوگی وہ قومی سطح پر ہوگی ۔ اسلامی سطح پر نہیں ہوگی ۔

سعودی عرب بھی مسلم ممالک میں اتحاد قائم کرنے کی کوشش کر رہا ہے ۔ اس کام کے لیے اُنھوں نے ایک مسلم نیوز ایجنسی اور ایک بنک کھولا ہے ۔ لیکن یہ کوشش کامیاب نہیں ہو رہی ہے ۔ ہر ملک کے اپنے قومی مفادات ہیں جس کی وجہ سے اتحاد کا خواب پورا نہیں ہو پا رہا ہے ۔ لیکن اُن کا نصب العین بہر حال اسلامی ریاست کا قیام ہے ۔ اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا جو تصور وہ پیش کرتے ہیں وہ ساتویں صدی کے اسلامی اداروں کے احیاء جیسا لگتا ہے ۔ ان ملکوں میں ایک اور طرح کے لوگ

اسلامی نظامِ حکومت کے خدوخال ہمارے زمانے میں یا تو اخوان المسلمون نے واضح کیے ہیں یا مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے یا انڈونیشیا کے ڈاکٹر محمد ناصر اور ماشومی پارٹی نے۔

بھی ہیں جو پیشہ ور سیاست داں تو نہیں لیکن وہ اسلامی نظامِ حکومت کے قیام کے لیے کوشاں ہیں۔ یہ لوگ ایک نظریاتی گروہ کے قائد ہیں اور ذرائع نشر و اشاعت سے بھرپور کام لے رہے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ سیاست کی بنیاد تو قرآن و حدیث ہی ہیں لیکن آج کی جدید زندگی کے لیے اس کے علاوہ بھی قانون سازی کرنی ہوگی۔ قانون سازی کا یہ دائرہ وہ ہے جو قرآن اور حدیث سے متصادم نہیں ہے۔

ویسے اسلامی ریاست جمہوری ریاست ہوگی اور اس کا سربراہ منتخب سربراہ ہوگا اس پہلو سے دیکھا جائے تو اسلامی تصورات اور مسلمانوں کے عمل میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اس وقت صرف دو مسلم ممالک یعنی ترکی اور ملیشیا میں منتخب حکومت ہے خود سعودی عرب میں شاہی خاندان کی حکومت ہے جو اسلامی اصولوں سے ہم آہنگ نہیں۔

ایک بات بہت واضح ہے۔ مسلمان حکومت نہ تو مغرب کی مادیت کو پسند کرتے ہیں اور نہ کمیونزم کی دہریت کو۔ اُن کی مثالی خارجہ پالیسی ناوابستگی کی ہے۔ یہی پالیسی ہے جس کی طرف ایران کے آیت اللہ خمینی نے اشارہ کیا ہے۔

اقتصادی معاملات میں یہ اسلام پسند طبقہ ہر قسم کے سود کو حرام سمجھتا ہے۔ بنکوں کے جدید نظام کو ناپسند کرتا ہے۔ بلکہ نظمِ زکوٰۃ کو کافی سمجھتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلامی نظام میں ذاتی ملکیت پر کوئی پابندی نہ ہوگی۔

سماجی دائرے میں عورت کو باوقار مقام دیا جائے گا۔ لیکن گھر کے سردھرے بہرحال مرد ہی ہوں گے۔ مصر کے اخوان عورتوں کے باہر نکل کر کام کرنے پر کوئی اعتراض نہیں کرتے مگر پاکستان کی جماعت اسلامی کو عورتوں کے باہر نکل کر کام کرنے پر اعتراض ہے۔ جماعت اسلامی ضبطِ ولادت کے بھی خلاف ہے۔ دونوں جماعتیں

قرآن کے احکام طلاق، تعدد ازدواج اور بدکرداری کی سزا کے بارے میں مضطرب ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ طلاق کو مشکل بنا دیا جائے اور تعدد ازدواج کی قرآنی شرطوں کو اچھی طرح نافذ کیا جائے۔

اسلامی تعزیروں کے سلسلے میں ان لوگوں کی رائے ہے کہ اسلامی معاشرہ میں چوری کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ اس لیے چور کے ہاتھ کاٹنے کی سزا شاذ و نادر ہی ہوگی۔ پھر قرآن کی شرائط کے مطابق جب تک چار چشم دید گواہ نہ ہوں کسی کو زنا کی سزا نہیں دی جا سکتی"

(اکونومسٹ لندن سے تلخیص)

اسلام کی بیداری کی وجوہ معلوم کریں۔ وہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ ہمارے ثقافتی مستقروں میں بغاوت کی لہریں اُٹھ رہی ہیں۔ اور اسی لیے وہ اسلامی تحریکات کے خصوصی مطالعے کی ضرورت سمجھ رہے ہیں۔

حال ہی میں معلوم ہوا ہے کہ صدر کارٹر نے اسلامی تحریکات اور مسلم ممالک میں اُبھرتے ہوتے جنگجو اسلام (Militant Islam) کے بارے میں تحقیق و تفتیش کا حکم دے دیا ہے۔

ہمارے نزدیک یہ بات بڑی خوش

> **اسلامی معاشرہ میں چوری کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ اس لیے چور کے ہاتھ کاٹنے کی سزا شاذ و نادر ہی ہوگی۔**

اس تبصرے کا سرسری مطالعہ ہی اس نتیجہ پر پہنچنے کے لیے کافی ہے کہ ان محقق صاحب کے بعض انکشافات بڑے مضحکہ خیز ہیں۔ لیکن یہ بات واضح ہے کہ اب مغربی مصنفین اور محققین اس بات پر مجبور ہو گئے ہیں کہ عالم

آئند ہے۔ اس ذریعے سے بعید نہیں کہ اللہ تعالیٰ اسلامی نظام کی خوبیاں ان پر منکشف کر دے۔

ہماری دعا ہے کہ ایسا ہو۔

آمین۔

ساحر القادری

اسلامی دستور

ہم سب کا بس ایک خدا ہے، ایک ہے اپنا دین
مفلس ہوں یا دھن والے ہوں، افسر یا مزدور

اپنا مقصد، اپنی منزل اسلامی دستور

مردِ مسلماں کی مت پوچھو قرآں کی تفسیر
گرمی میں شعلوں سے بڑھ کر ٹھنڈک میں کافور

اپنا مقصد اپنی منزل اسلامی دستور

ظلم تو دیکھو پاکستاں میں غلّہ کا ہے کال
چوری ہے اور سینہ زوری رشوت ہے بھرپور

اپنا مقصد اپنی منزل اسلامی دستور

بھوکے ننگے لوگ پھرے ہیں بے گھر ہے مخلوق
دل کے چھالے کھول رہے ہیں رِستے ہیں ناسور

اپنا مقصد اپنی منزل اسلامی دستور

جو بھی ہوگا کر گزریں گے جان رہے یا جائے
مانا وہ ہیں طاقت والے ہم بھی نہیں مجبور

اپنا مقصد اپنی منزل اسلامی دستور

نیکی پر جسم کھول چکی ہے سچائی پر تول چکا ہے
ظلم بڑے اب بول نہ بولے پاپ نہ بن دفسور

اپنا مقصد اپنی منزل اسلامی دستور

"ملّا ازم" پہ ہیں تنقیدیں در پردہ اسلام پہ چوٹیں
دل ہیں سوزِ یقیں سے خالی آنکھیں ہیں بے نور

اپنا مقصد اپنی منزل اسلامی دستور

دین کی خاطر کام کریں گے تن من دھن کی نذر بھی دیں گے
جس کی جیسی ہمت ہوگی اور جتنا مقدور

اپنا مقصد اپنی منزل اسلامی دستور

میدانوں میں خاک اڑے گی باطل کی کچھ بھی نہ چلے گی
ظلم کے شیشے جور کے ساغر ہوں گے چکنا چور

اپنا مقصد اپنی منزل اسلامی دستور

ہم سا ناکارہ شاعر ملت کی آواز پہ حاضر
ایسے ایسے جب ہوں مسافر پھر منزل کیا دور

اپنا مقصد اپنی منزل اسلامی دستور

سرِ خاکِ شہیداں برگہائے لالہ می پاشم

نیل کے ساحل سے کاشغر کی خاک تک ریگستانوں اور قبرستانوں میں آرام کرنے والے اسلامی نوجوانو!

میرے اور تمہارے درمیان کوئی بھی رشتہ نہیں ہے۔ نہ جانے کتنے فاصلے میرے اور تمہارے درمیان حائل ہیں — نہ جانے کتنے میدان — کتنے دریا اور کتنے پہاڑ ہمارے درمیان ہیں — اس کے باوجود یہ کون سا رشتہ ہے جو ایک مہکار بن کر میرے احساسات میں بکھر گیا ہے — اور کیسی عجیب سی رات ہے یہ رات جس میں میرے دل کا گوشہ گوشہ چمکیلے آنسوؤں سے بھر گیا ہے۔

آج رات میں نے نظامِ مصطفیٰ کے نفاذ کا اعلان سنا ہے تو مجھے لگا ہے جیسے تم سب اپنے مرقدوں میں پھوٹ پھوٹ کر رو پڑے ہو، یہ آنسو خوشی کے آنسو ہیں — کیونکہ تمہارے پیروں نے منزل کو چوم لیا ہے۔ مجھے لگ رہا ہے — جیسے زمین کے اس سرے سے اس سرے تک لاکھوں کروڑوں انسانوں کے دل ایک ساتھ دھڑک رہے ہیں — جیسے پیار کے اس بہتے سمندر میں کسی خوشگوار ہوا نے ہلکورے بکھیر دیئے ہیں — جیسے گنبدِ خضریٰ میں کوئی مہربان چہرہ مسکرا اٹھا ہے —

اور اس کے ساتھ ہی میرے ذہن کی اسکرین پر کتنے ہی منظر ابھر آئے ہیں۔ آج کے دن کے لئے — ان لفظوں کو سننے کے لئے میری ملت کی نہ جانے کتنی نسلوں کو آگ اور خون کے سمندر سے گذرنا پڑا ہے — میری کتنی ہی بہنوں کو سرِ بازار رسوا ہونا پڑا ہے — ان کی چادریں گھسیٹی گئی ہیں۔

ــــ ان کے سینوں میں خنجر بھونکے گئے ہیں۔ بوڑھے اور ضعیف والدین کو اپنی جواں اولادوں کا غم کھانا پڑا ہے ــــ لیکن اپنی ان آنکھوں میں سجے ایک خواب کے لیے میری عظیم، میری معصوم اور میری شان دار ملت نے سب کچھ برداشت کرلیا ہے۔

کب سے یہ ملت ان لفظوں کو سننے کے لئے کان لگائے ہوئے تھی۔ شاہ ولی اللہ نے اس کے سپنے دیکھے تھے ــــ سید احمد شہید نے اس کے لئے ارمان سجائے تھے ــــ اور یہ میری خوش قسمتی تھی کہ میرے کانوں نے اس اذانِ حق کو سنا۔

میرے معصوم شہیدو ــــ صدیاں گذر گئی ہیں تمہاری بھولی بھالی قوم کا خون بہتے ہوئے ــــ طنجہ سے جاکرتہ تک ساری زمین تمہاری قوم کے خون سے سرخ ہے ــــ اور سرخ اس لئے کہ وہ مصطفٰے اور نظامِ مصطفٰی کے لئے انتہائی وفادار قوم ہے ــــ صدیوں سے یہ خون رائیگاں جاتا رہا ہے ــــ میرے شہیدو! آج کا یہ اعلان صدیوں سے بہتے آرہے تمہارے خون کی ــــ تمہاری قوم کے خون کی ایک شاندار قیمت ہے۔

میں نے جب بھی اپنی معصوم قوم کی داستان پڑھی ہے میری آنکھیں بھیگ گئی ہیں ــــ آنسوؤں سے لکھی اس تاریخ کو میرے جذبات ہمیشہ پیار کرتے رہے ہیں ــــ اس راہ کی دھول ہمیشہ میری آنکھ کا سرمہ ہے جس کے ایک ایک ذرے میں سید قطب ــــ حسن البنا، ڈاکٹر نذیر احمد اور میرے شہیدو تم جیسے سینکڑوں معصوم بچوں کا خون جذب ہے جو سالہا سال سے تہران ــــ قاہرہ ــــ کراچی ــــ جکارتہ اور کابل کی سڑکوں پر مارے جاتے رہے ہیں ــــ یقین کرو تمہارا خون تمہارے صدق ووفا کی ایک لازوال مہر بن کر زمین کے ذرہ ذرہ میں جذب ہوگیا ہے ــــ تمہارے خون میں لتھڑی اسی خاک سے اسلام کا یہ لہلہاتا چمن سرسبز ہوا ہے۔

میرے معصوم شہیدو
صدیاں گذر گئی ہیں
تمہاری بھولی بھالی قوم کا خون بہتے ہوئے
طنجہ سے جاکرتہ تک ساری زمین تمہاری قوم کے خون سے سرخ ہے

میرے دل میں نہ جانے کب سے یہ تمنا کروٹ لیتی رہی ہے کہ میں کبھی کراچی — تہران — قاہرہ — اور جکارتا کے قبرستانوں سے گذروں — سر جھکا کر تمہاری قبروں پر آنسوؤں کے پھول چڑھاؤں — تمہیں بتاؤں کہ تم کہنے کو مر گئے مگر تمہاری آنکھوں میں سجے پاکیزہ خوابوں کو ایک زندہ تعبیر بننے سے کوئی روک نہیں سکے گا — نہ جانے کب سے میری آرزو ہے کہ خدا اگر میرے بازوں میں طاقت دے تو تمہارا خون بہا ان سازشی طاقتوں سے وصول کروں جنھوں نے تمہاری لاشوں پر اپنے محل تعمیر کرنے کی اسکیمیں بنائی تھیں۔

ہاں مجھے تم ہر وقت یاد آتے ہو — تم معصوم بچو — جن کی آنکھوں کے دیپ اور جن کے ہونٹوں کے چراغ وقت سے پہلے ہی بجھ گئے۔ تم جیالوں کو تمہاری معصومیتوں کو تمہاری وفا [illegible] داریوں کو — تمہاری پاکیزگیوں کو میں بہت ادب اور احترام سے سلام کرتا ہوں ——

نظام مصطفیٰ کا یہ اعلان سن کر مجھے لگا ہے کہ جیسے انتظار کی دھوپ میں تپتی تمہاری پیاسی آنکھیں سیراب ہو گئی ہیں — لیکن پھر بھی عجیب عجیب اندیشے میرے دل کو گھیرے ہوئے ہیں — شاید گذشتہ صدیوں کی تاریخ نے مجھے اپنے سے بھی بے اعتماد کر دیا ہے — میرے دوست مجھے کہتے ہیں کہیں میں قنوطی تو نہیں — خدا کرے ایسا ہی ہو — مگر میرا دل کیوں بار بار اندر سے پکارتا ہے — کیا یہ سب کچھ ایک حقیقت ہے — کیا واقعی تیرہ سو برس سے منہ ڈھانپ کر سونے والی تاریخ جاگ اٹھی ہے۔

کیا یہ سب کچھ ایک حقیقت ہے کیا واقعی تیرہ سو برس سے منہ ڈھانپ کر سونے والی تاریخ جاگ اٹھی ہے

تو کیا اب مزدور کی مزدوری پسینہ خشک ہونے سے پہلے مل جایا کرے گی — کیا اب ایک ضعیف عورت بھی ملک کے سب سے بڑے حکمراں سے احتساب کر سکے گی ؟

تو کیا اب ملک کے حاکم اپنے کو عوام کا خادم سمجھا کریں گے ، راتوں کے اندھیروں میں تفتیش احوال کے لئے گاؤں اور محلوں کا گشت لگایا کریں گے۔

کیا چور بازاری اور دھوکا دہی کے نظارے ہمیشہ کے

لئے ختم ہو جائیں گے۔ کیا خدا اور آخرت کا خوف لوگوں
کے دلوں میں بیٹھ جائے گا۔۔؟

تو کیا اب بادشاہ کا خون غریب کے خون سے
زیادہ قیمتی نہ سمجھا جائے گا۔ کیا اب امیر غریب، اونچے
نیچے۔۔۔ اور چھوٹے بڑے
کا امتیاز ختم
ہو جائے گا محمود
اور ایاز ایک ہی صف میں
کھڑے ہو جائیں گے۔

تو کیا اب غریب کا خون چوس کر کوئی اپنا چہرہ
سرخ نہ کر سکے گا؟ کیا اب نگاہوں میں پاکیزگی اور
جذبوں میں خلوص بھر جائے گا۔

کل تک لال جھنڈے کو سلامی دینے والے آج
اسلام کے رضاکار بن جائیں گے۔

کیا اب شخصیتوں کے بت ٹوٹ جائیں گے؟
اور خدائے واحد کے آستانے کے سوا تمام
سجدہ گاہیں شکستہ ہو جائیں گی۔

کاش ایسا ہی ہو۔۔۔ میرے تھکے
ہوئے ہاتھوں منتظر آنکھوں اور شکستہ زبان
کی یہی دعا ہے کہ اے میرے خدا۔۔۔ کاش
ایسا ہی ہو۔۔۔

کاش یہ ساری زمین خدا کے نور سے جگمگا اُٹھے

کاش ایسا ہی ہو کہ میری آنکھوں میں مسکراتے
خوابوں کی یہ کلیاں تعبیروں کے پھول بن کر چٹک
جائیں۔

قاہرہ۔۔ تہران۔۔ کراچی۔۔ اور
کابل کی سڑکوں پر بکھرا اسلامی خون لالۂ و گل
بن کر لہلہا اٹھے۔

کہ کاش یہ ساری دنیا خدا کے
نور سے جگمگا اٹھے۔

میرے دوستوں کا یہ
الزام کہ میں قنوطی ہوں۔۔ خدا کرے ٹھیک ہو۔۔
میرے سارے اندیشے بے بنیاد ہوں۔۔ کیونکہ اگر
یہ خواب بکھر گیا تو میرے جیسے لوگ شاید آئندہ کئی صدیوں
تک بھی کوئی خواب دیکھنے کی ہمت نہیں کر سکیں گے۔

میرے شہیدو۔۔ میری تاریخ کی میراث تمہارا
خون کاش اب رائیگاں نہ جائے۔۔ سنا ہے سچی
محبت کی آنچ میں تپتے ہوئے آنسو سچے موتیوں سے بھی
قیمتی ہوتے ہیں۔ میری آنکھوں کے یہ آنسو تمہاری مقدس
خاک کے لئے نذر ہیں۔۔ کہ اس سے زیادہ میرے
بس میں کچھ بھی نہیں۔۔۔۔

اِسلام جو دینِ فطرت ہے۔ دنیا کی مادی سیاسی اور سائنسی ترقیات کے ساتھ اُس کی تمام بدلتی ہوئی ضروریات کا کفیل اور زندگی کے ہر گوشہ کے لیے ہدایت نامہ ہے۔ انسان کی اخلاقی، سیاسی تمدنی، روحانی، مادی اور معاشی ضروریات بنیادی طور پر یکساں ہی رہی ہیں۔ اسلام ان ضروریات کی کفالت اور رہنمائی کے لیے واضح اور مستقل اصول فراہم کر دیتا ہے جن کی مدد سے انسان اپنی زندگی کے ہر موڑ پر رہنمائی حاصل کر سکتا ہے۔

اسلام کا سیاسی پہلو

اسلام انسانی اجتماعیات میں واضح رہنمائی دیتا ہے۔ تدبیرِ مملکت اور اصلاحِ اجتماع کے لیے اس کے پاس متعین اصول ہیں جن کے نفاذ سے اسلام کا سیاسی ڈھانچہ ہر معاشرے، ہر دور اور تمدنی ارتقاء کے ہر مرحلے کے لیے موزوں ترین ہے۔ اسلام انسانی حاکمیت کی نفی کرتا ہے، وہ اللہ تعالیٰ کو ہی انسانوں کا حاکمِ اعلیٰ قرار دیتا ہے وہ انسان کو قانون سازی کا اختیار نہیں دیتا۔ انسانی قانون سازی کو وہ شرک اور اپنے مالک کے مقابلے میں بغاوت شمار کرتا ہے۔ اس طرح وہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کا نمائندہ ہونے کی حیثیت سے شارعؑ اور واجب الاطاعت قرار دیتا ہے اور اُن کے حکم سے انحراف کو خدا کے حکم سے انحراف کے مترادف بتاتا ہے۔

اسلام میں نظامِ حکومت شورائی ہے۔ اسلام میں حکومت کا کوئی خاص ڈھانچہ (Form and structure) متعین نہیں ہے۔ البتہ "مشاورت" لازم ہے اور مشاورت کے لیے

پارلیمانی جمہوریت اسلام کے مزاج کے قریب ترین سیاسی سسٹم ہے۔ اس طرح اسلام میں عوام کے نمائندوں کے ذریعے مشاورت کا نظام اور حکومت کا ڈھانچہ قائم کیا جاتا ہے جیسے خلافتِ راشدہ میں قائم تھا۔ انتخاب اور مشاورت اسلامی سسٹم کی جان ہے۔ تحکم، تکبر اور خودسری کے لیے اسلام کے سیاسی سسٹم میں گنجائش موجود نہیں ہے۔ حدود اللہ اس حکومت کے رہنما اصول ہیں۔ وہ کسی صورت میں بھی ان حدود سے تجاوز نہیں کر سکتی۔ اور اگر تجاوز کرے تو اسلامی معاشرہ اُسے معزول کرنے کا حق رکھتا ہے۔

اسلام میں حقوقِ شہریت سب کے برابر ہیں۔ مسلمانوں کے مرد اور عورتوں کے غیر مسلموں کے غرض انسانی بنیادی حقوق سب کے یکساں ہیں۔ ان میں مال و دولت، نسل و رنگ، عہدہ منصب، علاقہ و زبان کسی سبب سے بھی کوئی امتیاز نہیں ہے۔ سب کو شخصی آزادی حاصل ہے۔ ریاست کے اخلاق اور قانونی حدود میں رہتے ہوئے ہر شخص پورے طور پر اپنے ارادے اور مرضی کے مطابق عمل کر سکتا ہے۔ عقیدے اور مسلک کی پوری آزادی حاصل ہے اور اسی آزادی پر خدا کے ہاں جوابدہی کا انحصار ہے۔

اسلامی حکومت نہ کسی طبقے کی حکومت ہے نہ کسی خاندان کی، نہ گروہ کی اور نہ کسی شخص کی۔ یہ اللہ کی حکومت ہے جو اس کے مطیع فرمان نیک بندوں کے ذریعے چلائی جاتی ہے۔

اسلامی حکومت میں اللہ کے سوا ہر کسی کی محکومی اور غلامی سے رستگاری ہے۔ حق گوئی ہر فرد کا شیوہ اور حق پرستی اُس کا شعار ہے۔

اسلامی حکومت میں ہر جان کو مکمل تحفظ حاصل ہے۔ ناحق قتل کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اور لوگوں کی جان اور آبرو سے کھیلنے والوں کے لیے اسلامی حکومت میں کوئی جائے پناہ نہیں ہے۔ اسلامی سیاسی نظام میں تو پارٹی سسٹم کے لیے بھی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ سب مسلمان ایک پارٹی حزب اللہ ہیں۔ ان میں آراء کا اختلاف ہو سکتا ہے اور دو افراد باہمی ایک مسئلہ پر اختلاف اور دوسرے مسئلہ پر اتفاق کر سکتے ہیں کسی مستقل حزب اختلاف کا تصور اسلام کے سیاسی نظام میں موجود نہیں ہے البتہ حق گوئی کا مقام سب سے بلند ہے اور جو فرد یا گروہ حق گوئی کو شعار بناتا ہے وہ جہادِ اکبر کا اجر پاتا ہے اور اسلام میں

ـسے بڑا جہاد یہ ہے کہ ظالم حکمراں کے
ئے کلمۂ حق بلند کیا جائے۔

اسی طرح اسلام میں سیاسی نظام خود
، خدمتِ خلق کا نظام ہے۔ اس میں خلیفۂ
ـ اور رئیسِ مملکت لوگوں کی ضروریات پوری
نے کے لیے گلیوں میں گردش کرنے اور
ـے پر سامان اُٹھا کر لوگوں تک پہنچانے میں
، دریغ نہیں کرتے۔ یہ نظام انسانیت و
ق کی حفاظت کا مضبوط قلعہ ہے۔ یہ کلمۂ حق کو
ری دنیا میں پھیلانے کا عالمگیر مشن ہے۔

لام کا معاشی پہلو

اسلام میں معاش کو معاد کے برابر حیثیت
گئی ہے اور معاش کی درستی پر معاشرے کی
ستی کا انحصار ہے۔ اسلامی ریاست میں بنیادی
ـریات ہر انسان کا بنیادی حق ہیں۔ غذا،
س، رہائش، تعلیم، علاج انسان کی بنیادی
ـروریات ہیں۔ اسلام ان ضروریات کی کفالت
ـود ذمہ لیتا ہے۔ اس لیے کہ اسلام نظام
ـوبیت ہے۔ اسلامی حکومت چونکہ اللہ تعالٰی
، نیابت کرتی ہے اس لیے ہر شخص کے لیے رزق
ـسانی کا فریضہ اسلامی حکومت کو ہی ادا کرنا ہوتا
ہے۔ وہ حکومت اسلامی ہی نہیں ہے جو اپنے
شہریوں کی بنیادی ضروریات اور کفالت کا ذمہ
تو نہ لے لیکن اُن پر حکومت کرنے کا حق جتائے۔

دنیا کے مذاہب میں صرف اسلام ہی ہے
جس نے "مالیات" اور "غریبوں کی کفالت" کو
"زکوٰۃ" کی صورت میں خود ارکانِ دین میں شامل
کیا ہے اور جو شخص "غریبوں کا یہ حق کفالت" ادا
نہیں کرتا اُس کے خلاف اللہ اور اُس کے رسول
کا اعلانِ جنگ ہے اور اسلامی حکومت اس کے
خلاف بغاوت کا مقدمہ قائم کرتی اور اُس کے خلاف
خلیفۂ اول کی طرح جہاد کرتی ہے۔ غریبوں کا یہ حق
کسی صورت، کسی طور اور کسی حالت میں بھی ساقط
نہیں ہو سکتا اور یہ پوری ریاست کے امراء سے
جمع کر کے پوری ریاست کے غرباء پر مسلسل اور
متواتر ہر سال تقسیم کیا جاتا ہے۔ اس طرح اسلامی
حکومت میں غرباء بھی امراء پر ٹیکس عائد کرتے ہیں،
اور یہ اتنا مقدس ٹیکس ہے کہ جس سے کسی صاحبِ
استطاعت کے لیے راہِ فرار نہیں ہے۔

اسلام اپنے معاشی تصورات میں اپنے
شہریوں کو شخصی ملکیت کا حق دیتا ہے لیکن وہ حق
فلاحِ عامہ اور ذرائع حلال سے مشروط ہے۔

معیشت کے سارے ذرائع پر سے اجارہ داری ختم کردی گئی ہے۔ اسلام تقسیم دولت میں مساواتؔ کی بجائے منصفانہ تقسیم دولت کا قائل ہے۔

اسلام دولت کو گردش میں رکھنے کا حکم دیتا ہے اور دولت سمیٹ سمیٹ کر رکھنے کو ناپسند کرتا ہے۔ اور جو سمیٹ سمیٹ کر رکھنے کی کوشش کرے زکوٰۃ اُس کی دولت کو لے کر غریبوں میں تقسیم کردیتی ہے

وَفِیْ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُوْمِ۔

" لوگوں کے مال میں سائل اور محروم کا بھی حق ہے۔"

پھر اسلام انفاق فی سبیل اللہ کے ذریعے بھی مالداروں سے مال وصول کرتا اور اُسے گردش میں لاتا ہے۔

اسلام میں طبقاتی تصور پر معاشرے کی بنیاد نہیں ہے بلکہ اخوت، مساوات، برابری اور برادری پر ہے۔ سب مسلمان بھائی بھائی ہیں اور اُن کے انسانی حقوق محفوظ ہیں۔ اسلام میں بیگار کا تصور بھی نہیں ہے جو شخص بیگار لیتا ہے وہ خدا اور رسولؐ کا مجرم اور حکومت کے سامنے سزا کا سزاوار ہے۔ اسلام میں فرد کو نہ سرمایہ دارانہ نظام کی طرح کھلی چھوٹ ہے کہ جس طرح چاہے استحصال کرے اور نہ سوشلزم کی طرح قید و بند ہے کہ اُس کی اپنی مرضی کا کسی کام میں دخل نہ ہو۔

اسلام کا معاشرتی پہلو

اسلام فرد کو بہت اہمیت دیتا ہے۔ فرد ہی ذمہ دار ہے، وہی دنیا اور آخرت میں مسئول ہے اور اُس کی فلاح و بہبود پر ہی معاشرے کی فلاح و بہبود کا انحصار ہے۔ مرکزِ کائنات انسان ہے اور وہی خلیفۃ اللہ ہے۔ اس لیے اُس کی آزادی پر قدغن اور اُس کی حُریت پر جبر و پابندی ناقابلِ برداشت اور ناقابلِ قبول ہے۔ اس کی عزتِ نفس، آزادئ ضمیر، خودی کی پاسبانی اور انفرادی ذوق کا لحاظ کیا جاتا ہے۔

عورت اور مرد کا رشتۂ ازدواج اسلام کے معاشرتی نظام میں ایک نہایت اہم مقدس رشتہ ہے جس سے انسان اور انسان کی تربیت گاہ خاندان وجود میں آتا ہے۔ اسلام اسے برباد ہونے سے بچاتا اور اُس میں خارجی بےجا مداخلت کو روکتا ہے۔ اس لیے مردوں اور عورتوں میں جنسی اور جسمانی لحاظ سے فرق نے دونوں کے دائرہ کار میں بھی فرق پیدا کر دیا ہے۔ معیشت کا

ذمہ تمام تر مرد کا ہے جو بیرونی مشقت کا کام ہے۔
اور خاندان سازی اور خانہ داری عورت کا کام
ہے جو نہایت نازک اور جذباتی ہم آہنگی اور نفسیاتی
توازن کا کام ہے۔ دونوں ایک دوسرے کی
مدد کے لیے اپنے اپنے دائرہ کار میں کام کرتے
ہیں اور ایک دوسرے کے معاون و مددگار
ہوتے ہیں۔ ہنگامی صورت حال کے سوا دونوں
کے دائرہ کار کو علیحدہ رکھا گیا ہے۔ اگر کسی عورت
کی معیشت کا حقیقی انتظام ختم ہو گیا ہے تو اسلامی
ریاست کا وجود خود بخود اس کی جگہ لے لیتا ہے
لیکن حتی الوسع عورت کو اپنا کام چھوڑ کر معیشت
کے دوسرے دائرے میں داخل ہونے کی مجبوری
میں نہیں ڈالتا۔

اسلام معاشرتی طور پر مردوں اور عورتوں
میں انسانی حقوق کی مساوات قائم کرتا ہے البتہ
انتظامی مقاصد کے لیے مرد کو خاندان میں سربراہ
مقرر کرتا ہے۔ تاکہ انسانی نظام مستحکم بنیادوں پر
قائم رہے اور انتشار کا شکار نہ ہو ورنہ انسانی
سطح پر مرد اور عورت دونوں مساوی بنیادی
حقوق کے حقدار ہیں۔ عورت کی آبرو کی حفاظت
اسلامی معاشرتی نظام کا بنیادی پتھر ہے۔ عورت
کی حفاظت کے لیے اسلام تیغ برّاں کی مانند
ہے اور اس پر ہاتھ اٹھانے والا ہاتھ توڑ دیا
جاتا ہے۔

اسلام شادی بیاہ میں مرد
عورت دونوں کو پسند کا حق
دیتا ہے اور ان کی رضامندی
کو شادی میں اولیت کا
مقام دیتا ہے۔ ولی کو حق
ولایت ضرور حاصل ہے لیکن
جہاں تک پسند اور ناپسند کا
تعلق ہے اسے شریعت نے
مرد اور عورت دونوں کو بطور
حق عطا فرمایا ہے۔

اسلام شادی بیاہ میں مرد عورت دونوں

مختلف علاقوں کے میرے دورے نے اسلام سے محبت و عقیدت کا جو شاندار مظاہرہ کیا ہے وہ اس بات کا بین ثبوت ہے کہ وہ دن دور نہیں جب پاکستان میں حقیقی معنوں میں اسلامی نظام نافذ ہوگا اور مجھے یقین ہے کہ پاکستان ان مقاصد کو ضرور پالے گا جن مقاصد کیلئے یہ ملک معرض وجود میں آیا ہے۔

(صدر پاکستان)

کو پسند کا حق دیتا ہے اور ان کی رضامندی کو شادی میں اولیت کا مقام دیتا ہے۔ ولی کو حق ولایت ضرور حاصل ہے لیکن جہاں تک پسند اور ناپسند کا تعلق ہے اسے شریعت نے مرد اور عورت دونوں کو بطورِ حق عطا فرمایا ہے۔ البتہ البتہ معاشرے میں ذواتیت اور عیش پسندی کی گنجائش نہیں ہے۔

اسلام رشتہ داری اور ہمسائگی کو بہت اہمیت دیتا ہے۔ صلہ رحمی ایک فریضہ ہے جو ہر مسلمان کے ذمے ہے اور جو شخص ہمسائے کو بھوکا چھوڑ کر خود پیٹ بھر کر سو جاتا ہے وہ اپنے لیے اللہ کی شدید ناراضگی مول لیتا ہے۔ خوش خلق ہمدردی، رحمدلی، بھائی چارہ، امداد باہمی وہ صفات ہیں جو اسلام معاشرے کے ہر فرد میں پیدا کرنا چاہتا ہے اور بد خلقی، کجروی، تلخ گفتاری بدزبانی کو ناپسند کرتا ہے۔ اسلام باہمی نیکی کے کاموں میں تعاون کا حکم دیتا ہے اور برائی کے کاموں میں عدم تعاون کا۔ دوستی اور دشمنی کا معیار اللہ کی رضا کو قرار دیتا ہے۔ خرچ کرنے اور کمانے کے لیے بھی پاکیزگی کا معیار قائم کرتا ہے۔ نیکی کا حکم دیتے رہنے اور برائی کو روکتے رہنے کی تلقین کرتا ہے تاکہ پورا معاشرہ نیکی کے قیام میں مصروف رہے۔ اور بدی کے خلاف جہاد میں لگا رہے۔ اس طرح معاشرے میں برائیوں کا استیصال ہو جائے اور نیکیوں کا رواج ہو جائے۔ بدگمانی سے روکتا ہے تجسس سے روکتا ہے۔ حسد، بغض، چغلی، غیبت کی سخت ممانعت کرتا ہے اور بھائی بھائی بن کر رہنے کا سبق دیتا ہے۔ اسلام معاشرے میں ہر فرد کو ظالم کا ہاتھ پکڑ کر اسے ظلم سے روکنے اور مظلوم کی دستگیری اور حمایت کا حکم دیتا ہے۔ اس طرح اسے نیکی اور عدل کا پہریدار بنا دیتا ہے۔ عصبیت میں آکر ناحق طور پر اپنوں کی حمایت سے بھی منع کرتا ہے اور یہ سکھاتا ہے کہ ہر فرد دوسروں کے لیے وہی پسند کرے جو وہ اپنے لیے پسند کرتا ہے — یہی حقیقی اخوت اور بھائی چارہ ہے۔

"اے اللہ! اے ملک وسلطنت کے
مالک! تو جس کو چاہے ملک وسلطنت
دے اور جس سے چاہے ملک وسلطنت
چھین لے۔" (آلِ عمران)

"آسمان وزمین اور ان دونوں کے
درمیان جتنی چیزیں ہیں ان کی بادشاہی
اللہ ہی کے لیئے ہے۔" (مائدہ)

قرآن پاک کی ان آیات کی روشنی میں چند
باتیں معلوم ہو رہی ہیں پہلی بات یہ کہ ساری دنیا
اللہ تعالیٰ کا ملک اور اس کی سلطنت (STATE)
ہے، اور اللہ ساری دنیا اور اس کے تمام باشندوں
کا مالک اور بادشاہ ہے اور سارے انسان اس کی
مخلوق ہی نہیں بلکہ مملوک ورعیت بھی ہیں اور وہی
اپنی سلطنت وملک کا تنہا مالک وحاکم ہے اس
کی مالکیت وحاکمیت میں کوئی شریک نہیں ہے۔ چنانچہ
قرآن شریف میں آتا ہے کہ:۔

"اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی حکمرانی نہیں
ہے، اسی نے حکم دیا ہے کہ اس کے
سوا کسی کی عبادت یعنی پرستش واطاعت
نہ کرو۔" (سورہ یوسف)

"بادشاہی وفرمانروائی میں اس کا کوئی
شریک نہیں ہے اور اسی نے ہر چیز
کو پیدا کیا ہے۔" (فرقان)

دوسری بات یہ ہے کہ جب ساری دنیا
اللہ تعالیٰ ہی کا ملک اور اسی کی سلطنت ہے
اور وہی سارے انسانوں کا مالک وبادشاہ ہے

"اور تمام انسان اسی کی رعیت ومملوک ہیں تو اس کی رعیت اور اس کے ملک وسلطنت میں اسی کے احکام وقوانین چلنا چاہئیں، نہ کہ رعیت کے اپنے احکام وقوانین۔

انسان پر انسان کی بادشاہی وحکمرانی اور اللہ تعالیٰ کی رعیت اور اس کے ملک وسلطنت میں اس کے غیر کا حکم وقانون چلنا نہ صرف یہ کہ ظلم و غضب ہے بلکہ دُنیائے انسانیت کی تباہی وبربادی کا اصلی سبب ہے۔ دنیائے انسانی کو تباہی و بربادی سے بچانے کی کوئی صورت اس کے سوا ممکن نہیں کہ انسان پر انسان کی بادشاہی وحکمرانی نہ ہو بلکہ اللہ تعالیٰ کی بادشاہی وفرمانروائی ہو، خدا کے مُلک اور اس کی رعیت میں خدا ہی کا حکم وقانون جاری ونافذ ہو۔

تیسری بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی سلطنت وملک کا انتظام جب کسی ایک شخص یا چند اشخاص کے سپرد کرتا ہے تو ان میں راہ راست پر وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ کو مالکِ ملک مان کر اس کے قانونِ تکوینی کی طرح اس کی قانونی شرعی کی اطاعت بجالاتے ہیں اور ملک وسلطنت اور اس کے بندوں میں خدا ہی کے احکام وقوانین جاری کرتے ہیں۔ ایسے لوگ قرآن کی اصطلاحی زبان میں "اُولِی الْاَمْر" کہلاتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اولی الامر کی اطاعت کا حکم دیا ہے اور ان کی اطاعت کو خدا اور رسولؐ کی اطاعت قرار دیا ہے۔ جیسا کہ حکم خداوندی ہے۔

"اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسولؐ کی اطاعت کرو اور تم میں جو اولی الامر ہو۔"

اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے:۔

"حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے امیر کی اطاعت کی اس نے میری اطاعت کی اور جس نے امیر کی نافرمانی کی اس نے میری نافرمانی کی۔ (مشکوٰۃ)

دوسری حدیث میں ہے:۔

حضرت ام حصین رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر تم پر ایک نکٹے غلام کو امیر

مقرر کر دیا جائے اور وہ اللہ کی کتاب یعنی قرآن پاک کے مطابق تم پر فرمانروائی کرے تو تم اس کی اطاعت کرو گے۔"

(مسلم)

لیکن آنحضرت محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک اور ارشاد نے ان اطاعتوں کی حقیقت نہایت وسعت و احاطہ کے ساتھ واضح فرما دی ہے۔

"حضرت نواس بن سمعانؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ خالق کی نافرمانی میں کسی مخلوق کے لیے کوئی اطاعت نہیں ہے۔"

(شرح السنۃ)

گویا آمر کے حکم کی اطاعت اس وقت تک واجب ہے جب تک کہ اُن کے کسی حکم کی اطاعت سے خدا اور اس کے رسول کی نافرمانی نہ ہو۔ اگر ان کے کسی حکم کی اطاعت سے خدا اور رسول کی نافرمانی ہو تو اس حکم کی اطاعت سے انکار کر دینا لازمی ہے۔

اللہ تعالیٰ جن لوگوں کو حکومت و سلطنت عطا کرتا ہے ان میں ظالم و غاصب وہ ہیں جو مالک سے باغی ہو کر خود مالکِ ملک بن بیٹھتے ہیں اور خدا کے بندوں اور اس کے ملک و سلطنت میں خدا کے احکام و قوانین کی بجائے اپنے احکام و قوانین جاری کرتے ہیں۔ ایسے لوگ قرآن کی اصطلاحی زبان میں طاغوت کہلاتے ہیں۔

ان کے احکام کی اطاعت اور اُن کے قوانین کی پیروی دراصل مالک حقیقی سے سرکشی و بغاوت ہے۔ فرمانِ الٰہی ہے:۔

"ان حدودِ بندگی سے نکل جانے والوں کے حکم کی اطاعت نہ کرو جو زمین میں فساد برپا کرتے ہیں اور کبھی اصلاح نہیں کرتے۔ (شعراء)

چوتھی بات یہ ہے کہ اسلام مذہب نہیں بلکہ ایک عالمگیر تحریک ہے اور اس تحریک کی شرکت کے لیے جس طرح سب سے پہلے جھوٹے معبودوں کا انکار کرنا اُس کے بعد اللہ ہی کو معبودِ برحق ماننا ضروری ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ ہی کو اپنا اور تمام دنیا کا مالک و بادشاہ ماننا بھی لازمی ہے۔ گویا انسان صحیح معنوں میں مومن ہی نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ انسانی مالکیت و حاکمیت کا انکار کر کے صرف اللہ تعالیٰ ہی کو اپنا اور ساری دنیا کا مالک و حاکم تسلیم نہ کرے۔

"یہی اللہ تمہارا رب ہے۔ ملک اسی

کا ہے، اُس کے سوا کوئی اِلٰہ نہیں آخر تم لوگ کدھر بہکائے جا رہے ہو۔"

پانچویں بات یہ ہے کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کو اپنا اور دنیا کے تمام باشندوں کا مالک و حاکم مان لیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کا آخری رسول تسلیم کرلیں، اُن پر یہ لازم ہو جاتا ہے کہ وہ خود مختاری اور آزادی کا دعویٰ چھوڑ کر زندگی کے ہر شعبے میں مالکِ حقیقی کی نازل کردہ آخری کتاب یعنی قرآن پاک اور اُس کے رسولؐ کی سنت کی پیروی کریں اور خدا اور رسولؐ کے سوا کسی دوسرے کے حکم و قانون کی پیروی نہ کریں۔

"اس دستورِ زندگی کی پیروی کرو جو تمہارے رب کی طرف سے نازل کیا گیا ہے اسے چھوڑ کر دوسرے آقاؤں کی پیروی نہ کرو۔" (اعراف)

ارشادِ نبویؐ ہے:-

"حضرت مالک بن انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مرسلاً مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں تم میں دو چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں جب تک تم ان دو چیزوں کو مضبوطی سے پکڑے رہو گے کبھی گمراہ نہ ہوگے۔ کتاب اللہ اور اُس کے رسولؐ کی سُنّت۔"

تخت یا تختہ

ایک بادشاہ نے اپنے درباریوں سے کہا کہ میرا یہ تخت اس کوٹھری میں، کوٹھری تنگ اور دروازہ چھوٹا ایک درباری نے کہا "حضور تخت بڑا ہے اور کوٹھری چھوٹی ہے۔ یہ تخت اس کوٹھری میں نہیں آسکتا۔" بادشاہ ناراض ہوا اور بولا "تم بے وقوف ہو دیکھو فلاں ملک سے کچھ عقلمند لوگ آئے ہیں وہ کہتے ہیں کہ ہم اس تخت کو اس کوٹھری میں بچھا دیتے ہیں۔ تم جیسے لوگ ہی یہ ایسا نہیں کر سکتے۔" اُن دانشوروں نے اوزار لیے اس تخت کے کونے توڑ تھوڑا سا ادھر سے لیا تھوڑا سا ادھر سے لیا اور تخت کو چھوٹا مختصر کرکے کوٹھری میں رکھ گئے۔ تخت کو تختہ کرکے رکھ دیا۔ اسلام بھی ایک تخت تھا اس کی بھی ایک کیل نکلنے کی اجازت نہ تھی لیکن ہم میں بہت سے لوگوں نے شریعت کے احکام میں ترمیم و انتخاب کرکے اس تخت کو بھی تختہ بنا دیا اور اپنی ضرورت اور مرضی کے مطابق کر لیا ہے۔ (شاہ محمد جعفر ندوی)

عام دینی کتب
ذکرِ خیر ۲/-
دین و شریعت ۵/-
رویت ہلال کا مسئلہ ۴/-
شمائل ترمذی ۱۵/-
صحبتے با اہلِ دل ۹/-
کشف المحجوب ۱۲/-
مکتوبات نبوی ۱۴/-
آپ حج کیسے کریں ۴/-
فتوح الغیب ۱۰/-
حصن حصین۔ چھوٹا سائز ۱۰/-
" " بڑا سائز ۲۰/-
تابعین ۱۳/-
خطبات مدراس ۶/۲۵
تبلیغی نصاب اوّل ۱۸/-
" " دوم ۱۲/-
اسلام مکمل دین -/۶۵
تقدیر کیا ہے؟ ۶/۷۵
مرنے کے بعد کیا ہوگا؟ ۷/۵۰
اسلام کی باتیں ۴/-
ایمان کی باتیں ۴/-
اسلام کی بہادر بیٹیاں ۳/-
اسلام میں عورت کا مقام ۳/-
اصلاح الرسوم ۴/-
الزامات کا جائزہ ۴/۵۰
امت کی مائیں ۳/-
اسلامی خطوط نویسی ۱/۲۰
پیغمبر عالم ۸/-
پردہ کی باتیں ۳/-
پیام انسانیت ۲/۵۰
تاریخ غلاف کعبہ -/۵۰
درس تبلیغ ۳/-
دین کی باتیں ۶/۵۰
رسول اللہ کے معجزات ۴/-
رسول کی باتیں ۳/۵۰
قرآن کی باتیں ۲/-
مولانا مودودی علماء کی نظر میں ۲/-
مواعظ حسنہ ۱۲/-
نشر الطیب ۳/۵۰
مکتبہ الحسنات رامپور یوپی ۲۴۴۹۰۱

بلاسود بینکنگ سے متعلق چند مسائل

نعیم صدیقی

پاکستان میں نظام اسلامی کے قیام کا اعلان ہو چکا ہے۔ اب وہاں بلاسودی بینکنگ کا نظم قائم ہونے والا ہے۔ ذیل میں بلاسودی بینکنگ سے متعلق مسائل پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔

مروجہ نظام بینک کاری کو اگر سود کی بنیاد سے ہٹاکر نفع کی بنیاد پر استوار کر دیا جاتے تو بیشتر معاملات نئی شکل میں بھی بخوبی چل سکتے ہیں۔ مثلاً بلاسود بنک کاری میں رقوم کے انتقال (بذریعہ چیک یا ڈرافٹ) کی خدمت کا معاوضہ بینک اسی طرح لے سکتا ہے جیسے ڈاکخانہ منی آرڈر فیس لیتا ہے بینک لاکر بھی بالمعاوضہ فراہم کر سکتا ہے حکومت کے جاری کردہ قرضوں کی رقوم جمع کرنے یا بعض محکموں کی امانات رکھنے اور بلوں کی وصولیاں کرنے اور اُن کا حساب کتاب رکھنے پر بھی وہ معاوضہ لے سکتا ہے۔ ازاد یا اداروں کے آمد و خرچ کے انضباط کی ذمہ داری لے کر بھی آمدنی حاصل کر سکتا ہے۔ کرنٹ حسابات کے کھاتے کھول کر اُن سے بھی فائدہ اُٹھا سکتا ہے۔ کامرس اور فنانس کے متعلق ازاد یا اداروں کو اپنے ماہرین کے ذریعے اسکیمیں یا مشورے دے کر مناسب اُجرت لے سکتا ہے۔ بنک کے لیے یہ بھی جائز ہے کہ اپنے مستقل مصارف کو چلانے کے لیے کھاتہ داروں سے ہر لین دین (Transactions) پر معمولی

سی فیس وصول کرے۔ جیسے کہ اب بھی ۲۵ پیسے
فی چیک لیے جاتے ہیں۔

اصل مسئلہ سرمایہ کاری کا ہے۔

طویل المیعاد سرمایہ کاری نسبتاً سہل ہے بنک
حکومت کی نفع آور اسکیموں میں اپنا روپیہ لگا سکتا
ہے۔ وہ کارخانوں کے لیے مشینری یا خام مال کی
خریداری میں کسی خاص مدت کے لیے رقوم لگا کر
اس مدت کے نفع ونقصان میں حصہ داری کر
سکتا ہے۔ جائیداد کی خرید فروخت یا ٹرانسپورٹ
یا ایسے ہی دوسرے بڑے کاموں میں سرمایہ
کاری کی راہیں نکال سکتا ہے۔ کسی تاجر یا
کارخانہ دار کے درآمد کردہ مال کی قیمت کی پوری ادائیگی کرکے
مقررہ دنوں میں اس مال کے اٹھائے جانے
پر اس کی موجودہ قیمت فروخت کا حساب لگا کر
اپنا حصۂ منافع حاصل کر سکتا ہے یا اپنی رقم کو
متعلقہ فرم کے پورے کاروبار میں چند یوم
(مثلاً پندرہ دن تا ۹۰ دن یا کم وبیش) کے لیے
شامل کرنے کا معاہدہ کرکے پورے کاروباری
منافع کا حصہ مدت معینہ کے لیے لے سکتا ہے
کارخانوں کے اجرا کے لیے سودی قرض دینے
کے بجائے حصہ داری کے اصول پر کسی خاص
مدت (مثلاً ۱سال، ۵ سال، ۱۰سال) کے لیے
اس فرم پر سرمایہ لگا سکتا ہے کہ یہ سرمایہ اتنی مدت
کی اور اتنی مقدار کی اقساط میں مقررہ عرصہ کے
اندر واپس لے لیا جائے گا۔ مختلف بڑی بڑی
کاروباری فرموں کے حصص کی خریداری کر سکتا
ہے۔ سرمایہ کاری کے سرکاری یا نیم سرکاری اداروں
(جیسے کہ موجود ہیں) کے ذریعے بھی سرمایہ کاری
ہو سکتی ہے۔

برآمد کے مقصد سے خام مال کو جمع کرنے
کے لیے کپاس کے کاروبار کی مثال دی جا سکتی
ہے۔ مثلاً کپاس کا اسٹاک کسی علاقے سے
خریدنے کے لیے کوئی فرم بنک کا ایک لاکھ روپیہ
ادائیگیوں یا پیشگی ادائیگیوں میں لگاتی ہے اس
رقم سے خرید کردہ اسٹاک جب مارکیٹ میں
فروخت کیا جائے گا تو بنک اپنا سرمایہ واپس لیتے
ہوتے منافع میں سے بھی ایک حصہ لیگا۔ اسی
طرح چینی کے کارخانے گنے کا، اور چمڑے
کے کارخانے یا برآمدی تاجر چمڑے کا اسٹاک
مناسب وقت پر خرید کر اس سے جو نفع کماتے
ہیں، بنک اس میں حصہ دار ہوگا۔ ان موٹی موٹی
اجناس کی قیمت فروخت کوئی راز نہیں ہوتی بلکہ

پچھلے سالوں کی شرحیں بھی دیکھی جا سکتی ہیں اور تازہ حالات پر بھی نظر رکھی جا سکتی ہے۔

جتنے کام اب ہوتے ہیں، وہ آئندہ بھی ہوں گے۔ مگر تبدیلی صرف یہ ہوگی کہ سودی قرض کے طور پر سرمایہ لگانے کے بجائے حصہ داری نفع ونقصان کے اصول پر لگایا جائے گا۔ یہ بات اپنی جگہ اہم ہے کہ بنک نہ صرف کسی فرم کے قابلِ اعتماد اور کسی کاروبار کے وجہِ منفعت اور کسی سیزن کے سازگار ہونے کو دیکھے گا بلکہ بعض صورتوں میں وہ اپنے ڈائریکٹروں کو بھی بورڈ آف ڈائریکٹرز میں جگہ دلواتے گا اور تنخواہوں اور دیگر مصارف کے متعلق فیصلے کرنے اور حسابات مرتب کرنے میں شریک ہوگا۔ اتنا ہی نہیں، جہاں کہیں وہ بڑا سرمایہ دے گا، وہاں اپنی شرائط بھی تسلیم کرائیگا

یہاں تک تو سرمایہ کاری زیادہ پیچیدگیاں نہیں رکھتی۔ البتہ قلیل المیعاد سرمایہ کاری کے کچھ مشکلات ایسے ہیں جن کو حل نہ کیا جائے تو ایک بڑا دائرہ کار بند ہو جاتا ہے۔ عملاً ہوتا یہ ہے کہ فکسڈ ڈیپازٹ میں جو سرمائے بنک کے پاس رکھوائے جاتے ہیں۔ ان کے مقابلے میں کہیں زیادہ رقوم محدود وقت کے لیے آتی ہیں۔ محدود وقت کے لیے آنے والی رقوم اگر منفعت بخش ہیں تو بنک کا نفع بہت زیادہ بڑھ جاتا ہے۔ مثلاً کسی بنک کے چلنت حسابات (Current Accounts) میں اگر اوسطاً پانچ لاکھ روپے کی رقوم داخل ہوتی ہیں تو ان میں سے مثلاً تین لاکھ کی رقوم رُکی رہتی ہیں کچھ نکلتی ہیں تو کچھ نئی اُن کی جگہ لے لیتی ہیں اب اگر تین لاکھ روپے کو چھوٹے بڑے پچاس حصوں میں بانٹ کر دیکھا جاتے تو کچھ رقوم دس دن، کچھ ایک ماہ، اور کچھ زائد مدت کے لیے شریک کاروبار رہ سکتی ہیں۔ اور ہر واپس آنے والی رقم دوسرے کاروبار میں لگائی جا سکتی ہے تو ظاہر ہے کہ تین لاکھ روپے سے خاصا کاروباری عمل انجام پاتا ہے۔

مسئلہ صرف یہ ہے کہ لاکھوں چھوٹی چھوٹی فرموں اور عام دکانداروں میں سے ہر ایک پر کیسے اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ ہر ایک کے حالات کو بنک کیسے جان سکتا ہے اور ہر ایک کے حسابات کی وہ نگرانی کیسے کر سکتا ہے کہ کس نے جائز طور پر نفع و نقصان دکھایا ہے اور کس نے ہیر پھیر کر کے اپنے کاروبار میں نقصان ظاہر کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ بنک آنکھیں بند کر کے تو اپنے حصہ داروں کے کھاتے اور کھاتے داروں کی امانات کو ہر کسی کی جھولی میں

میں نہیں ڈال سکتا۔

جب شروع شروع میں نظامِ بنک کاری کو غیر سودی بنیادوں پر چلانے کے لیے میں نے تحریر و تقریر میں کچھ کام کرنا شروع کیا تو کسی مرحلہ پر میرے سامنے یہ سوال رکھا گیا۔ میری عادت ہے کہ کسی بھی معاملے میں جب میرے سامنے کوئی سوال رکھا گیا ہو تو میں اس پر مسلسل سوچتا ہوں اور اس کا حل تلاش کرتا ہوں۔ اس کا حل جلد ہی میرے سامنے نمایاں ہو گیا۔ اجمالاً میں نے اسے کہیں کہیں لکھا ہے مگر تفصیلاً ایک خاکہ پیش کرنے کا موقع نہیں ملا۔ اب جبکہ غیر سودی بینک کاری کو عملاً شروع کر دینے کی گفتگو ہو رہی ہے میں نے یہ محسوس کیا کہ اب تک کسی ایکسپرٹ نے اس الجھن کا حل نہیں نکالا۔ جہاں تک محققین کی کتابوں کا تعلق ہے۔ غالباً ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی (بھارت) کا نام آخری ہے۔ اس میں اس قضیے کو باقاعدہ طور پر چھیڑ کر کوئی مفصل بحث نہیں کی گئی ہے۔ میں ہر چند کہ محقق یا ایکسپرٹ نہیں ہوں، مگر میں نے جو حل سوچا ہے۔ وہ قابلِ عمل ہے۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ اسے غور و فکر کر کے اور زیادہ بہتر بنا لیا جائے۔ میں نے کوآپریٹو بنک کے تجربے کو سامنے رکھا ہے۔ اس بنک کی شاخ جن علاقوں میں قائم ہوتی ہے۔ وہاں جو لوگ بھی اس کے حصہ دار بنتے ہیں وہ سب ایک دوسرے کو جانتے ہیں یہ فیصلہ کرنے کے لیے کہ کسے کتنا قرضہ دیا جائے نہ صرف اس کی جائیداد وغیرہ کو دیکھا جاتا ہے بلکہ لین دین میں اس کے رویے کو بھی۔ پھر کسی بھی شخص کی درخواست پر دو آدمی اس کے بارے میں یہ تصدیق کرتے ہیں کہ اُسے قرض دینے میں کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔ نیز اگر کسی وجہ سے کوئی رقم ڈوب جائے تو اُس کا بار سارے حصے داروں کو اٹھانا پڑتا ہے۔

اس اصول پر اگر ایک قانون کے ذریعے ہر بازار کے دکانداروں اور چھوٹے چھوٹے صنعت کاروں، یا کہیں مناسب ہو تو ایک ٹریڈ کے کاروباریوں۔ مثلاً پریس والوں، کاغذ والوں، یا چمڑے والوں اور ٹمبر مارکیٹ اور سبزی اور فروٹ مارکیٹ میں کام کرنے والوں کو ایک جگہ منظم کر دیا جائے اور ان سب کے اشتراک سے جا بجا کوآپریٹو کمرشل اینڈ ٹریڈنگ برانچز (متعلق بہ فلاں بنک) قائم کر دی جائیں تو معاملہ آسان ہو جاتا ہے۔

ایسی کسی شاخ کے حصہ دار ممبران صرف لیے

کاروباری افراد یا پرائیویٹ فرموں کے چیف ڈائریکٹرز ہوں، جن کے بارے میں اس خاص واسطے کی کم سے کم پانچ پارٹیاں یہ تصدیق کریں کہ یہ دیانتدار کاروباری ہیں اور آڈٹ کرتے ہوئے حسابات رکھتے ہیں۔ یہ حصہ دار اپنی اپنی حیثیت کے مطابق ۱۰۰ سے لے کر ایک ہزار روپے تک کی رقم بنک کے حصص کی خریداری میں لگائیں اور پھر منافع کا ڈو فیصد ہر سال باقاعدگی سے جمع کراتے ہیں۔ بلوں کی پیشگی ادائیگی یا کسی اسٹاک کی خریداری یا کسی دوسری کاروباری ضرورت کے لیے بنک کی شاخ برائے محدود مدت (دس دن یا ایک ماہ) صرف ایسے فریقوں کو رقوم مستعار دے جن کے آڈٹ کیے ہوئے حسابات کی رو سے کم سے کم تین سال سے مسلسل منافع آرہا ہو نیز جن کے لیے کم سے کم دو حصہ داران بنک بطور ضامن سفارش کریں۔ کہ ان کو رقم دی جاسکتی ہے اس طرح مستعار دی گئی رقوم محدود مدت کی سرمایہ کاری یا بالفاظ دیگر عارضی حصہ داری کے لیے دی جائیں گی۔ اگلا مسئلہ یہ ہے کہ ایسی رقوم کے نفع و نقصان کو کیسے معلوم کیا جائے گا۔ ایسی رقوم خواہ ایک بار دی گئی ہو یا دس بار ــــ سب پر نفع و

نقصان کا حساب (سالانہ حسابات تیار ہونے پر لگایا جائے گا۔ مثلاً پچاس ہزار روپے کے کاروبار پر سالانہ منافع اگر اٹھارہ ہزار ہوا تو بنک کے متفرق اوقات میں لگائی ہوئی اوسطاً تین ہزار روپے کی رقم پر ڈو ماہ کے لیے کتنا منافع ہوگا۔ مجموعی طور پر ۱۸۰ روپے بنتا ہے لیکن فرض کیجئے کہ بنک نصف سے کم منافع لیتا ہے۔ ۸۰ روپے اس کے حصے میں آتے ہیں۔ اس کے معنیٰ یہ ہوئے کہ اگر اپنی تین ہزار کی رقم کو بنک ادل بدل کر مختلف ہاتھوں میں دیتا رہے تو اُسے متذکرہ حساب سے سالانہ ۱۶ فیصدی نفع ہوگا۔ اُس میں سے وہ ایک حصہ کھاتہ دار کو ادا کرے گا اور ایک خود رکھے گا یعنی اپنے حصہ داروں کے لیے۔ عملاً منافع اس مفروضہ صورت سے زیادہ ہوتا ہے کیونکہ ۵۰ ہزار کے سرمایہ کی سال میں کئی گردشیں ہوجاتی ہیں۔ اگر ایسی تین گردشیں بھی شمار کی جائیں تو بنک کو متذکرہ عارضی حصہ داری پر ۴۸ فیصدی منافع ملنا چاہیے۔ احتیاطاً اس میں کمی کی جائے تو کم سے کم ۳۲ فیصد منافع کی صورت معتدل ہوگی۔ یعنی جملہ تین لاکھ کی رقم پر ۹۶ ہزار یا تقریباً ایک لاکھ روپے، اوپر ہم نے مثال دیتے ہوئے منافع کے ۱۸۰ روپے میں سے بنک کو

صرف ۸۰ روپے دلوائے ہیں۔ بقیہ رقم میں سے دس
پندرہ یا بیس روپے اگر بنک کی شاخ امداد باہمی
دلیں تو کاروباری لحاظ سے بھی صورت بہتر ہوگی۔
اس طریقے سے مستعار سرمایہ کا فنڈ بڑھ سکتا ہے
بصورت دیگر کم سے کم شاخ کے اخراجات پورے
ہو سکتے ہیں۔

شاخ کے لیے فنڈز کا انتظام بنیادی طور
پر یہ ہوگا کہ اس کے حصہ داروں کی کل رقم کا
تین گنا تک مرکزی بنک سرمایہ کاری کے طور پر
حسب ضرورت دے گا۔ اور اس پر شاخ کے
حاصل کردہ منافع کا ۱/۲ وصول کرے گا۔ ہاں شاخ
کی سفارش پر اس کے علاوہ جو سرمایہ وہ براہ راست
کسی فرم یا کاروبار کے وقتی استعمال کے لیے
دے گا۔ اس پر وہ اپنی شرائط کے تحت فرم
کے منافع میں (مقررہ مدت کے مطابق) حصہ دار
ہوگا۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے ان چھوٹے کاروباریوں
کا جن کے نہ تو حسابات باقاعدہ اور قابل اعتماد
ہوتے ہیں، اور نہ جن کے کاروبار کے متعلق یقین
کیا جا سکتا ہے کہ وہ کس نتیجہ کی طرف جائیں گے۔
ایسے لوگ بنک سے دس دن تک ایک ماہ یا اس
سے زائد عرصے کے لیے مناسب حد تک کا قرض
صرف کفالت یا رہن پر حاصل کر سکیں گے اور
ایسے قرضوں پر منافع نہیں لیا جائے گا۔ اس خاص
شعبے کے لیے بنک قلیل المیعاد سرمایہ کاری کے
کل فنڈ کا مثلاً ۱/۴ حصہ مختص کر سکتا ہے۔ مزید یہ
کہ خود کسی بازار یا مارکیٹ یا ٹریڈ کی شاخ امداد
باہمی بھی پانچسو، ہزار، دو ہزار کی رقوم اپنے اعتماد
اور تعلقات کے دائرے میں کفالت یا اپنے دو
ممبران کی شخصی ضمانت پر قرضہ حسنہ کے طور پر جاری
کر سکتی ہے۔ اسی طرح خسارہ یا کسی حادثے کا شکار
ہونے والے کاروباریوں کو وقتی قرض بلاسود دیا
جا سکتا ہے۔ لیکن قرض دینے کا فنڈ بہر حال محدود
ہوگا، اور قرض لی جانے والی رقوم کا عرصۂ استعمال
کم ہوگا۔ مزید تفصیلات غور و فکر سے تجویز کی
جا سکتی ہیں۔

(۲)

ایک متعلقہ مسئلہ بیمہ کا ہے جس کی ضرورت
کاروباری نقصان کی صورت میں بھی پیش آتی ہے
اور اسی کے لیے مسلمان جہازرانوں نے قرون
اولیٰ میں ایک نظام قائم کیا تھا۔

اس کی سیدھی سادھی شکل ایک ایسے

میوچل سسٹم کی ہے جو سود کے بغیر کام کرے۔ ہر ڈسٹرکٹ یا یہی علاقے کے کاروباریوں کی ایک سوسائٹی بنادی جائے اور بنک ان کو سرمایہ یا آمدنی کے لحاظ سے.... مختلف گروپوں میں تقسیم کرکے ہر گروپ پر ایک مقررہ رقم (مثلاً ۵، ۱۰ یا ۲۵ ماہانہ یا اسی حساب سے سالانہ) بطور چندۂ بیمہ داری کے عائد کردے۔ اس رقم کا ایک بڑا حصہ بنک کے نظام کار کے تحت سرمایہ کے طور پر مختلف راستوں پر استعمال ہوتا رہے گا۔ اور پورے فنڈ پر منافع لگتا رہے گا۔ جب کبھی کسی بیمہ دار کو کوئی خسارہ پہنچے یا کاروبار میں کوئی حادثہ پیش آجائے تو ممبران کا اجلاس نقصان کا جو اندازہ یا مدد کی جو مقدار بہ لحاظ اس کی کیٹیگری کے تجویز کرے۔ وہ اسے مجموعی بیمہ فنڈ میں سے ادا کردی جائے۔ یہ رقم قرض نہیں ہوگی بلکہ امداد ہوگی اور امداد کا سلسلہ اسی طرح چلتا رہے گا۔

بیمہ زندگی کے بجائے ایسے ہی بیمہ فنڈز کفالت پسماندگان کے لیے قائم ہوسکتے ہیں یہی انتظام مکان یا کار یا دیگر جائیداد کی تباہی کی صورت میں کام دے سکتا ہے، اسی لیے بڑھاپے یا معذوری کے دور میں امدادی وظائف جاری ہوسکتے ہیں۔ اسی سے کسی بڑی بیماری کے خرچ یا کسی تاوان یا جرمانے کی ادائیگی کا انتظام ہوسکتا ہے

ایسے فنڈز مختلف مقاصد کے لیے الگ الگ بھی قائم کیے جاسکتے ہیں۔ اور ایک ہی فنڈ سے بھی کام لیا جاسکتا ہے۔ مثلاً دیہاتیوں کے لیے ایسے فنڈ سے جانوروں کے مرجانے کی صورت میں، فصل تباہ ہوجانے کی صورت میں (جب کہ تباہی عام اور وسیع نہ ہو) اور ایسے ہی دوسرے حادثات کی صورت میں امداد بہم پہنچائی جاسکتی ہے

ایسے میوچل بیمہ فنڈ کی دو شکلیں ہیں۔ ایک یہ کہ ہر آدمی کی رقم اس کے نام پر جمع رہے اور جس کسی کو امداد ملے وہ قرض کے طور پر ہو۔ دوسری جسے میں ترجیح دیتا ہوں، یہ ہے کہ ادا کردہ رقوم مستقل امدادی فنڈ میں جمع رہیں۔ اور ممبران میں سے ہر مصیبت زدہ یا حقدار کو اس میں سے مدد ملتی رہے۔ کسی کو دو ضرورت پڑے تو دو دفعہ اور زیادہ مرتبہ استحقاق ہو تو زیادہ مرتبہ امداد دی جائے۔ یہ گویا آئندہ نسلوں تک کے لیے ایک مستقل انتظام ہوگا۔

(۳)

ہاؤسنگ سوسائٹیوں کے سلسلے میں سودی

نظام سے نجات پانے کی ایک شکل میرے سامنے ہے۔ مثلاً فرض کیجیے کہ کوئی سوسائٹی یا خود بنک آپ کے ملکیتی پلاٹ پر ۴۲ ہزار روپے کی لاگت سے مکان تیار کرا دیتا ہے۔ اس سرمایہ کاری میں وہ منافع کے آٹھ ہزار روپے شامل کر کے مکان کی قیمت (پلاٹ کو الگ رکھ کر) پچاس ہزار روپے مقرر کر دیتا ہے وہ آپ کو دس سال کی مدت دیتا ہے۔ اس میں آپ یہ رقم بالاقساط ادا کریں۔ عمارت کی ملکیت آپ کو منتقل ہو جائے گی، خواہ پہلے دن آپ ساری رقم دے دیں خواہ چار سال کی مدت، خواہ دس سال میں۔ اس دوران میں عمارت بنک یا سوسائٹی کی ملکیت میں رہے گی۔ اس کا کرایہ لگے گا، مگر مارکیٹ ریٹ سے کم شرح سے (کیوں کہ جس پلاٹ پر مکان بنا ہے وہ بنک یا سوسائٹی کی ملکیت نہیں ہے) مثلاً دو صد روپیہ ماہوار مکان کی قیمت اگر فوراً ادا کر دی جاتی ہے تو مکان بنا کے دینے والے ادارے کا منافع صرف آٹھ ہزار روپیہ ہوگا۔ اگر قیمت ایک سال میں ادا ہوتی ہے تو آٹھ ہزار منافع کے علاوہ چوبیس سو روپیہ کرائے میں وصول ہوگا۔ اگر دس سال میں ادائیگی مکمل ہوتی ہے تو آٹھ ہزار منافع کے ساتھ ۲۴ ہزار روپیہ کرائے کا آئے گا یہ جملہ ۳۲ ہزار روپے ہوتے ہیں۔ یعنی خرید مکان کے لیے جملہ ۷۴ ہزار روپے کی ادائیگی ہو جائے گی۔

یا بصورت دیگر قطعۂ زمین اور اس پر مکان تعمیر کر کے کوئی سوسائٹی مہیا کرتی ہے۔ فرض کیجیے کہ ایک چھوٹا سا مکان ۳ یا ۴ مرلہ زمین پر تیار کیا گیا ہے۔ اس کی قیمت ۵۰ ہزار ہے (جس میں منافع شامل ہے) سوسائٹی پہلی قسط دس ہزار روپے لے کر آپ کو مکان کا قبضہ دیتی ہے۔ مگر شرط یہی ہے کہ پوری قیمت ادا کر دینے پر آپ کو منتقل ہوگی۔ اس دوران میں آپ کرایہ دار کی حیثیت سے رہیں گے۔ اور اگر آپ اقساط ادا کرتے رہیں تو آپ کو قیمت پوری ہونے تک نکالا نہیں جائے گا۔ دس ہزار روپیہ پیشگی دینے کے بعد ۴ ہزار روپے سالانہ ادا کرنے کے لیے ماہانہ قسط تقریباً ۳۳۳ روپے ہوگی اور کرایہ مکان اگر ۱۶۷ ماہانہ رکھا جائے تو ہر مہینے کُل ۵۰۰ روپے واجب الادا ہوں گے۔

مکان کی مرمت، سفیدی اور حادثاتی شکست و ریخت کے تفصیلی مسائل کے حل تجویز کیے

خوفِ خدا

"لوگو! خدا کے خوف (تقویٰ) کو لازم پکڑو کیونکہ خدا تعالیٰ کا خوف ہر چیز کا بدل ہے مگر اس کا کوئی بدل نہیں۔ لوگو! مجھ سے پہلے کچھ حکام ہوئے ہیں جن کو خوش رکھنا تم اس واسطے ضروری سمجھتے تھے کہ اس کے ذریعہ سے تم ان کے ظلم سے محفوظ رہ سکو۔ لوگو! میں تم سے مال و دولت کو بچا بچا کر نہیں رکھوں گا۔ بلکہ جہاں تک مجھے حکم دیا گیا ہے وہاں وہاں خرچ کروں گا۔ سن لو! خالق کی نافرمانی میں مخلوق کی فرمانبرداری جائز نہیں۔"

(عمر بن عبدالعزیز رح ایک خطبہ)

جا سکتے ہیں۔ نیز اگر سلسلۂ ادائیگی اقساط تعطل میں پڑ جائے تو اس صورت میں بھی راستہ نکالا جا سکتا ہے۔

مسئلہ صرف ایک فقہی طور پر قابلِ بحث ہے وہ یہ کہ بنک یا سوسائٹی کو مکان کی جو جزوی قیمت بصورت اقساط وصول ہوگی وہ چونکہ بمد امانت ہوگی۔ اس وجہ سے بنک یا سوسائٹی اگر کسی

کاروبار میں حصہ داری نفع ونقصان پر لگائے تو اس کا حصہ اقساط ادا کرنے والی پارٹی کو بھی ملنا چاہیے لیکن وہ پارٹی اگر امکانی طور پر نقصان ہونے کی صورت میں بوجھ اٹھانے پر تیار نہ ہو تو اسے تحریری طور پر ادا کردہ اقساط کی سرمایہ کاری کے نتائج کو بنک یا سوسائٹی کو تفویض کر دینا چاہیے۔

کوئی بھی ہاؤسنگ سوسائٹی ڈائریکٹرز پروپرائٹرز یا بڑے حصہ داروں کے علاوہ عام ارکان پر مشتمل ہوگی۔ اور وہ صرف رکنیت قبول کرنے والوں ہی کے لیے تعمیر مکانات کی ذمہ داری لے گی۔ رکنیت کی یکشت فیس ایک صد روپیہ اور سالانہ چندہ پانچ روپے ہوگا تاکہ سوسائٹی کے عام مصارف کی کفالت ہو سکے۔ ہر ہاؤسنگ سوسائٹی کسی نہ کسی بنک سے بذریعہ معاہدہ وابستہ ہوگی۔ اور اپنے سرمایہ کی مقدار اور ڈائریکٹرز، پروپرائٹرز، اور بڑے حصہ داروں کی ساکھ کے مطابق بنک سے سرمایہ حاصل کر سکے گی۔ نیز جوں جوں اس کی کارکردگی کا اچھا معیار سامنے آئے گا، اسے زیادہ سرمایہ حاصل کرنے میں آسانی حاصل ہوگی۔

عبدالقادر عودہ شہید

کیا اسلامی قانون عصر حاضر کے لئے موزوں ہے؟
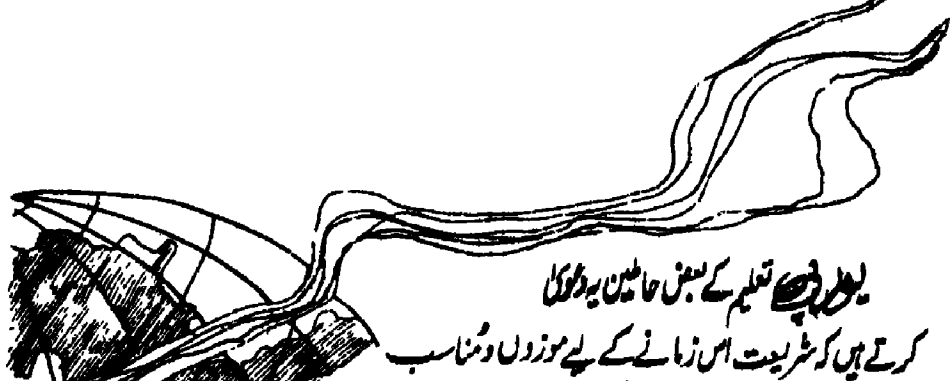
یورپ میں تعلیم کے بعض حاملین یہ دعویٰ
کرتے ہیں کہ شریعت اس زمانے کے لیے موزوں و مناسب
نہیں. لیکن وہ اس ادعاء کی کوئی بھی وجہ بیان نہیں کرتے، یا وہ کہتے
ہیں کہ شریعت کا کوئی خاص مبدا یا بذاتہ اس کے تمام مبادی عصر حاضر کے لیے
موزوں نہیں. اگر وہ اس کی عدم صلاحیت کا کوئی سبب بھی بیان کرتے تو ان کے
ادعا کی کوئی قیمت بھی ہوتی اور منطقی لحاظ سے ان کے اقوال کی توجیہہ و تردید کی جاسکتی
مگر جب وہ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ شریعت پوری کی پوری عصر حاضر میں بے کار ہے اور اپنے
اس دعوی پر ایک دلیل بھی پیش نہ کرسکیں تو سوچنے والے دماغوں کے لیے یہ ایک نرالی بات ہے اور
جب ہم کو یہ معلوم ہو جائے کہ جو لوگ یہ دعویٰ پیش کر رہے ہیں وہ شریعت کے متعلق سب سے کم
واقفیت رکھتے ہیں تو ہمارے لیے جائز ہے کہ ہم ان کے متعلق یہ رائے قائم کریں کہ "ان کا یہ ادعاء
جہالت اور افترا پر مبنی ہے."

اصل میں شریعتوں (قوانین) کی صلاحیت کار ان کے بنیادی تصورات اور ان کے اصولوں کی
صلاحیت پر مبنی ہوتی ہے اور شریعت اسلامیہ میں ایک بنیاد بھی ایسی نہیں کہ اس کو اس کی عدم صلاحیت
کی وجہ سے منسوخ قرار دیا جاسکے. اگر ہم شریعت کے ان بعض اہم مبادی سے یہاں کچھ تعرض نہ کریں

جن پر شریعت کی بنیاد قائم ہے تو ہم کو معلوم ہوگا کہ مسلمانوں کے غلط دعوے اور ان کی جہالت و ناواقفیت کس حد تک پہنچ گئی ہے۔

(ا) مثال کے طور پر شریعتِ اسلامیہ نے لوگوں کے درمیان "مساوات" کا ایک اصول مقرر فرمایا اور اس کے لیے کوئی قید اور شرط نہیں رکھی جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :-

یا ایھا الناس انا خلقناکم من ذکر و انثیٰ و جعلناکم شعوبا و قبائل لتعارفوا ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم (الحجرات : ۳)

" اے لوگو! ہم نے تم سب کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا۔ اور تم کو گروہ اور قبائل میں تقسیم کیا تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ بلاشبہ اللہ کے پاس تم میں سے معزز ترین وہی ہے جو تم میں زیادہ اللہ سے ڈرنے والا ہے۔"

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں :-

الناس سواسیۃ کاسنان المشط الواحد لا فضل لعربی علی عجمی الا بالتقویٰ

" تمام انسان برابر ہیں جیسے ایک کنگھی کے دانت برابر ہوتے ہیں۔ کسی عربی کو کسی عجمی پر کوئی فضیلت نہیں ہے۔ ہاں اگر فضیلت ہوسکتی ہے تو تقویٰ کی وجہ سے۔"

اور شریعت نے یہ اصول آج سے ۱۳۵۰ برس سے بھی زیادہ مدت ہوئی مقرر فرمایا اور وہ قوانین وضعیہ جس پر بعض جہلا گئے نازاں ہیں۔ وہ اصولِ مساوات سے اٹھارویں صدی کے اواخر میں کچھ آشنا ہوئے اور اس وقت سے بڑے بڑے یورپی ممالک اور امریکی حکومتیں اس کی محدود تعبیر اپنے اپنے دائرۂ اثر میں عملاً نافذ کرنے کی کوشش کر رہی ہیں۔

(ب) اور یہ واقعہ ہے کہ شریعت نے یومِ نزول ہی سے حریت اور آزادی کو اپنے بہترین مظاہر کے ساتھ قائم کیا۔ اس نے حریتِ فکر، آزادیٔ عقیدہ، آزادیٔ تقریر کے اصول کو مقرر کیا۔ اس کے بارے میں کئی نصوص موجود ہیں۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :-

قل انظروا ماذا فی السمٰوٰت والارض۔ (یونس : ۱۰۱)

" اے محمد! ان سے کہیے کہ جو کچھ آسمانوں

اور زمین میں ہے اس کا مشاہدہ کرو۔" اور اس کا قول ہے:۔

" وما یذکر الا اولوا الالباب (آل عمران: ۷)

" اور سوائے سمجھداروں کے اور کوئی نصیحت حاصل نہیں کرتا"

اور اس کا قول ہے:۔

ولتکن منکم امۃ یدعون الی الخیر ویامرون بالمعروف وینھون عن المنکر۔

" اور تم میں سے ایک گروہ ایسا ہونا چاہیئے جو خیر کی طرف لوگوں کو بلائے اور معروف کا حکم دے اور منکر سے روکے!"

اور حریت کی اس اصل کو اپنے سرگونہ پہلوؤں کے ساتھ تو انہی وحشی ملکوں والے جانتے ہی نہیں تھے اور کچھ واقف ہوئے بھی تو انقلاب فرانس کے بعد، لیکن ناواقف اور جاہل لوگ شریعت سے اس کے فضائل کو سلب کر کے اسے قوانین وضعیہ سے منسوب کرتے ہیں۔

ج اسی طرح ان مبادی میں جن پر کہ شریعت اسلامیہ قائم ہے۔ ایک مبداء مکمل عدالت بھی ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کے اس قول سے ثابت ہے:۔

واذا حکمتم بین الناس ان تحکموا بالعدل (نساء: ۵۸)

" جب تم لوگوں کے درمیان فیصلہ دو تو عدل و انصاف کے ساتھ فیصلہ کرو۔"

اور اس کا ارشاد ہے:۔

ولا یجرمنکم شنان قوم علی ان لا تعدلوا۔

" کسی قوم کی دشمنی تم کو اس پر آمادہ نہ کرے کہ تم عدل و انصاف سے کام نہ لو"

اور قول باری تعالیٰ ہے:۔

یا ایھا الذین آمنوا کونوا قوامین بالقسط شھداء للہ ولو علی انفسکم او الوالدین والاقربین ان یکن غنیا او فقیرا فاللہ اولی بھما فلا تتبعوا الھوی ان تعدلوا (المائدہ: ۸)

جب تم لوگوں کے درمیان فیصلہ دو تو عدل و انصاف کے ساتھ فیصلہ دو

"اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، ہو جاؤ انصاف کے قائم رکھنے والے اور گواہ اللہ کے لیے۔ اگرچہ یہ عدل و انصاف کا رویہ تمہارے نفس، والدین یا قریبی رشتہ داروں کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ اگر وہ مالدار یا غنی ہوں تو اللہ تعالیٰ سے خوف و اُمید ان سے زیادہ پیشِ نظر رہنی چاہیئے۔ خواہشاتِ نفس کی پیروی نہ کرو کہ وہ تمہیں راہِ راست سے منحرف نہ کر دے۔"

اور یہ وہ مبادی ہے جس کو شریعت اپنے یومِ نزول سے لے کر آئی ہے جس سے قوانین وضعیہ اٹھارویں صدی کے اواخر سے پہلے واقف ہی نہیں تھے۔

یہ وہ تین مبادی ہیں جن کی اساس پر موجودہ قوانین وضعیہ قائم ہیں۔ شریعت ان قوانین سے بہت پہلے کوئی ۱۱سو سال پہلے ہی واقف تھی تو پھر بتلایا جائے کہ جب قوانین وضعی عصر حاضر کے لیے موزوں و سازگار ہیں تو شریعت کیوں نہیں ہے حالانکہ وہ مبادی کی مستحکم بنیاد پر قائم ہے۔

اور شریعت اسلامیہ اپنے نزول کے دن ہی سے شوریٰ کے مبدا و اصول کے ساتھ آئی ہے اور اس کے لیے اللہ تعالیٰ کا قول ہے کہ:

"وامرھم شوریٰ بینھم" "وشاورھم فی الامر" اور اس معاملہ میں بھی شریعت اسلامیہ قوانین وضعیہ سے کوئی ۱۱سو سال پہلے ہی اپنے معاملات کو اس بنیاد پر قائم کر چکی ہے۔ لیکن قانونِ انگلستان نے شریعت کے ایک ہزار سال بعد اس بنیاد کو قبول کیا۔ اس لحاظ سے شوریٰ کے اصول کو قبول کرنا جیسا کہ قانونِ وضعیہ نے کیا، کوئی نئی بات نہیں تھی۔ اصل میں جہاں سے شریعت نے اپنا آغازِ کار کیا تھا وہاں پر یہ قوانین پہنچ کر رُک گئے ہیں۔

شریعتِ اسلامیہ اپنے یوم نزول سے ہی حاکم کے اختیارات کی تقیید اور تحدید کو لے کر آئی ہے اور اس کی حیثیت امت کے نائب اور ذمّہ دار کی مقرر کی ہے، اور مظالم نیز خطاؤں کے لیے اس کو ذمّہ دار اور جواب دہ قرار دیا ہے۔ شریعت حاکم اور غیر حاکم دونوں پر یکساں نافذ ہوتی ہے اور حاکم اپنے کاروبار اور تصرفات میں شریعت کے سارے احکام کا پابند ہے اور اس کو محکومین پر کوئی امتیاز حاصل نہیں ہے یہ سب کچھ مساوات کے نظریہ کا عملی انطباق ہے۔

اور بلاشبہ شریعت ان مبادی کے ساتھ جن پر کہ عصر حاضر کی حکومتوں کی بنیاد رکھی گئی قوانین وضعیہ کے ان مبادی سے واقف ہونے کے کوئی ۱۱ سو سال پہلے آئی ہے تو پھر کس طرح کہا جاسکتا ہے کہ شریعت عصر حاضر کے لیے ناکارہ ہے شریعت اسلامیہ تحریم خمر اور طلاق کی اباحت کو لے کر آئی ہے، جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:۔

یا ایھا الذین اٰمنوا انما الخمر والمیسر والانصاب والازلام رجس من عمل الشیطان فاجتنبوہ (المائدہ: ۹۰)

”اے ایمان لانے والو! بے شک شراب اور جوا اور بت اور پانسے کے تیر گندگیاں ہیں اور عمل شیطانی ہیں پس تم ان سے بچے رہو۔“

الطلاق مرتان فامساک بمعروف او تسریح باحسان (البقرہ: ۲۲۹)

”طلاق دوبارہ ہے۔ پھر عمدہ طریقہ سے بیوی کو روک رکھیں یا پھر احسان کے ساتھ چھوڑ دیں۔“

اور قوانین وضعیہ کے بنانے والے شراب کی اور طلاق کی اباحیت سے صرف اس صدی میں واقف ہوئے ہیں۔ ان میں بعض قوانین تو شراب کو مطلقاً ناجائز قرار دیتے ہیں اور بعض اس کی جزوی طور پر تحریم کرتے ہیں اور ان میں سے بعض طلاق کو بغیر کسی قید کے مباح قرار دیتے ہیں اور بعض اس کو مقید و مشروط کرتے ہیں تو پھر وہ قوانین اس زمانے کے لیے موزوں کیسے ہو گئے جو شریعت سے لے گئے ہیں اور خود شریعت کیوں ناموزوں ہے؟ شریعت اسلامیہ پہلی شریعت ہے جس نے تعاون اجتماعی اور تکافل اجتماعی کے نظریہ کو پیش کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا قول ہے:۔

وتعاونوا علی البر والتقویٰ ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان۔ (المائدہ: ۲)

”نیکی اور تقویٰ میں ایک دوسرے کی معاونت کرو گناہ اور زیادتی میں تعاون نہ کرو۔“

ارشادِ خداوندی ہے:۔

والذین فی اموالھم حق معلوم للسائل والمحروم (المعارج)

"یہ وہ لوگ ہیں جن کے مالوں میں حقِ معلوم ہے مانگنے والوں کے لیے اور محروم کے لیے۔"

اور اس کا ارشاد ہے :-

خذ من اموالهم صدقة تطهرهم وتزكيهم بها

ان کے اموال میں سے بطور صدقہ کے لیتا کہ تم ان کو اس کے ذریعہ پاک صاف کرو۔ (توبہ :)

اور اس کا ارشاد ہے :-

انما الصدقات للفقراء والمساكين والعاملين عليها والمؤلفة قلوبهم و في الرقاب والغارمين وفي سبيل الله وابن السبيل فريضة من الله والله عليم حكيم (التوبہ : ۱۰۱)

"سوائے اس کے کچھ نہیں کہ صدقات (زکوٰۃ) فقراء، مساکین، عاملین، مولفۃ قلوب اور غلاموں کی آزادی اور قرض داروں اور اللہ کے راستے اور مسافروں کے لیے ہے۔ یہ اللہ کی طرف سے فرض ہے اللہ جاننے والا اور حکمت والا ہے۔"

اور قول باری تعالیٰ ہے :-

ما افاء الله على رسوله من اهل القرى فلله وللرسول ولذي القربى واليتامى والمساكين وابن السبيل كى لا يكون دولة بين الاغنياء منكم. (الحشر: ۷)

"جو کچھ بطور فئی دیا ہے۔ اللہ نے اپنے رسول کو آبادیوں سے وہ اللہ کے لیے اس کے رسول کے لیے ہے، اور اس کے رسول کے رشتہ داروں کے لیے اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں کے لیے تاکہ وہ مالداروں کے درمیان ہی گردش نہ کرتا رہے۔"

اور شریعت نے ان دونوں نظریوں کو ۱۳۷۵ سال ہوئے رواج دیا اور عالم اسلامی کے علاوہ دیگر لوگوں نے اسے صرف اس صدی میں معلوم کیا ہے اور اس کا بھی محدود حد تک انطباق کیا ہے اور شریعت احتکار کو حرام قرار دیتی ہے اور ضروری اشیاء کی مصنوعی طور پر قیمتیں چڑھانے کو بھی حرام قرار دیتی ہے اسی طرح رشوت کو بھی۔ حضور فرمایا کرتے تھے سوائے خطاکار کے اور کوئی احتکار نہیں کرتا اور اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

ولا تاکلوا اموالکم بینکم بالباطل وتدلوا بھا الی الحکام لتاکلوا فریقا من اموال الناس بالاثم وانتم تعلمون (البقرہ:)

"نہ کھاؤ تم اپنے اموال آپس میں غلط طریقے سے اور اسے پہنچاؤ تم حکام تک۔ تاکہ تم لوگوں کے مال کا ایک حصہ کھاؤ گناہ کے ذریعہ اور تم جانتے ہو۔"

اور یہ وہ مبادی ہیں جن کو قوانین وضعیہ کے واضعین بہت بعد کو معلوم کرسکے۔

اور شریعت ظاہری اور باطنی ہر قسم کے فواحش کی تحریم پر قائم ہے نیز گناہ اور بغیر حق بغاوت کو بھی وہ حرام قرار دیتی ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کے اس قول سے ہے:۔

قل انما حرم ربی الفواحش ما ظھر منھا وما بطن والاثم والبغی بغیر الحق (الاعراف)

"کہیئے بے شک میرے رب نے بے حیائی کی باتوں سے روکا ہے۔ وہ کھلی ہو یا ڈھکی اسی طرح گناہوں سے نیز ناحق کی سرکشی سے۔"

اور شریعت دعوت للخیر یعنی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر قائم ہے جیسے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

ولتکن منکم امۃ یدعون الی الخیر ویامرون بالمعروف وینھون عن المنکر

"اور تم میں سے ایک جماعت ہونی چاہیئے جو خیر کی طرف دعوت دے اور منکر سے روکے۔"

اور یہ مبادی ہیں جن پر شریعت قائم ہے اور یہ وہ آئیڈیل تصورات ہیں جن کی طرف انسان پرواز کرسکتا ہے اور جہاں انسانیت کا خواب شرمندۂ تعبیر ہو سکتا ہے۔ پس کس طرح شریعت اس زمانے کے لیے موزوں نہیں ہو سکتی جبکہ اس کے مبادی کے اندر اس کا شاندار روشن

نیکی اور تقویٰ میں ایک دوسرے کی معاونت کرو گناہ اور زیادتی میں تعاون نہ کرو

قانون کی خلاف ورزی: خلیفہ ابو العباس

سفاح کا بھائی منصور جو بعد ابو جعفر منصور کے نام سے خلیفہ ہوا ایک منزل پر اترا۔ ملکی قانون کے مطابق اس جگہ پر قیام کرنے کے لیے دو درہم محصول دینا پڑتا تھا۔ منصور اُن دِنوں طلبِ علم میں سفر کر رہا تھا۔ اس نے بہتیرا کہا کہ میں خلیفہ کا بھائی ہوں۔ رسول اکرم کے چچا کی اولاد سے ہوں مجھ سے محصول وصول نہ کیا جائے لیکن چوکیدار نہ مانا۔ اس نے منصور سے کہا: میں آئین اور قانون کی خلاف ورزی نہیں کرسکتا۔ آپ دو درہم دیکر بڑی خوشی سے قیام کریں۔

جھلک رہا ہے اور اگر ہم اُن انسانی اجتماعی اور قانونی مبادی کی تلاش کریں جن پر عصر حاضر اور اس کے باشندے فخر کرتے ہیں تو ہم ایک ایک کرکے ان سب کو بہترین شکل وصورت میں شریعت کے اندر پاتے ہیں اگر طوالت کا اندیشہ نہ ہوتا تو ان مبادی ونصوص کے ایک اور حصے کا یہاں تذکرہ کرتا جس سے یہ حقیقت اور کھل جاتی۔ اس طرح یہ بات صاف ہوگئی ہے کہ شریعت کے عدم صلاحیت کا ادعا شریعت سے ناواقفیت کی بنیاد پر قائم ہے اور عالم محسوسات میں اس کی کوئی حقیقت نہیں اور شاید وہ واحد عذر جس کو یہ مدعی حضرات پیش کرسکیں یہ ہو کہ انہوں نے یہ تعلیم حاصل کی ہے کہ قدیم قوانین وضعیہ پرانے اور بوسیدہ مبادی پر قائم تھے جن کو عصرِ حاضر کی منطق نے رُد کر دیا ہے۔ لہذا انہوں نے اس سے یہ ایک عام قاعدہ اخذ کر لیا کہ ہر قدیم قانون قابلِ رُد ہے اور چونکہ شریعت بھی قدیم ہے اس لیے اُسے بھی رُد کرنا چاہیئے۔ افسوس کہ انہوں نے شریعت اور وضعی قوانین کے درمیان مندرجہ بالا فرق پر اچھی طرح غور وفکر نہیں کیا۔

——— بقیہ: نظام مصطفیٰ ... ———

ہونے کے المیہ کا بھی تذکرہ کیا ہے اور ان اسباب پر روشنی ڈالی ہے جو خلافت کے ختم ہونے کا سبب بنے۔ مقصود یہ تھا کہ اب جب حکومتِ الٰہیہ قائم ہو تو اُن غلطیوں سے اجتناب کیا جائے جو سابق میں خلافت کو منہاج نبوت سے ہٹانے کا سبب بنی تھیں۔

مولانا کی خوش نصیبی ہے کہ انہوں نے اپنی زندگی میں نظام مصطفیٰ کے نفاذ کی تمہید کا مشاہدہ کر لیا۔ ع

ہزار شکر کہ دیکھے ہیں پھر بہار کے دن

عروج قادری

نغمۂ رحیل

سنبھل رہے ہیں نوجواں بدل رہا ہے اب سماں
قیام اب یہاں کہاں رواں دواں ہے کارواں
بڑھو، بڑھو، بڑھے چلو

بڑھو مثالِ سیل تم نہ لاؤ دل پہ میل تم
نہ لاؤ دل پہ میل تم تمھیں ہو میرِ کارواں
بڑھو، بڑھو، بڑھے چلو

اگر ہو کم تو خوف کیا ہے اصل چیز حوصلہ
کٹھن ہے گرچہ مرحلہ تمھیں ہو حق کے پاسباں
بڑھو، بڑھو، بڑھے چلو

یہ کیسی دیکھ بھال ہے یہ کوہ پائمال ہے
یہ جوش لازوال ہے بڑھاؤ اسپِ خوش عناں
بڑھو، بڑھو، بڑھے چلو

جہاں کے لب پہ آہ ہے بحالتِ تباہ ہے
تمھیں پہ اب نگاہ ہے کرو نہ وقت رائگاں
بڑھو، بڑھو، بڑھے چلو

رباب و چنگ توڑ دو نشاط و رنگ چھوڑ دو
سبو و جام پھوڑ دو سنوار دو چلے کہاں
بڑھو، بڑھو، بڑھے چلو

وقارِ ملک و دیں ہو تم فلک ہو تم زمیں ہو تم
عرب کے خوشہ چیں ہو تم شہِ عرب کے مدح خواں
بڑھو، بڑھو، بڑھے چلو

کرو نہ فکر آن و این کہ تم ہو صاحبِ یقیں
نشانِ سجدہ بر جبیں مٹ سکے گا کیا گماں
بڑھو، بڑھو، بڑھے چلو

جہاں کو تم سنوار دو چمن کو تم نکھار دو
بہار کو پکار دو ہٹے یہاں سے اب خزاں
بڑھو، بڑھو، بڑھے چلو

پاکستان میں اسلامی نظام کا نفاذ اور ایران کے اسلامی انقلاب کو خوش آمدید کہنے اور افغانستان میں تحریکِ اسلامی اور مجاہدینِ اسلام سے ہمدردی کرنے کے لیے مُسلم ڈیموکریٹک فورم کے زیرِ اہتمام مسلمانانِ بمبئی کا ایک جلسہ عام بیگ محمد پارک میں زیرِ صدارت جناب محمد عمر یوسف پٹیل منعقد ہوا۔ اس جلسے میں جماعت اسلامی، مسلم لیگ دونوں گروپ، جمعیتہ العلماء، آل انڈیا شیعہ کانفرنس، مسلم پرسنل لا بورڈ و مسلم جنتا سیل کے ممبران و عہدیداران شریک تھے۔ ان جماعتوں کے تمام لیڈروں نے اسلامی انقلاب کی تائید میں پرزور اور ایمان افروز تقریریں کیں۔

ایران کے ایک طالب علم لیڈر محمد علی نے فارسی زبان میں ایک تقریر کی جس کا ترجمہ اُردو میں کیا گیا۔ مولانا شمس پیرزادہ صاحب سکریٹری مسلم ڈیموکریٹک فورم اور سابق امیر جماعت اسلامی مہاراشٹر نے ایک قرارداد پیش کی جس کو حاضرین نے منظور کر لیا۔ یہ قرارداد حسبِ ذیل ہے:۔

مسلمانانِ ہند کا یہ جلسہ عام پاکستان میں ہونے والے اسلامی انقلاب اور اس کے زیر اثر رو بہ عمل لائے جانے والے صالح انقلاب پر اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے پورے خلوص اور گہرے ایمانی جذبات کے ساتھ اس کا خیر مقدم کرتا ہے اور اس توقع کا اظہار کرتا ہے کہ شرعی قوانین کا نفاذ اور نظامِ اسلامی کا قیام عالم اسلام کے لیے نیک فال اور عالم انسانیت کے لیے مشعل راہ ثابت ہوگا۔

ہم بلا خوف اس حقیقت کا اظہار کرنا چاہتے ہیں کہ دینِ حق کے علمبردار ہونے کی حیثیت سے مسلمانوں کی یہ بھاری ذمہ داری ہے کہ جس خطۂ

ارضی میں انہیں اقتدار حاصل ہو وہاں کے ماحول کو وہ فسق و فجور سے پاک کرنے، صالح اقتدار کو پروان چڑھانے، عدل و قسط کی میزان کو قائم کرنے اسلامی قوانین کو جاری کرتے اور شریعت اسلامیہ کی مکمل تطبیق کے لیے اللہ کے تفویض کردہ اقتدار کی امانت کو پوری قوت کے ساتھ استعمال کریں۔ خواہ ایسا کرنا دشمن طاقتوں کو کتنا ہی ناپسند ہو۔

مسلمانانِ بمبئی کا یہ جلسہ ایران میں رونما ہونے والے امام آیت اللہ خمینی کی قیادت میں اسلامی انقلاب کا خیر مقدم کرتی ہے اور ملوکیت کی جگہ اسلامی جمہوری نظام کے قیام پر اطمینان و مسرت کا اظہار کرتی ہے۔ علامہ خمینی کا تعلق علماء کے طبقہ سے ہے جسے دنیا نظر انداز کرتی رہی ہے لیکن خمینی کے اس اقدام نے یہ واضح کر دیا ہے کہ دینی قوتوں کے سامنے مادیت ہمیشہ سپر ڈالتی رہی ہے یہ انقلاب دنیا کی تاریخ کا واحد انقلاب ہے جس نے ملوکیت و شہنشاہیت کی جڑوں کو اکھیڑ کر عدل و انصاف پر مبنی حکومت قائم کی ہے۔ ہم یہ بھی امید کرتے ہیں کہ اسلامی انقلاب کی یہ روش شیعہ سنی اتحاد کی پیش خیمہ ثابت ہوگی

مسلمانانِ بمبئی افغانستان میں علماء اور اسلام پسند و انصاف پسند مسلمانوں پر ہونے والے مظالم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنا اپنا ملی اور اخلاقی فرض سمجھتے ہیں۔ ہم حکومتِ افغانستان کے اس غیر جمہوری اسلام دشمن اور ملت کش طریقۂ کار کی پُر زور مذمت کرتے ہیں۔ نیز یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ افغانستان کی حکومت اپنی سفاکانہ کارروائیوں کو یکسر ختم کر دے اور بے گناہوں کو جیل سے رہا کیا جائے۔ افغانستان کی موجودہ حکومت مسلمان علماء کے ساتھ ویسا ہی برتاؤ کر رہی ہے جیسا کہ اسرائیلی یہودیوں نے کیا ہے۔

یہ جلسۂ ہند خاص کر مسلمانانِ ہند کی توجہ بھی اس طرف مبذول کرانا چاہتا ہے کہ وہ افغانستان میں ہونے والے انسانیت سوز مظالم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کریں

ہم حکومتِ ہند کے اس دانشمندانہ فیصلے اور رویہ کی بھی تائید کرتے ہیں کہ اس نے کسی غلط پروپیگنڈے کا کوئی اثر نہیں لیا اور بہت محتاط رویہ اختیار کیا۔ ہم امید کرتے ہیں کہ آئندہ بھی حکومتِ ہند کی پالیسی حقیقت پسندانہ رہے گی۔

دنیائے خواتین کے انتہائی ہر دلعزیز
ماہنامہ بتول رام پور
کی طرف سے ایک اور انتہائی دلچسپ سبق آموز اور کار آمد پیش کش
آپ بیتی
نئے قلمکاروں کی تخلیقی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کے لئے تین سال تک مسلسل بتول کے تین انتہائی دلچسپ افسانہ نمبر شائع کرنے کے بعد اب "آپ بیتی نمبر" کا اعلان کرتے ہوئے ہمیں مسرت ہو رہی ہے۔ یہ آپ بیتی نمبر منتخب آپ بیتیوں کے علاوہ آپ بیتی مقابلہ میں آئی ہوئی دلچسپ اور مفید آپ بیتیوں سے ترتیب دیا جائے گا۔
یہ کون نہیں جانتا کہ یادیں انسان کا عظیم سرمایہ ہوتی ہیں، لیکن اگر انہیں محفوظ نہ کیا جائے تو یہ سرمایہ ضائع ہوتا رہتا ہے آپ اپنی یادوں کو بتول کے صفحات میں محفوظ کر لیجئے۔ آپ اپنے ذہن پر زور ڈالئے: آپ کی زندگی میں پیش آنے والے واقعات میں سے بعض واقعات یقیناً غیر معمولی اہمیت کے حامل ہوں گے۔ ایسے واقعات کو دلچسپ انداز میں لکھئے اور
آپ بیتی مقابلہ
میں بھیج دیجئے۔ آپ کی آپ بیتی ایک بہترین کہانی (جس کا مرکزی کردار آپ خود ہوں گے) ہو سکتی ہے۔ یاد رکھیئے کہ آپ بیتی کسی نہ کسی پہلو سے سبق آموز اور مفید ہونا چاہیئے اور دلچسپ افسانوی ڈھنگ سے لکھی ہونا چاہیئے۔ بتول پڑھنے والے تمام بھائی بہن اس مقابلہ میں حصہ لے سکتے ہیں ——— اپنی تخلیقات ارسال کرنے سے پہلے مندرجہ ذیل باتوں کو ضرور دھیان میں رکھئے۔ ان کی پابندی ضروری ہے ———
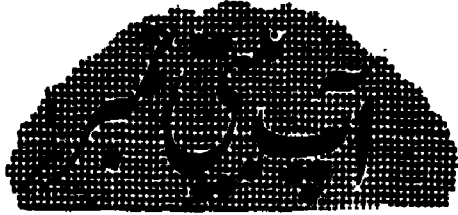
- آپ بیتی تین ہزار الفاظ یعنی بتول کے ۵ صفحات سے زائد نہ ہو۔ آپ بیتی کاغذ کے ایک طرف صاف الفاظ میں لکھی ہونا چاہیئے۔
- آپ بیتی کے آخر میں نام اور پورا پتہ لکھا ہونا چاہیئے۔
- ایک نام سے کئی آپ بیتیاں مقابلہ میں شرکت کے لئے بھیجی جاسکتی ہیں۔
- آپ بیتیاں وصول ہونے کی آخری تاریخ ۱۵ ستمبر ۱۹۷۹ء ہے۔
- انعام پانے والی تمام آپ بیتیاں ادارہ الحسنات کی ملکیت تصور کی جائیں گی۔
- ناقابل اشاعت آپ بیتیاں واپس منگانے کے لئے ۳۰ پیسے کا ٹکٹ لگا لفافہ ساتھ بھیجئے۔

انعام پانے والی آپ بیتیوں کا فیصلہ ادارہ الحسنات کی جانب سے قائم کردہ ایک بورڈ کرے گا جس کا فیصلہ آخری فیصلہ ہوگا۔

[illegible] تفصیل [illegible]

پہلا انعام : سب سے اچھی آپ بیتی پر ——— [illegible]/-، روپے اور سال کیلئے بتول مفت

دوسرا انعام : دوسرے نمبر پر آنے والی دو آپ بیتیوں پر فی انعام -/۵۰ = -/۱۰۰ " " "

تیسرا انعام : تیسرے نمبر پر آنے والی تین آپ بیتیوں پر فی انعام -/۲۵ = -/۷۵ " " "

انعام پانے والی اور پسند آنے والی تقریباً سبھی آپ بیتیاں ماہنامہ بتول کے جنوری ۸۰ء کے شمارے میں شائع کی جائیں گی اور ایسی تمام بہن بھائیوں کو چھ ماہ کے لئے بتول مفت بھیجا جائے گا۔

جنوری ۱۹۸۰ء میں شائع ہونے والا بتول کا یہ خاص نمبر

آپ بیتی نمبر ہوگا

تمام نگارشات ۱۵ ستمبر ۱۹۷۹ء تک اس پتے پر بھیجئے:

آپ بیتی مقابلہ۔ ماہنامہ بتول۔ ادارہ الحسنات۔ رام پور۔ ۲۴۴۹۰۱

جب نظامِ مصطفےٰ رائج تھا

تاریخ خلافت راشدہ کا مشہور واقعہ ہے
کہ حضرت علیؓ ابن ابی طالب جب تختِ خلافت
پر فائز تھے تو ان کے سگے بھائی جنابِ عقیل
ان کے پاس آئے اور انہوں نے اس مفہوم کی
بات کہی کہ میں نے بیت المال یا عوام کے
خزانے سے اپنا مقررہ حصہ اگرچہ لے لیا ہے
مگر میری نجی ضرورتوں کا تقاضا ہے کہ مجھے میرے
حصہ سے زیادہ دیا جائے۔ اس معروضے کو جو ایک
سگے بھائی نے سگے بھائی کے سامنے پیش کیا تھا
حضرت علیؓ نے اس ضابطہ اخلاق کے تحت بلا تکلف
وتامل مسترد کر دیا جو صاحبانِ اقتدار و مراتب پر
ہر مذہب اور سماج کی طرف سے عائد ہوتا ہے۔
اس پر جناب عقیل حضرت علیؓ سے ناراض ہو گئے
لیکن حضرت علیؓ کے اندازِ فکر کے مطابق ضابطۂ
اخلاق کو صاحبان اقتدار و مراتب کی نجی زندگی
میں ہر طرح سے اولیت و فضیلت حاصل رہے
کیونکہ وہ ان سب ہی لوگوں کے حقوق کے یکساں
طور پر محافظ و نگراں ہوتے ہیں جو ان کی ماتحتی میں
یا ان کی سرداری و سربراہی میں اپنی زندگی بسر
کرتے ہیں۔ ایک مرتبہ حضرت علیؓ نے اس مفہوم کی بات
قسم کھا کر کہی تھی کہ میں ظالم سے مظلوم کا حق چھین
کر ہی دم لوں گا۔ یہ بات بھی ضابطۂ اخلاق کے اسی
پہلو کو اجاگر کرتی ہے کہ صاحبان اقتدار و مراتب
حقوقِ عامہ کے محافظ و نگراں ہوتے ہیں اور یہ
نگرانی ان پر عائد ہونے والی ذمہ داریوں میں سے
ایک اہم ذمہ داری ہے۔

ایک مرتبہ ایک روہیلہ حاکم نے اپنے بیٹے
سے کہا کہ جب میری رعایا کا ہر آدمی پیٹ بھر
کر سو جاتا ہے تب تیرے باپ کے حلق سے
ایک نوالہ اُترتا ہے۔ یہ جملہ بھی اس ضابطۂ
اخلاق کی پاسداری کو ظاہر کرتا ہے جو صاحبانِ
اقتدار و مراتب پر عائد ہوتی ہے۔ صاحبانِ
اقتدار و مراتب نہ صرف یہ کہ نیکی کے
محافظ و مُبلّغ ہوتے ہیں بلکہ عملاً خود بھی نیک
صفات کے حامل ہوتے ہیں اور بدی کے
ساتھ کوئی رشتہ نہیں رکھتے۔ (ماخوذ)

کوثر ندوی

حیاتِ مسلم

مردِ مومن سعیِ پیہم چاہیے
عزم اعلیٰ، عزم محکم چاہیے

شان ہے یہ عزم عالمگیر کی
کھول دی اس نے گرہ تقدیر کی

جاگ اُٹھے تقدیر وہ تدبیر کر
اپنی دنیا آپ ہی تعمیر کر

چرخ تک ہمت کی ادنیٰ جست ہے
آسماں بھی اس کے آگے پست ہے

چاپلوسی کو کچل دے توڑ دے
ہے یہی دنیا تو دنیا چھوڑ دے

قوتِ ایماں ہے تیرے ہاتھ میں
اور خود قرآں ہے تیرے ہاتھ میں

مردِ مومن، خیرِ مطلق کے لیے
سربکف ہے دعوتِ حق کے لیے

اس کی فطرت نظمِ عالم کا قیام
اک نظامِ عدل اس کا انتظام

مردِ حق انصاف ہے تیرا مزاج
توڑ دے ظلم و ستم والا سماج

انقلاب ایسا مقدس انقلاب
پیکرِ عفت بنیں حسن و شباب

سیرت و کردار کی تعمیر ہو
ذہن اور افکار کی تعمیر ہو

حق پرستی ہے نہایت ناگزیر
ورنہ مر جائے گا ایمانی ضمیر

مکمل نظامِ حیات
اسلام میں مذہبی نظام، سیاسی نظام، معاشی نظام اور معاشرتی نظام الگ الگ
نہیں ہیں بلکہ ایک ہی نظام کے مختلف شعبے اور اجزاء ہیں جو ایک دوسرے کے ساتھ
پیوستہ بھی ہیں اور ایک دوسرے سے طاقت بھی حاصل کرتے ہیں۔ اگر توحید
رسالت اور آخرت کا عقیدہ موجود نہ ہو اور اس سے پیدا ہونے والے تقوے
موجود نہ ہوں تو اسلام کا معاشی نظام کبھی قائم نہیں ہو سکتا اور قائم بھی
کیا جائے تو چل نہیں سکتا۔ اسلام میں کوئی سیاسی یا معاشی نظام مذہبی
اور اخلاقی نظام سے بے تعلق نہیں ہو سکتا۔ جو شخص جان کر اسلام کو
مانتا ہو وہ کبھی اس بات کا تصور نہیں کر سکتا کہ مسلمان ہوتے ہوئے
اس کی سیاست اور معیشت یا اس کی زندگی کا کوئی شعبہ اس کے
مذہب سے جدا ہو سکتا ہے یا اسلام کے سوا کوئی دوسرا نظام اختیار
کرکے صرف "مذہبی" امور میں اس کی پیروی کرنے کا نام
بھی اسلامی زندگی ہے
(مولانا مودودی)